pklibrary.net

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

واٹس ایپ
03172266944

بانی ــــ محمود ریاض

مدیرِ منتظم ــــ آذر ریاض

مدیرہ ــــ رضیہ جمیل

مدیرِ خصوصی ــــ امت الصبور

قلم کی ٹیم ورژن ــــ شاہین رشید

قانونی مشیر ــــ نورالدین سرکی اینڈ کمپنی
ایڈووکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

جولائی 2025
جلد 38 شمارہ 11
قیمت 150 روپے

پہلی شعاع، 6

حمد، روحی کنجاہی 7

نعت، امت الرحمٰن مومنہ 7

نبی کی باتیں، ادارہ 8

سائرہ رضا

میری آپی، حمیرا رضا 20

زمانے نے بہت یاد کیا، ادارہ 18

انٹرویو

جب تجھ سے ناتا، شاہینہ خان 13

دستک، شاہین رشید 16

ناول

دھوپ دریچہ، مریم عزیز 34

مکمل ناول

سارے موسم بدل گئے، صدف عمر 98

دل سات سمندر، مہشہ حسین 142

ماء الملوک، نگہت سیما 172

ناولٹ

رویاگر، صائمہ نور 70

افسانے

اور کوئی حل نہیں، اُم ہانی 112

معیار، حنا جاوید 61

عید کے بعد، حمیرا شفیع 89

انتباہ: ماہنامہ شعاع ڈائجسٹ کے جملہ حقوق محفوظ ہیں، پبلشر کی تحریری اجازت کے بغیر اس رسالے کی کسی بھی کہانی، ناول، یا سلسلہ کو کسی بھی انداز سے نہ تو شائع کیا جا سکتا ہے، نہ کسی بھی ٹی وی چینل پر ڈرامہ، ڈرامائی تشکیل اور سلسلہ وار قسط کے طور پر یا کسی بھی شکل میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ خلاف ورزی کرنے کی صورت میں قانونی کارروائی عمل میں لائی جا سکتی ہے۔

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ) .... 1,800 روپے

امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا، یورپ .... 25000 روپے

سالانہ خریداری کے لیے ای میل کریں

subscriptions@khawateendigest.com

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

زہرِ قاتل، آفشین نعیم 93

مصنوعی پھول، عقیلہ ہاشمی 135

نظمیں غزلیں

غزل، فاطمہ حسن 195

غزل، کفیل آذر 195

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

مستقل سلسلے

خط آپ کے، ادارہ 28

باتوں سے خوشبو آئے، شگفتہ جاہ 196

کھلتا کسی پہ، واصفہ سہیل 207

تاریخ کے جھروکے، امت الصبور 204

مسکراہٹیں، ادارہ 199

موسم کے پکوان، واصفہ سہیل 208

خوبصورت بنئے، ادارہ 210

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

پہلی بات

شعاع جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے

عروج وزوال انسانی تاریخ کا حصہ ہے، انسانی تاریخ دیکھ لیں۔ کتنی عظیم الشان سلطنتیں تھیں جو کرہ ارض پر حکمران تھیں۔ لاکھوں کروڑوں انسان ان کے زیر نگیں تھے جب ان کو زوال آیا تو ان کا نام ونشان تک مٹ گیا۔ بڑے بڑے باکمال تہہ خاک مٹی ہو گئے۔

انسانی فطرت ہے کہ اسے اختیار اور اقتدار مل جائے تو وہ خود کو خدا سمجھنے لگتا ہے۔ وہ بھول جاتا ہے کہ اجل اس کے تعاقب میں ہے اور عروج وزوال اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلت کی پستیوں میں دھکیل دے۔

دور حاضر میں بھی طاقت واقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر کچھ طاقتیں خود کو خدا سمجھ بیٹھی ہیں۔ وہ بھول بیٹھی ہیں کہ روز حساب دور نہیں ہے۔ اس ظلم وناانصافی کی جواب دہی بھی ہونا ہے۔ دنیا میں بھی آخرت میں بھی۔

وہ ستارہ کیسے بجھ گیا

سائرہ رضا ہمارے درمیان نہیں رہیں۔

یہ ایک جملہ کتنی قیامتیں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔ اتنی پیاری سچے موتیوں جیسی آب دار اور قیمتی لڑکی اتنی خاموشی سے دنیا سے چلی گئی۔

جیسے زندگی کے کڑے سفر سے تھکا مسافر آرام کرنے کے لیے لیٹے اور گہری نیند آجائے۔

سائرہ بہت اچھی تخلیق کار تھی۔ اس نے بہت اچھی کہانیاں لکھیں۔ کردار نگاری میں تو اسے کمال حاصل تھا۔ اس کی کہانیوں کے کردار بھی منفرد ہوتے تھے۔

سائرہ نے جب بھی لکھا، اچھا لکھا، کمال لکھا۔ سائرہ جتنی اچھی مصنفہ تھی۔ اس سے اچھی انسان تھی۔ وہ واقعی اس قابل تھی کہ اسے چاہا جائے۔ سادگی اور سچائی کی تصویر، شاید اس کا نرم ونازک دل دنیا کا بوجھ سہار نہ سکا۔ اسی لیے عارضہ قلب دنیا سے رخصتی کا بہانا بن گیا۔

اللہ تعالیٰ سائرہ رضا کی مغفرت فرمائے۔ اس کے شریک حیات، بیٹیوں اور دیگر متعلقین کو صبر جمیل سے نوازے۔ آمین

سالگرہ نمبر سروے

اس شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمر عزیز کے چالیس سال مکمل کر لیے ہیں، اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں حسب روایت قارئین سے سروے بھی شامل ہوگا۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ وقت کی کچھ حسین ساعتیں دل کے آنگن میں ٹھہر جاتی ہیں، ان کی یاد ہمیشہ دل کو خوشی دیتی ہے۔ کوئی ایسی یاد آپ کے دل میں بھی ہوگی۔ اس کے بارے میں لکھیں۔

2۔ زندگی کا کوئی ناگوار واقعہ، کوئی طنز، کوئی جملہ جس کی چبھن آج بھی محسوس ہوتی ہے۔

3۔ کس کہانی کے اختتام کو پڑھ کر آپ کو رونا آیا اور آپ نے سوچا کہ اس کا انجام آپ مصنفہ ہوتیں تو یہ نہ لکھتیں۔

4۔ شعاع میں آپ نے بے شمار کہانیاں پڑھی ہوں گی۔ کہانیوں کے کچھ کردار بہت دلچسپ ہوتے ہیں خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی، کوئی ایسا کردار آپ کو بہت دلچسپ لگا اور اسے پڑھ کر لطف آیا۔

ان سوالات کے جوابات اس طرح بھجوائیں کہ ہمیں 22 جون تک موصول ہو جائیں۔ آپ جوابات ای میل بھی کر سکتی ہیں۔

حمد باری تعالیٰ

ہر اک امکان کا عنوان ہیں تیرے رنگ اور تری خوشبو
بڑے تخلیق ساماں ہیں، تیرے رنگ اور تری خوشبو

ہر اک صورت سے ظاہر ہو رہی ہیں صورتیں کیا کیا
عجب صورت پریشاں ہیں، تیرے رنگ اور تری خوشبو

کہاں ہے راز، ہر اک آنکھ روشن کیسے ہوتی ہے
بہر سو نور افشاں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

مسلسل پھوٹتی رہتی ہیں شاخیں زندگانی کی
فروغ باغ امکاں ہیں تیرے رنگ اور تری خوشبو

وگرنہ کچھ ثبوت اپنے بھی ہونے کا نہیں ملتا
جواز، اصل ایماں ہیں تیرے رنگ اور تری خوشبو

زمین و آسمان میں ہے بپا اک جشن موسیقی
ازل سے زمزمہ خواں ہیں ترے رنگ اور تری خوشبو

روحی کنجاہی

نعت رسول مقبولﷺ

اللہ نے آپؐ کو عالم سروری دے دی
یوں بشر کے تن مردہ کو زندگی دے دی

جہاں میں حق کا ہے نور آپؐ کے وسیلے سے
ختم اندھیرا کیا اور روشنی دے دی

بتایا مقصد ہستی، دکھائی راہ سیدھی
یہ آپؐ کا ہی ہے احسان، آگہی دے دی

مقام آپ کا یہ ہے کہ رب باری نے
ذکر بلند کیا، شان اک نئی دے دی

ہے دل مچلا در مصطفیٰؐ پہ جانے کو
مجھے حضورؐ کے عشق نے دیوانگی دے دی

کروڑوں بار درود سلام آقاؐ پر
کہ بارگاہ خدا سے وابستگی دے دی

امت الرحمٰن مومنہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

صدقہ نیک اعمال میں اضافہ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ صدقہ کیا ہے کہ وفات کے وقت تمہیں تہائی مال (میں وصیت کا حق) دے دیا ہے تاکہ تمہارے نیک اعمال میں اضافہ ہو جائے۔ (شعب الایمان)

فوائد و مسائل:

1۔ اچھے کام کی وصیت کرنے سے مرنے والے کو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ جب اس کی وفات کے بعد اس کی وصیت پر عمل کیا جاتا ہے تو مرنے والے کو اس کا ثواب پہنچتا ہے۔

2۔ اگر پسماندگان اچھے کام کی وصیت پر عمل نہ کریں تب بھی فوت ہونے والے کو اچھی وصیت کا ثواب ضرور ملے گا۔

وصیت

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: مجھے یہ بات پسند ہے کہ لوگ تیسرے حصے کو کم کر کے چوتھے حصے کی وصیت کیا کریں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

"تیسرا حصہ ایک بڑی مقدار ہے۔" یا فرمایا: تیسرا حصہ زیادہ ہے۔" (بخاری)

وارث کے حق میں وصیت جائز نہیں

حضرت عمرو بن خارجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے کہا:

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں سے خطاب فرمایا جب کہ آپ اپنی سواری (اونٹنی) پر سوار تھے۔ اور آپ کی سواری خوب جگالی کر رہی تھی۔ اور اس کا لعاب میرے کندھوں کے درمیان (پشت پر) گر رہا تھا۔ (اس موقع پر) آپ نے فرمایا:

"اللہ تعالیٰ نے ہر وارث کو ترکے کا حصہ تقسیم کر کے دے دیا ہے، لہذا وارث کے لیے وصیت جائز نہیں۔ بچہ بستر والے کا ہے اور بدکار کے لیے پتھر ہیں۔ جو شخص اپنے باپ کے سوا کسی اور کا بیٹا ہونے کا دعوا کرے یا اپنے آزاد کرنے والوں کے سوا کسی اور کی طرف آزادی کی نسبت کرے تو اس پر اللہ کی، فرشتوں کی اور سب لوگوں کی لعنت ہے۔ اس کا نہ فرض قبول ہوگا اور نہ نفل۔"

یا فرمایا: "نہ نفل قبول ہوگا نہ فرض۔" (ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ ترکے میں جن رشتے داروں کا حصہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرما دیا ہے۔ انہیں ان کا مقررہ حصہ ضرور ملنا چاہیے۔

2۔ جن رشتے داروں کا وراثت میں حصہ نہیں، ان کے حق میں مناسب وصیت کرنا بہتر ہے۔

3۔ بعض لوگ یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ لے کر شریعت کے نظام میراث پر اعتراض کرتے ہیں مثلاً: ایک شخص فوت ہوتا ہے، اس کا ایک بیٹا زندہ ہے، دوسرا بیٹا فوت ہو چکا ہے لیکن اس فوت شدہ بیٹے کا ایک بیٹا جواب فوت ہونے والے کا پوتا ہے، وہ موجود ہے۔ اصول میراث کے مطابق یہ پوتا محروم ہے کیونکہ قریبی عصبہ کی موجودگی میں دور کا عصبہ رشتے دار محروم ہوتا ہے۔

اس قسم کی استثنائی اور نادر صورتوں کے لیے اللہ تعالیٰ کے نازل کردہ قانون میں تبدیلی کرنا بہت بڑی

جسارت ہے۔

شرعی طور پر اس کا حل موجود ہے اور وہ یہ کہ فوت ہونے والا اپنے غیر وارث پوتے کے حق میں کچھ وصیت کر جائے۔ اگر وصیت نہ ہو تو وارثوں کے لیے مستحب اور بعض علماء کے نزدیک واجب ہے کہ وارث محروم لاوارث پوتوں وغیرہ کو وراثت میں سے کچھ نہ کچھ حصہ دیں۔

قرآن کریم کی آیت: ''وراثت کی تقسیم کے وقت رشتے دار، یتیم اور مساکین آ حاضر ہوں تو تم مال وراثت میں سے انہیں کچھ دے دو۔'' (النساء 4، 8) سے بھی تائید ہوتی ہے۔

اکثر لوگ اس حکم قرآنی کو محض اخلاقی ہدایت سمجھ کر اپنے نہایت قریبی رشتے داروں (بھتیجوں وغیرہ) کو بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے اسلام کا قانون وراثت تنقید و اعتراض کا نشانہ بنتا ہے، حالانکہ اس میں تو ایسی کوئی چیز نہیں جس پر اعتراض کیا جاسکے۔ اگر چچے، تائے اپنے بھتیجوں وغیرہ کے ساتھ شفقت، ہمدردی اور صلہ رحمی کا معاملہ کریں جیسا کہ اسلامی تعلیمات کا تقاضا ہے تو ایک اسلامی معاشرے میں پوتوں وغیرہ کی وراثت یا عدم وراثت کا مسئلہ زیر بحث ہی نہ آئے کیونکہ صلہ رحمی کے اعتبار سے ان کی محرومی وراثت کا ازالہ خوش اسلوبی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔

علاوہ ازیں تعجب کی بات ہے کہ اس قسم کے اعتراضات ان غیر مسلموں کی طرف سے بھی پیش کیے جاتے ہیں جن کے ہاں وراثت کا کوئی اصول و ضابطہ سرے سے موجود ہی نہیں، سوائے اس کے کہ مرنے والے کا بڑا بیٹا یا بیٹی تمام ترکے کی مالک بن جاتی ہے، خواہ یہ کروڑوں کی جائیداد ہو۔ میت کی باقی اولاد بالکل محروم ہوتی ہے، حالانکہ اولاد ہونے کے لحاظ سے وہ اس کے برابر حق دار ہیں۔

انصاف سے اس قدر بعید رواج پر عمل کرنے والوں کی طرف سے اسلام کے انتہائی عادلانہ نظام وراثت کی ایک شق تلاش کر کے اس پر غلط سلط اعتراض کرنا اور اس طرح پوری شریعت کو ناقابل عمل قرار دینے کی کوشش کرنا معقول طرز عمل نہیں۔ افسوس ہے کہ بعض نام نہاد مسلمان بھی غیر مسلموں سے متاثر ہو کر ان ہی کی زبان بولنا شروع کر دیتے ہیں اور اپنا ایمان خطرے میں ڈال لیتے ہیں۔

4۔ وارث کے حق میں وصیت سے منع کرنے میں یہ حکمت ہے کہ اگر وہ وصیت قرآن و سنت کے مطابق ہو تو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان وارثوں کو شرعاً وہی حصہ ملے گا، خواہ وصیت کی جائے یا نہ کی جائے، اور اگر اس کی وصیت قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اس وصیت پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اس طرح وہ کالعدم ہے۔

5۔ نسبتی تعلق ایک ناقابل تبدیل تعلق ہے، اسی وجہ سے اسلام کی نظر میں تبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو اصل باپ کے بجائے اپنی طرف منسوب کرنا اور اظہار (بیوی کو ماں، بہن قرار دینا) غیر قانونی بلکہ گناہ۔

6۔ ولاء (آزادی) کا تعلق بھی ناقابل تبدیل ہے، جس نے کسی کو آزاد کیا ہے، اسی کا آزاد کردہ (مولیٰ) کہنا چاہیے۔ آزاد کرنے والے کے احسان کو فراموش کر کے کسی اور کو مولیٰ قرار دینا بہت بڑا گناہ ہے۔

وارث کے لیے وصیت

حضرت ابوامامہ (صدی بن عجلان) باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

میں نے حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے خطبہ مبارک میں یہ فرماتے سنا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔''

(ابوداؤد)

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے (منہ کے) نیچے کھڑا تھا جبکہ مجھ پر اس کا لعاب گر رہا تھا۔ (اس وقت) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا:

''اللہ تعالیٰ نے ہر حق والے کو اس کا حق دے دیا ہے، لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں۔''

(دار قطنی)

وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کیا جائے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا:

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت پوری کرنے سے پہلے قرض ادا کرنے کا حکم دیا اور تم یہ آیت پڑھتے ہو:

اس وصیت کے بعد جو وہ وصیت کرے یا قرض کے بعد۔'' (النساء ۴:۱۱) اور سگے بھائی، ایک ماں کے بیٹے وارث ہوں گے، سوتیلے بھائی نہیں۔

(ترمذی)

فوائد و مسائل:

1۔ قرض کی اہمیت وصیت کے مقابلے میں اس لحاظ سے زیادہ ہے کہ قرض زندگی میں بھی واجب الادا ہوتا ہے اور موت کے بعد بھی جبکہ وصیت موت کے بعد ہی قابل عمل ہوتی ہے۔ قرض جتنا بھی ہو، ادا کرنا ضروری ہوتا ہے جب کہ وصیت اگر تہائی ترکے سے زیادہ ہو تو تہائی تک قابل عمل ہوتی ہے، زائد نہیں۔

2۔ میت کے مال میں سے سب سے پہلے کفن دفن پر خرچ کیا جاتا ہے، پھر قرض ادا کیا جاتا ہے، پھر جو کچھ بچے، اس کے تہائی مال یا اس سے کم کی جو وصیت ہو، وہ پوری کی جاتی ہے۔ اس کے بعد باقی ترکہ وارثوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔

3۔ آیت میں وصیت کا ذکر قرض سے پہلے ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پہلے وصیت پوری کی جائے وہ ادا کی جائے۔ اگر دونوں (وصیت اور قرض) موجود ہوں تو ترکے میں سے دونوں کی ادائیگی کرنے کے بعد باقی ترکہ تقسیم کیا جائے۔ علاوہ ازیں وصیت کا ذکر پہلے کرنے میں یہ نکتہ بھی ہو سکتا ہے کہ وصیت پر عمل کرنے کو زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی جب کہ قرض تو لوگ زبردستی بھی وصول کر لیتے ہیں۔ وصیت کو پہلے بیان کر کے واضح کر دیا کہ اس پر عمل کرنے میں بھی کوتاہی نہیں ہونی چاہیے، گو اس پر عمل قرض کی ادائیگی کے بعد ہی کیا جائے گا۔

4۔ میت کے سگے بہن بھائی اس کے سوتیلے بہن بھائیوں پر مقدم ہیں۔

وصیت کیے بغیر فوت ہو جانے والے کی طرف سے صدقہ

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، ایک آدمی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا:

''میرا والد فوت ہو گیا ہے اور اس نے مال چھوڑا ہے لیکن وصیت نہیں کی۔ اگر میں اس کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا اس کے گناہ معاف ہو جائیں گے؟''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

(مسلم)

وصیت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

''میری والدہ اچانک فوت ہو گئی ہیں اور انہوں نے وصیت نہیں کی۔ اور میرا خیال ہے کہ اگر انہیں بات چیت کرنے کا موقع ملتا تو صدقہ کرتیں۔ اگر میں ان کی طرف سے صدقہ کروں تو کیا انہیں ثواب ملے گا اور کیا مجھے بھی ثواب ملے گا؟''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''ہاں۔''

فوائد و مسائل:

1۔ انسان کو مرنے کے بعد جس طرح ان اعمال کا ثواب پہنچتا رہتا ہے جو اس نے زندگی میں کیے تھے اور ان کے نیک اثرات بعد میں جاری رہے، اسی طرح اس صدقے وغیرہ کا ثواب بھی پہنچتا ہے جو والدین کی وفات کے بعد اولاد ان کی طرف سے کرے۔

2۔ فوت شدہ والدین کی طرف سے صدقے کے لیے یہ شرط نہیں کہ انہوں نے وصیت کی ہو۔

3۔ آج کل ایصال ثواب کے نام سے جو

محفلیں برپا کی جاتی ہیں اور کھانے کھلائے جاتے ہیں ان کی حیثیت محض ایک رسم کی ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ خاموشی سے کسی مستحق کی مناسب امداد کر دی جائے۔

4۔ قرض اور دوسرے مالی حقوق کی ادائیگی میں جس طرح زندگی میں نیابت ممکن ہے، اسی طرح وفات کے بعد بھی کسی کا قرض دوسرے آدمی ادا کر دے تو فوت شدہ شخص بری الذمہ ہو جاتا ہے۔

جو محتاج ہو وہ جائز حد تک کھالے

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انہوں نے فرمایا: ایک آدمی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا:

”میرے پاس کچھ نہیں (گزارہ نہیں ہوتا) نہ میرے پاس کوئی مال ہے، البتہ ایک یتیم میری کفالت میں ہے، اس کا مال ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”اپنے یتیم کے مال میں سے کھالیا کر لیکن فضول خرچی نہ کرنا اور (اس کے مال سے) مال نہ کمانا۔“ اور غالباً یہ بھی فرمایا: اس کے مال کے ذریعے سے اپنا مال نہ بچانا۔“

فوائد و مسائل:

1۔ یتیم کا مال کھانا بڑا سخت گناہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

”جو لوگ یتیموں کا مال ظلم سے کھاتے ہیں، وہ اپنے پیٹوں میں صرف آگ بھر رہے ہیں اور وہ عنقریب (جہنم کی) آگ میں جلیں گے۔“

2۔ اگر یتیم کا سرپرست مفلس ہو تو وہ یتیم کے مال سے اپنے انتہائی ضروری اخراجات پورے کر سکتا ہے لیکن تعیشات اور آسائشات پر اس کا مال خرچ نہیں کر سکتا۔

3۔ مفلس آدمی کے لیے بھی بہتر یہی ہے کہ محنت مزدوری سے اپنے اخراجات پورے کرے اور یتیم کا مال محفوظ رکھے۔

4۔ یتیم کے مال کے ذریعے سے اپنا مال بچانے کا مطلب یہ ہے کہ کسی نے قرض مانگا تو یتیم کا مال دے دیا، اپنا محفوظ رکھا۔ یا ذاتی ضروریات پر اس کا مال خرچ کیا اور اپنا بچا لیا۔

5۔ یتیم کے مال سے تجارت کر کے یتیم کو اس کا حصہ دینا (مضاربت) درست ہے لیکن یہ درست نہیں کہ اس کے مال سے تجارت کر کے سارا نفع خود رکھ لے، یا اس کے مال کو اس طرح خرچ کرے جس طرح اپنا مال بے روک ٹوک خرچ کرتا ہے۔

دنیاوی چیزوں میں مقابلہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

”جب تم فارس اور روم (کی سلطنتوں) کے خزانے فتح کر لو گے تو تمہاری کیا حالت ہوگی؟“

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے فرمایا: ہم وہی کچھ (شکر کے کلمات) کہیں گے (اور شکر والے عمل کریں گے) جن کا اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے۔“

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”یا دوسری بات ہوگی۔ تم ایک دوسرے پر رشک کرو گے، پھر ایک دوسرے سے حسد کرو گے، پھر ایک دوسرے سے منہ پھیرو گے، پھر ایک دوسرے سے ناراض رہنے لگو گے۔ یا اس طرح کا کوئی اور لفظ فرمایا۔ پھر تم غریب مہاجرین میں جاؤ گے اور انہیں ایک دوسرے کی گردنوں پر لاد دو گے۔“

فوائد و مسائل:

1۔ رشک سے یہاں دنیا کے مال کی طرف مسابقت مراد ہے۔ کسی نعمت کے بارے میں یہ خواہش کہ وہ مجھے ملے، دوسرے کو نہ ملے، ناجائز رشک ہے۔ اس قسم کا رشک حسد تک لے جاتا ہے جو

ناپسندیدہ ہے۔ جائز رشک کا مطلب یہ خواہش ہے کہ جیسی نعمت کسی کو ملی ہے ویسی مجھے بھی ملے۔ یہ رشک جائز ہے۔

2۔ حسد کے نتیجے میں تعلقات کشیدہ ہوتے ہیں اور دشمنی تک نوبت جا پہنچتی ہے۔ یہ سب عادتیں مذموم ہیں۔

3۔ آخری جملے کا مطلب یہ ہے کہ دولت مند افراد تنگ دست افراد پر سختی کریں گے اور رعب جمائیں گے۔ یہ صفات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں نہیں تھیں، بعد والوں میں ایسے افراد ظاہر ہوئے جن میں ایسی خصلتیں موجود تھیں۔

دعا

ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں یہ دعا سکھائی۔

(اللھم انی اسالک خیرا)

"اے اللہ! میں تجھ سے ہر قسم کی خیر مانگتا ہوں، جلدی ملنے والی اور دیر سے ملنے والی (یا دنیا کی اور آخرت کی) وہ بھی جس کا مجھے علم ہے اور وہ بھی جس کا مجھے علم نہیں۔ اے اللہ! میں ہر قسم کے شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں، جلدی آنے والے سے بھی اور دیر سے آنے والے سے بھی (یا دنیا و آخرت کے شر سے) جس کا مجھے علم ہے۔ اس سے بھی اور جس کا مجھے علم نہیں، اس سے بھی۔ یا اللہ! میں تجھ سے وہ خیر مانگتا ہوں جو تجھ سے تیرے بندے اور تیرے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے مانگی ہے اور میں اس شر سے تیری پناہ میں آتا ہوں جس شر سے تیرے بندے اور تیرے نبی (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) نے پناہ مانگی ہے۔ یا اللہ! میں تجھ سے جنت کا سوال کرتا ہوں اور ہر اس قول و فعل (کی توفیق) کا سوال کرتا ہوں جو اس سے قریب کرے اور میں (جہنم کی) آگ سے تیری پناہ میں آتا ہوں اور ہر اس قول و عمل سے پناہ مانگتا ہوں جو اس (جہنم) سے قریب کرے اور میں یہ سوال کرتا ہوں کہ تو جو بھی فیصلہ کرے اسے میرے لیے بہتر (یا خیر کا باعث) بنا دے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) یہ دعا ایسی جامع دعا ہے جس میں دنیا اور آخرت کی ہر جسمانی اور روحانی بھلائی شامل ہے۔

(2) اس میں ہر نیکی کی توفیق اور ہر چھوٹے بڑے گناہ سے حفاظت کی دعا ہے۔

(3) اس میں ہدایت کی دعا اور گمراہی سے بچاؤ کی دعا بھی ہے۔

(4) اس میں قولی اور عملی دونوں طرح کی نیکیوں اور توفیق اور دونوں طرح کی غلطیوں اور گناہوں سے حفاظت کی دعا ہے۔

(5) اس میں اللہ کے فیصلوں اور تقدیر پر راضی رہنے کی توفیق کی دعا ہے اور رضا بالقضا کی توفیق مل جانا بڑی سعادت ہے۔

دعا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ مجھے کوئی دعا سکھائیں جو میں نماز میں مانگا کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ترجمہ: اے اللہ! میں نے اپنی جان پر بہت ظلم کیا ہے اور تیرے سوا کوئی گناہوں کو معاف نہیں کرتا۔ اپنے پاس سے میری مغفرت فرما اور مجھ پر رحمت فرما۔ بلاشبہ تو ہی بہت بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) نماز میں سلام سے پہلے خوب دعائیں مانگنی چاہئیں۔

(2) گناہوں کی بخشش کے لیے دعا کرنا بہت بڑی نیکی ہے

(3) دعائے مغفرت کے لیے ضروری نہیں کہ کوئی گناہ سرزد ہوا ہو۔

☆☆

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

شاہینہ خان

س ''شادی کب ہوئی؟''

ج ''2000ء فروری میں شادی ہوئی تھی۔ سردیوں کے دن تھے۔''

س ''شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟''

ج ''شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں تو بہت تھیں۔ مجھے گھومنے پھرنے کا شوق تھا۔ پہننے اوڑھنے کا شوق تھا۔ ہر اچھا ڈریس جو ٹی وی ڈراموں میں دیکھتی، کوشش ہوتی کہ ویسا ہی پہنوں، امی ابو کی لاڈلی تھی اور ہم بہت امیر نہ تھے، کرائے کے گھر میں رہنے والے تھے تو بس کسی نہ کسی طرح خواہش پوری کردیتے تھے۔ کالج میں بڑی مقبول تھی گیمز ہو یا ادبی پروگرام میں آگے رہتی اور اپنی کلاس کی پریفکٹ بھی تھی بہت مزے کیے شادی سے پہلے، پھر جب تعلیم ختم کی تو نوکری بھی کی۔

اچھا ہمارے گھر میں پابندی نہیں تھی کہ لڑکیوں کو یہ نہیں کرنا وہ نہیں کرنا تو ٹی وی اور ریڈیو کے کوئز پروگرام بھی کیے اور خوب کیے۔ آخر کو ہونہار بچی تھی۔''

س ''شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا؟''

ج ''بھئی میری مرضی کے بغیر تو میری شادی ہو نہیں سکتی تھی۔ میرے والدین اس سلسلے میں دقیانوسی نہ تھے۔ میں نے شادی کے بعد کچھ عرصے جاب کی تو بس وہیں مجھے یہ مل گئے، میری تو بس کام کے لحاظ سے ہی بات چیت ہوتی تھی لیکن بعد میں، یعنی شادی کے بعد پتا چلا کہ ان کو مجھ سے دھواں دھار والی محبت ہوگئی تھی۔

ان سے اچھے تعلقات تھے شریفانہ سے جیسے کولیگز سے ہوتے ہیں، یہ بھی خاصے ینگ تھے اور میں بھی دونوں پاس آؤٹ کر کے کام کرنے والے نوجوان تھے۔ یہ مجھ سے متاثر تھے۔ میری غیر نصابی سرگرمیاں بھی ظاہر ہے کہ عام لڑکیاں ایسی نہیں ہوتیں تو بس یہ ہی سلسلہ تھا اور ایک دن انہوں نے بتایا کہ امی لڑکیاں دیکھ رہی ہیں میرے لیے تو ہم نے بھی کئی رشتے بتاؤ لے آخر میں نہیں جا کر انہوں نے کہا کہ اگر میں آپ کے گھر اپنے گھر والوں کو بھیجوں تو۔ تب جا کر ہمیں سمجھ آیا کہ معاملہ کس حد تک سریس ہے۔

یہ لوگ گھر آئے، امی ابو کو اچھے لگے اور اس طرح بات آگے چلی ویسے مجھ سے ابو نے پوچھا تھا کہ کیا تم اسے پسند کرتی تھیں تو میں نے صاف بتادیا اور یہ بھی کہ بندہ برا نہیں ہے۔ اسے میری پسند کہہ لیں یا محبت۔''

س ''سسرال والوں کے کیا خیالات تھے آپ کے بارے میں؟''

ج ''نیک ہی ہوں گے تب ہی تو آئے تھے لیکن ہماری بات پکی ہونے کے بعد کیونکہ ہمارے یہاں منگنی نہیں ہوتی یہ لوگ آتے رہے اور ان کے تاثرات سے لگتا تھا کہ انہیں میں خاصی پسند ہوں جبکہ ہم دونوں کے معیار میں فرق تھا یہ ہم سے بہت اچھے گھر میں رہتے معاشی طور پر ہم سے بہت بہتر جبکہ ہم دو کمروں کے کرائے کے گھر میں رہتے تھے، انہوں نے ہمیں ہماری کمیوں کا احساس نہیں دلایا، ویسے بھی میری لمبی چوڑی سسرال نہیں ہے۔ ایک بڑے جیٹھ جو شادی شدہ بچوں والے تھے۔ ایک شادی شدہ نند

اور بس یہ ہی چھوٹے بھائی تھے۔ ان کے گھر والوں نے ان کی پسند کو فوقیت دی مجھے فوقیت دی۔"

س "منگنی کتنے عرصے رہی؟"

ج "منگنی تو نہیں ہاں ایک سال ہماری بات رہی پھر شادی ہوئی۔"

س "شادی کے لیے کوئی قربانی دی؟"

ج "ہر لڑکی کی طرح میں بھی بیاہ کر گئی تو ظاہر ہے میکہ چھوٹتا ہے لیکن اگر سسرال اچھا ہو اور بہو کا خیر مقدم کیا جائے تو سب بہت اچھا لگتا ہے اور مجھے بھی اچھا لگا تھا، چھوٹی موٹی باتیں تو اب یاد نہیں لیکن بہرحال آزادی تو ختم ہوتی ہے، میرے ساتھ کا معاملہ ففٹی ففٹی ہے یعنی شروع کے سال ذرا مسائل میں گزرے لیکن اب شکر ہے میرے رب کا بہت فضل ہے۔"

س "رسموں کے لین دین پر کوئی جھگڑا؟"

ج "نہیں ایسا کچھ خاص نہیں کیونکہ ہمارے یہاں بھی سب بہنیں اپنے گھر کی تھیں اور یہ چونچلے کنواری بچیوں وغیرہ کے زیادہ ہوتے ہیں، مجھے ذاتی طور پر جوتا چھپائی، دودھ پلائی ان رسموں کی سمجھ نہیں آئی لہٰذا میں نے ان سے پہلے کہہ دیا تھا اور شکر ہے کہ ہم دونوں کی انڈرسٹینڈنگ سے یہ سب نہیں ہوا بعد میں بہنوں نے میری خبر لی تھی کہ تم نے ہمارا نیگ مروایا اور میں بہت ہنسی تھی۔"

س "شادی کے بعد شوہر نے دیکھ کر کیا کہا تھا؟"

ج "ہنسی آتی ہے اب سوچ کر، بہرحال وہ بہت خوش تھے، ویسے نکاح کے بعد وہ میرے ساتھ ہی ہال میں بیٹھے تھے خوب تک بھی رہے تھے اور مذاق بھی کر رہے تھے لیکن پہلا جملہ یہ تھا کہ "شکر فائنلی تم ہمارے گھر آ ہی گئیں۔" جیسے کوئی معرکہ سر کر لیا ہو حالانکہ ہمارے درمیان ظالم سماج ٹائپ کی کوئی چیز نہیں آئی تھی۔"

س "کتنے عرصے بعد کام سنبھالا؟"

ج "شادی کے بعد ہم ہنی مون کے لیے پاکستان ٹرپ پر چلے گئے تھے۔ بہت انجوائے کیا تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے کھانا پکانے سے دلچسپی نہ تھی لیکن بات عزت کی تھی اب سسرال میں بھرم تو رکھنا تھا اور کچھ ہمت بھی آ گئی تھی تو جلد ہی چھوٹے موٹے کام کرنے لگ گئی تھی۔ ویسے گھر کے صفائی ستھرائی کے لیے تو کام والی آتی تھی بس کھانا بنانے کا کام ہوتا تھا، پر اب تو میں سب کچھ خود دیکھتی ہوں۔"

س "شادی کے بعد کوئی خاص تبدیلی؟"

ج "کوئی بہت بڑی تبدیلی تو نہیں آئی لیکن سسرال میں جوائنٹ فیملی سسٹم کے ساتھ رہو تو سمجھو آپ کو ان کے ماحول میں ڈھلنا ہی ہوتا ہے۔ ہماری ساس تو سیدھی سادی خاتون تھیں پر جیٹھانی ذرا نخرے دکھاتی تھیں ہر بات میں شوشیاں مارنا، یہ میرے لیے پریشان کن تھا میں سیدھے سادے گھرانے کی عام سی لڑکی، ان کے میکے والے باہر رہتے تھے اور اب وہ خود بھی باہر چلی گئی ہیں ہمارا ان کا کیا مقابلہ، وہ تو بعد میں میرے شوہر نے بتایا کہ دراصل وہ تمہاری سوشل سرگرمیوں سے بہت متاثر تھیں لہٰذا ہر بات پر مجھے نیچا دکھانا، یا یہ ظاہر کرنا کہ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں اور وہ سارے جہاں کی خبر رکھتی ہیں۔"

س "میکے اور سسرال کے ذائقوں میں فرق؟"

ج "ہاں فرق تھا، ہمارے یہاں ذرا چٹپٹے کھانے پسند کیے جاتے تھے اور سسرال میں چائنیز کے مارے وہ بھی پھیکے سے۔ بہرحال وقت کے ساتھ ساتھ صبر آتا گیا اور ان کے رنگ میں ڈھلنا پڑا۔ پھر میرے کھانا پکانے کی بھی تعریف ہوئی تو وہ بھی جیٹھانی صاحبہ کو ذرا برا لگا۔ دراصل میرے شوہر تو ان کے سامنے چھوٹے سے بڑے ہوئے تھے تو انہوں نے ہم سے یعنی شادی کے بعد مجھ سے بھی اس طرح کا سلوک رکھا تھا خیر بعد میں وہ سمجھ گئی تھیں کہ میں اتنی بھی بچی نہیں ہوں بڑوں کا ادب تمیز لحاظ ضرور کرتی ہوں۔"

س ''پہلے بچے کی پیدائش؟''

ج ''میرا پہلا بچہ جلد ہی ہو گیا تھا۔ ہم دونوں اور سسرال اور میکے میں بھی بہت خوشی منائی گئی تھی لیکن میری ساس نے کچھ باتوں پر اعتراض کیا تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ یہ ان کا لہجہ نہیں تھا یہ سب بڑی بھابھی کی محبت تھی کہ ان سے بہت کچھ برداشت نہ ہو رہا تھا میرا بیٹا خیر سے صحت مند اور کیوٹ تھا اور ان کے بچے ذرا دبی رنگت کے تھے تو اس پر بھی مسئلہ تھا۔''

س ''سسرال سے جو توقعات تھیں وہ پوری ہوئیں؟''

ج ''میری زندگی میں مسائل تب آئے جب ان کی جاب چھوٹی، ظاہر ہے کہ ان کے والد تو حیات نہیں تھے اور شادی کے بعد یہ میرے اخراجات اٹھاتے پھر بچے کی آمد، اسپتال اور ڈاکٹر کے خرچے، میری دوائیں میں بہت پریشان تھی۔ پہلے تو یہ بڑے بھائی سے لے کر کام چلا لیتے تھے لیکن شادی کے بعد کی بات اور تھی، میں نے ان سے کہا کہ اوپر والے کا نام لیں اور جو بھی جاب آفر ہوا، اسے ارکے کر دیں تو انہیں ایک ریسٹورنٹ میں منیجر کی آفر ملی اور انہوں نے کر لی۔ مزے کی بات یہ ہے کہ ان کا وہ تجربہ اب بھی کام آرہا ہے۔ گو ان کی ڈیوٹی بڑی سخت تھی اوپر سے بھابھی کی باتیں وہ گھر والوں سے ایسی ایسی باتیں کرتیں اب تو سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ لوگ بات کا بتنگڑ کیسے بناتے ہیں۔ بہر حال وہ وقت بھی گزر ہی گیا۔

س: جوائنٹ فیملی سسٹم پسند ہے یا علیحدہ؟

ج: میرا خیال ہے کہ وقت اور ضرورت کے تحت دونوں ہی اچھے ہیں جب ہم کو فیملی کی ضرورت تھی ان کی جاب بار بار چھوٹ جاتی اور گھر کے خرچے الگ تو اگر ہم علیحدہ گھر میں رہتے تو یہ سب کس قدر مشکل ہوتا، مشکلات بھی ساتھ ساتھ چلتی رہیں اور صاف بات تو یہ ہے کہ اگر میں معمولی باتوں کو بڑا بنا دیتی تو پھر میں آج پر سکون کیسے رہتی۔

آج کل لڑکیاں چاہتی ہیں کہ ابھی شادی ہوئی اور شوہر کو اپنے ہاتھوں پر نچائیں یہ سوچ بہت غلط ہے۔ کیونکہ رب العزت نے نجانے ہمارے لیے کیا سوچ رکھا ہے اور ہم اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد بنانا شروع کر دیں۔ یہ ہمارا صبر تھا کہ انہیں باہر اچھی آفر ہوگی یہ چلے گئے، کینیڈا میں رہ کر کمایا اور ہم نے اپنا گھر خریدا، بچے دو ہیں اچھا پڑھ رہے ہیں۔ امید ہے کہ ہم بھی جلد ہی چلے جائیں گے۔ وہی بڑی بھابھی جو مجھے لاپرواہ، پھوہڑ اور نجانے کن کن القابات سے نوازتی تھیں، ساس مرحومہ کے کان بھرتی تھیں، اب چاہتی ہیں کہ میں اپنی بیٹی ان کے بیٹے سے بیاہ دوں جبکہ ابھی وہ پڑھ رہی ہے۔ بھئی میری بیٹی تو میرے جیسی ہی پھوہڑ اور لاپرواہ ہوگی تو پھر ان کو اس میں اب ہیرے کیوں نظر آ رہے ہیں۔ میں کدورت رکھنے والی نہیں ہوں جہاں اوپر والے نے اس کا نصیب لکھا ہوگا ہو جائے گی لیکن انسان کے پاس پیسہ آتا ہے تو لوگ رنگ ہی بدل لیتے ہیں۔''

☆☆

شب گزیدہ

عنیزہ سید

ڈاک خرچ فری

پاکستان میں کہیں بھی بذریعہ فون منگوائیں

دستی خریدنے یا بذریعہ ڈاک منگوانے کے لئے

مکتبہ عمران ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی فون: 021-32216361

دستک، دستک دستک

شاہین رشید

غنیٰ علی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدوللہ۔"

"آج کل آپ کو ڈرامہ سیریل "نقاب" میں دیکھ رہی ہوں۔ بہت اچھی لگ رہی ہیں؟"

"ہوں...... بہت شکریہ۔"

"کتنا پرانا ہے سیریل؟"

"نہیں ...... زیادہ پرانا نہیں ہے بلکہ نیا ہی ہے۔ آن ایئر ہونے کے بعد بھی اس کی ریکارڈنگز چلتی رہیں۔"

"بہت فریش فریش لگ رہی ہیں ...... وجہ؟"

"نہیں، کوئی خاص وجہ نہیں ...... آپ کو پتا ہے کہ ہمارا تعلق شوبز سے ہے تو اپنے آپ کو فریش رکھنے کے لیے اپنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سو میں اپنا خیال رکھتی ہوں...... اسی لیے آپ کو فریش نظر آتی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مجھ سے وہی سوال پوچھیں گی جو آج کل گردش کر رہا ہے۔"

"جی جی...... بالکل آپ بالکل صحیح سمجھی ہیں؟"

"تو بات یہ ہے کہ میرا اس انڈسٹری کو چھوڑنے کا بالکل بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے بڑی محنت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اور پھر یہ میرا پروفیشن ہے تو بھلا میں اسے کیوں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر وہ نیوز؟"

"وہ دراصل میرے بھائی نے مذاق لگا دی تھی۔ بس اس کے بعد تو لوگ جیسے بے چین ہو گئے۔ حالانکہ میں نے وضاحت بھی کر دی تھی کہ شوبز چھوڑنے کا میرا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ مذاق آپ کو مہنگا پڑا یا آپ نے اسے انجوائے کیا؟"

"تھوڑا مہنگا تو پڑا۔ کیونکہ وضاحتیں کر کر کے پریشان ہو گئی، لیکن خیر میں نے انجوائے بھی بہت کیا۔ میں نے تو صرف آپس کی بات چیت میں یہ ضرور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں مجھے یہ فیلڈ چھوڑنی پڑے۔ کیونکہ مجھ پر فرائض زیادہ ہیں۔ مجھ پر میری فیملی کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔"

"کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ کو جوائن کیے ہوئے؟"

"مجھے اس فیلڈ کو جوائن کیے تقریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ میں نے 2015ء میں اس فیلڈ کو جوائن کیا تھا۔ اور شروع شروع میں میں نے تھیٹر میں کام کیا۔

دستک دستک دستکہ

شاہین رشید

غنیٰ علی

"کیسے مزاج ہیں؟"

"الحمدوللہ۔"

"آج کل آپ کو ڈرامہ سیریل "نقاب" میں دیکھ رہی ہوں۔ بہت اچھی لگ رہی ہیں؟"

"ہوں...... بہت شکریہ۔"

"کتنا پرانا ہے سیریل؟"

"نہیں ...... زیادہ پرانا نہیں ہے بلکہ نیا ہی ہے۔ آن ایئر ہونے کے بعد بھی اس کی ریکارڈنگز چلتی رہیں۔"

"بہت فریش فریش لگ رہی ہیں......وجہ؟"

"نہیں، کوئی خاص وجہ نہیں...... آپ کو پتا ہے کہ ہمارا تعلق شوبز سے ہے تو اپنے آپ کو فریش رکھنے کے لیے اپنا خیال تو رکھنا ہی پڑتا ہے۔ سو میں اپنا خیال رکھتی ہوں...... اسی لیے آپ کو فریش نظر آتی ہوں۔ اور مجھے یقین ہے کہ آپ بھی مجھ سے وہی سوال پوچھیں گی جو آج کل گردش کر رہا ہے۔"

"جی جی...... بالکل آپ بالکل صحیح سمجھی ہیں؟"

"تو بات یہ ہے کہ میرا اس انڈسٹری کو چھوڑنے کا بالکل بھی کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں نے بڑی محنت کے بعد یہ مقام حاصل کیا ہے۔ اور پھر یہ میرا پروفیشن ہے تو بھلا میں اسے کیوں چھوڑوں گی۔"

"تو پھر وہ نیوز؟"

"وہ دراصل میرے بھائی نے مذاقاً لگا دی تھی۔ بس اس کے بعد تو لوگ جیسے بے چین ہو گئے۔ حالانکہ میں نے وضاحت بھی کر دی تھی کہ شوبز چھوڑنے کا میرا بالکل بھی ارادہ نہیں ہے۔"

"یہ مذاق آپ کو مہنگا پڑا یا آپ نے اسے انجوائے کیا؟"

"تھوڑا مہنگا تو پڑا۔ کیونکہ وضاحتیں کر کر کے پریشان ہو گئی، لیکن خیر میں نے انجوائے بھی بہت کیا۔ میں نے تو صرف آپس کی بات چیت میں یہ ضرور کہا تھا کہ ہو سکتا ہے کہ فیوچر میں مجھے یہ فیلڈ چھوڑنی پڑے۔ کیونکہ مجھ پر فرائض زیادہ ہیں۔ مجھ پر میری فیملی کی ذمہ داریاں بھی ہیں۔"

"کتنے سال ہو گئے اس فیلڈ کو جوائن کیے ہوئے؟"

"مجھے اس فیلڈ کو جوائن کیے تقریباً دس سال ہو گئے ہیں۔ میں نے 2015ء میں اس فیلڈ کو جوائن کیا تھا۔ اور شروع شروع میں میں نے تھیٹر میں کام کیا۔

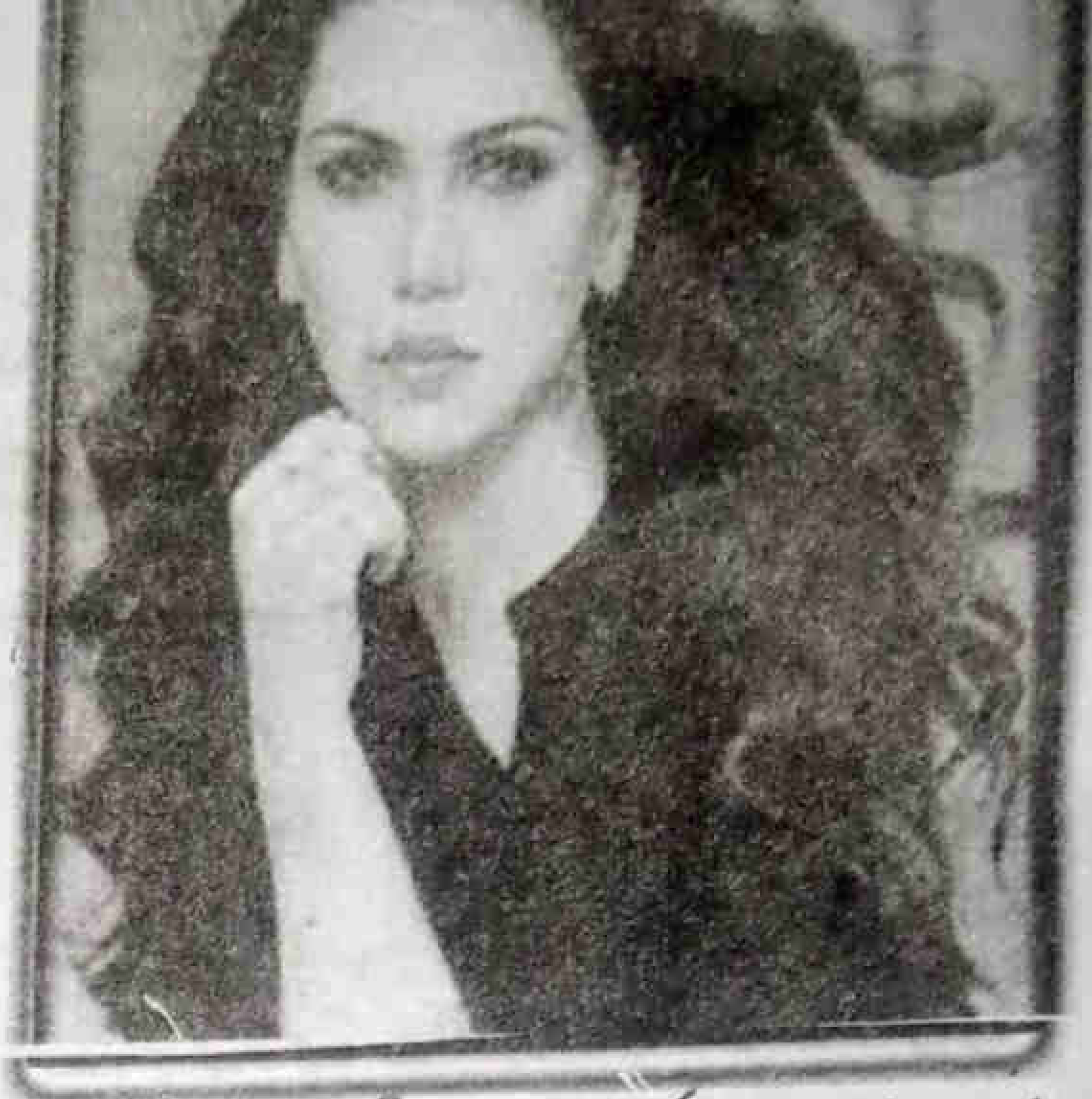

پھر اس فیلڈ میں آئی۔ اور نہ صرف تھیٹر میں کام کیا بلکہ ماڈلنگ بھی کی اور الحمد للہ ابھی بھی ماڈلنگ کر رہی ہوں۔ اور ڈرامے تو آپ سب دیکھ ہی رہے ہیں۔"

"ماشاء اللہ سے آپ شادی شدہ بھی ہیں دو بچوں کی والدہ ماجدہ بھی ہیں۔ کیا سب کاموں کے لیے ٹائم مل جاتا ہے؟"

"جی بالکل مل جاتا ہے۔ 2017ء میں میری شادی ہوئی تھی اور 2015ء سے میں اس فیلڈ میں ہوں۔ تو خود اندازہ لگائیں کہ اپنی ذمہ داریاں بھی نبھا رہی ہوں اور کام بھی کر رہی ہوں۔"

"شوقیہ یا پیسے کی کشش؟"

"آئی تو اس فیلڈ میں شوقیہ ہی تھی لیکن جب شوق کے ساتھ ساتھ ضرورت بھی پوری ہو رہی ہو تو اس سے اچھی کوئی بات ہے ہی نہیں۔ پیسے میں تو کشش ہوتی ہی ہے اور جب خود کماؤ تو پھر کیا ہی بات ہے۔ اپنی کمائی کے تو مزے ہی کچھ اور ہیں۔"

"ماڈلنگ، اداکاری، تھیٹر...... کہاں پیسہ زیادہ ہے؟"

"یہ بات تو ہم اور آپ سب ہی جانتے ہیں کہ ماڈلنگ کمرشل میں پیسہ زیادہ ہے۔ پھر ادھر ادھر جانے کا موقع بھی مل جاتا ہے۔ تھوڑا گھومنا گھمانا بھی رہتا ہے۔ ہاں البتہ اس فیلڈ میں پیسہ یونہی نہیں مل جاتا بلکہ بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔"

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

کتاب کا نام	مصنفہ	قیمت
بساط دل	آمنہ ریاض	
زرد موسم	راحت جبیں	
زندگی اک روشنی	رخسانہ نگار عدنان	
خوشبو کا کوئی گھر نہیں	رخسانہ نگار عدنان	
شہر دل کے دروازے	شازیہ چودھری	
تیرے نام کی شہرت	شازیہ چودھری	
دل ایک شہر جنوں	آسیہ مرزا	
آئینوں کا شہر	فائزہ افتخار	
بھول بھلیاں تیری گلیاں	فائزہ افتخار	
پھلاں دے رنگ کالے	فائزہ افتخار	
یہ گلیاں یہ چوبارے	فائزہ افتخار	
عین سے عورت	غزالہ عزیز	
دل اسے ڈھونڈ لایا	آسیہ رزاقی	
بکھر نہ جائیں خواب	آسیہ رزاقی	
زخم کو ضد تھی مسیحائی سے	فوزیہ یاسمین	
اداس کا چاند	بشریٰ سعید	
رنگ خوشبو ہوا بادل	افشاں آفریدی	
درد کے فاصلے	رضیہ جمیل	
آج گگن پر چاند نہیں	رضیہ جمیل	
درد کی منزل	رضیہ جمیل	
میرے دل میرے مسافر	نسیم سحر قریشی	
تیری راہ میں رُل گئی	میمونہ خورشید علی	
شام آرزو	ام سلطانہ فخر	

زمانے نے بہت یاد کیا

ادارہ

انیلا رزاق......اٹک سٹی

تین تاریخ کو شعاع ملا۔ ابھی دیکھنے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ عمیرہ احمد کے پیج پہ خبر پڑھ لی۔

معلوم نہیں خبر تھی کہ کوئی زلزلہ۔

سائرہ رضا۔

کون سائرہ رضا......؟

میرا دماغ کورا کاغذ اور دل سلیٹ بن چکا ہے۔

میرے اندر ایک طوفان تھا درد کا، غم کا، دکھ۔

تین دن ہوگئے ابھی تک یقین نہیں آرہا۔

آہ سائرہ رضا

پرانی رائٹرز کے مصروف ہو جانے کے بعد سائرہ رضا ہوا کا اک شان دار جھونکا محسوس ہوئی تھیں۔

''ارے یہ بندی تو کمال لکھتی ہے، کیا برجستگی ہے، کہانی ایسی کہ بس پڑھتے ہی چلے جاؤ۔''

''بھئی واہ لکھنے والا ہو تو اس لکھاری جیسا۔''

آغاز میں ہی ایسی پختگی کہ دل موہ لینے والی۔

''جس مہینے ڈائجسٹ میں سائرہ رضا یا سمیرا حمید کا نام ہو تو ''نام ہی کافی ہوتا گارنٹی کے لیے۔''

سائرہ کی کہانیوں پر کہانیاں ڈائجسٹوں کی زینت بنتی رہیں یوں کہ جیسا تانتا ہی بندھ گیا ہو، ہر کہانی ایک سے بڑھ کر ایک۔

کیا موضوع، کیا ناول، کیا مکالمے، کیا کردار۔

ہر چیز انگوٹھی میں نگینے کی طرح فٹ معلوم ہوتی۔

سائرہ نے ڈائجسٹ میں اتنے منفرد موضوعات اور کہانیاں پیش کیں کہ اب شاید ہی کوئی کر سکے۔

اس کی کوئی بھی کہانی کبھی صفحات کا بڑھاوا یا وقت کا ضیاع محسوس نہ ہوئی۔

منفرد موضوعات اور خوب صورت کردار اس کی پہچان تھے۔

اس کا ہر ناول اپنی مثال آپ تھا، آپ چاہ کر بھی اس کی کہانیوں یا کرداروں میں یکسانیت نہیں ڈھونڈ سکتے گویا انفرادیت سائرہ کے آنگن پہ آکر براجمان ہوگئی تھی۔

چاہے وہ ''یقین کامل ہی بندگی ہے'' ہو یا ''محبت داغ کی صورت'' ہو۔

''آنے والا ہے برف کا موسم'' ہو یا ''فرماں بردار''

''محبت مارچ کا موسم'' ہو یا ''سیدھی سڑک''

''اڈی والی جوتی'' ہو یا عید چھپا سٹھ میں''

''دل موم کا دیا'' ہو یا اب کر میری رفوگری''

''حسن المآب'' ہو یا ''ملے جب ہم تم''

''آہ'' ہو یا ''تھوڑا سا آسمان''

ان کا ہر ایک افسانہ ہر ایک ناول اپنی مثال آپ تھا میں ہمیشہ سوچتی تھی کہ کوئی لکھاری اتنا منفرد کیسے ہو سکتا ہے کہ وہ جو کہانی لکھے اس سے پہلے ویسی کہانی نہ ہو اور وہ جو کردار لکھے اس سے پہلے ویسا کردار نہ ہو۔

ان کی لکھی شجرت الدر

ان کی لکھی نوال ضمیر

ان کی لکھی تاباں مجاہد

ان کی لکھی ماہ رو اور حسن المآب

ان کی لکھی اتباع، عدینہ، بشائر اور حمیرا کے

بھولیں گی اور ان سب کی اوٹ سے جھانکتی سائرہ رضا۔

اللہ مغفرت فرمائے اور بیٹیوں کو صبر جمیل۔ یہ دکھ تو تاعمر ساتھ رہنے والا ہے۔

مجھے یقین نہیں آرہا کہ وہ نہیں رہیں۔

عینا عمر خان......کراچی

سائرہ رضا کی موت کا بہت افسوس ہوا۔ اس دن ہمارے گھر اسما بنت فیاض کی والدہ آئی تھیں۔ مجھ سے ملنے کے لیے۔ انہوں نے مجھے بتایا نہیں بلکہ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ سائرہ رضا مر گئی ہے۔ (اصل میں انہیں کسی نے بتایا تھا اور وہ مجھ سے تصدیق چاہ رہی تھی)

”اللہ نہ کرے۔“ بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔ ان کے جانے کے بعد میں نے موبائل پہ فیس بک کھولا۔ سائرہ رضا کی آئی ڈی کھولی۔ وہاں اس خبر کی تصدیق تھی کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں رہیں۔ دل کی کیا حالت ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے ابھی تو شازیہ جمال کا غم بھی کم نہیں ہوا تھا کہ سائرہ جی بھی چلی گئیں۔

میری پسندیدہ رائٹر جن سے میں ملنا چاہتی تھی سائرہ رضا کا نمبر ان میں سب سے پہلا تھا۔ مگر میری خواہش حسرت بن گئی۔ میں کبھی زندگی میں ان سے نہیں مل سکتی۔

سائرہ جو خود ایک پھول جیسی تھی اس کی قبر پھولوں سے بھر چکی ہوگی تمہارے غم میں رونے والے ہم بھی ہیں سائرہ۔ اپنی دعاؤں کا تحفہ ہم تمہارے نام کرتے ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ وہ تمہاری۔ قبر پر اپنی رحمت کی بارش کرے اور کامل مغفرت فرمائے۔ آمین۔ ثم آمین۔

عنایا گل......راولپنڈی

”سائرہ رضا“ ڈائجسٹ کے صفحات پہ جگمگاتا نام دیکھ کر ہمیشہ دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی تھی۔ یقیناً یہ تحریر بہترین ہوگی۔ اس بات کا خیال جگمگاتا اور تحریر پھر باذوق قارئین کے معیار پہ نہ صرف پورا اترتی بلکہ انمٹ نقوش مرتب کر جاتی تھی۔ آپ کے قلم سے تخلیق کردار ہمیشہ اپنے اردگرد زندہ دکھائی دیتے تھے۔ آپ کا نام پڑھ کر ہمیشہ خوش گوار احساس جاگتا تھا مگر یہ کیا؟ یہ کیسی دکھ بھری داستان سنی ہے۔ یہ کیسا غم ہے جو سہا نہیں جا رہا۔ آنکھیں برس رہی ہیں۔ کتنے کردار ہیں جو اپنی تکمیل کے منتظر ہوں گے۔ کتنی کہانیاں ادھوری رہ گئیں اور آپ راہ عدم سدھار گئیں۔ آپ تو سچ میں ایسے موسم میں جدا ہوئی ہیں جب پھول کڑی دھوپ کی تمازت سے مرجھائے ہوئے ہیں۔

بحیثیت مسلمان ہمارا ایمان ہے کہ ہر ذی نفس نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اپنوں کی جدائی بہت بڑا روگ ہے۔ آپ چلی گئیں یہ حقیقت ہے لیکن اس سے بڑھ کر یہ بھی حقیقت ہے کہ آپ دلوں میں زندہ ہیں اور زندہ رہیں گی۔ دعاؤں میں یاد رہیں گی۔ آپ کے کردار آپ کے ہونے کا احساس دلاتے رہیں گے۔

غم اس قدر ہے کہ لفظ گنگ ہیں۔ بس دعا ہے اللہ پاک آپ کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائے۔ قلم قبیلہ، قارئین اور آپ کے اہل خانہ کو صبر عطا فرمائے۔ آمین

☆☆

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی طرف سے بہنوں کے لیے خوبصورت ناول

فصل غم کا گوشوارہ

رضیہ جمیل

قیمت -/300 روپے

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔ فون نمبر: 32735021

میری آپی

حمیرا رضا

میں نے کبھی بھی اسے عام لڑکیوں کی طرح گڑیوں سے کھیلتے نہیں دیکھا۔ وہ بہت چھوٹی عمر میں ہی سب سے منفرد تھی۔ اخباروں، کتابوں، رسالوں، اوراق کو چاٹ جانے والی، نہ جانے کیا کچھ پڑھا کرتی تھی۔ کب سے پڑھ رہی تھی۔ ہم پرانے لیبر اسکوائر میں رہتے تھے۔ کرائے کے گھر میں یہاں ہماری زندگیوں کا خاصا وقت گزرا۔

پورا بچپن یہیں گزر گیا۔ میں ننھی سی بچی شاید سال بھر کی۔ صبح کا وقت ہے، امی تیزی سے گھر کے کام نمٹا رہی ہیں۔ انہیں وقت پر اسکول پہنچنے کی جلدی ہے۔ ایک پیالی میں ابلے ہوئے چاول اور دودھ ڈال کر پیالی آپی کو پکڑائی اور کہا کہ خالہ ہاشمی کو دے آؤ۔

(خالہ ہاشمی ہماری پڑوسن) جن کے پاس میں نے امی کی اسکول واپسی تک رہنا ہے۔ اور انہوں نے انتہائی محبت اور شفقت سے مجھے سنبھالنا ہے۔ آپی خالہ کے پاس آتی ہے۔ اب خود سے بڑی بن کر خالہ سے کہتی ہے۔

"یہ ہماری بہن حمیرا کا کھانا ہے۔ اسے کھلا دینا۔ خود نہیں کھانا۔"

اور خالہ کا جواب "ہاں ہاں ابھی کو کھلاؤں گی ہم کوئی بھوکے تھوڑی ہیں۔"

دونوں گھر ایک ساتھ جڑے ہوئے ہیں، امی یہ مکالمہ سن رہی ہیں۔ خالہ اور امی کی نظریں ملیں۔ مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا۔ پانچ سالہ بڑی بہن کا ایک سالہ چھوٹی بہن کے لیے فکرمند انداز دونوں خواتین کو محظوظ کر گیا۔

چند سال گزرے، ہم نے لیبر اسکوائر کو چھوڑا۔ پیدل کے فاصلے پر نیو لیبر اسکوائر میں اپنا ذاتی 80 گز کا گھر خرید لیا۔ لیکن پرانے محلے کی محبتیں ذہن و دل سے نہ نکل سکیں۔ گھر میں اخبار لازمی آیا کرتا تھا۔ ہفتہ وار میگزین بھی ہوا کرتے تھے۔

میں نے اس دن اپنی بہن کو جانا کہ وہ کس قدر علم و ادب کا شوق رکھتی ہے۔ جس دن اخبار جہاں میں بلاعنوان کے نام سے مقابلے کا انعقاد ہوا۔ وہ ایک بھوک سے بلکتی بچی کی تصویر تھی۔ جس کے ہاتھ میں باسی روٹی کا ٹکڑا تھا۔ آپی نے اس تصویر کو عنوان دیا۔ اور فرسٹ پرائز کی مستحق ہوئی۔ اس وقت اگر وہ بارہ سال کی بھی تھی۔ یہ میں اندازاً کہہ رہی ہوں، کیوں کہ بات بہت پرانی ہے۔ تو یقیناً میں آٹھ سال کی رہی ہوں گی۔ میں نے اس کا منتخب کیا ہوا شعر بار ہا پڑھا۔ معنی و مطلب تو سمجھ نہ سکی۔ مگر شعر یاد ہو گیا اور آج تک یاد ہے۔

مفلسی حسِ لطافت کو مٹا دیتی ہے
بھوک آداب کے سانچوں میں ڈھل نہیں سکتی

میں تو بس اسی میں خوش تھی کہ میری آپی فرسٹ پرائز جیت گئی ہے۔ وہ ہر وقت کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی یا پھر لکھتی رہتی۔ نہ کبھی امی نے روکا ٹوکا نہ ہی کبھی کچھ پوچھا کہ کیا لکھتی ہو اور کیوں لکھتی ہو۔

پرانا محلّہ چھوڑ دیا تھا۔ لیکن وہاں کے دوست، احباب اب بھی اسی محبت اور اپنائیت کے ساتھ ہم سے جڑے تھے۔ امی اسکول کی جاب کے علاوہ کبھی گھر سے باہر نہ گئیں۔ خالہ ہاشمی کے ہمارے گھر چکر لگتے رہے (ہم انہیں خالہ ہاشمی ان کے شوہر کی نسبت سے کہتے ہیں۔ ان کا اپنا نام رضیہ ہے) یہ نام باجی

ہاشمی ان کو امی نے دیا۔ آپی کی ہم عمران کی دو بیٹیاں راشدہ، اور عذرا جبکہ بڑی بیٹی ساجدہ باجی ہیں۔

اکثر آپی امی سے کہتی کہ میں عذرا اور راشدہ سے ملنے چلی جاؤں، امی نے نہ کبھی ہمیں روکا، ٹوکا، نہ ہی کبھی انکار کیا۔ یہ تک نہ پوچھا کہ کیوں جانا چاہتی ہو۔

آپی وہاں جاتے ہوئے مجھے ساتھ لے جاتی تھی۔ خالہ کے گھر میں داخل ہوتے ہی اوپر خالو کے کمرے میں پہنچ جاتی۔ وہ کمرا بھی نام کا کمرا تھا۔ چاروں طرف دیوار گیر الماریاں کتابوں سے بھری ہوئی۔

خالو اس سے مل کر بہت خوش ہوتے چونکہ آپی اور بڑے بھائی تیمور کی آنکھیں ہرے رنگ کی ہیں تو خالو نے آپی کا نام بلی رکھ دیا ساری زندگی اسے بلی کہہ کر بلایا۔

آپی کے آنے پر خالو بہت خوش ہوتے۔ آپی کئی کئی گھنٹے ان کے کمرے میں گزارتی اور دنیا جہاں کی کتابوں کے بارے میں خالو سے باتیں کرتی۔

میں نے بہت کم عمری میں قصص الانبیاء پڑھ لی تھی۔ یہ بھی آپی کے مرہون منت تھا۔ وہ خالو سے کتابیں پڑھنے کے لیے مانگتی۔ خالو بہت خوش دلی سے اسے کتابیں دیا کرتے۔ وہ سائرہ جو عذرا اور راشدہ کا نام لے کر ان کے گھر آتی تھی۔ ان سے ملنا اور باتیں کرنا تک بھول جاتی۔ کتابوں کی محبت میں، نیچے خالہ آوازیں دے دے کر ہلکان ہوتی رہتیں۔

"سائرہ! نیچے آجا۔ کھانا لگ گیا ہے۔ سائرہ نیچے آجا چائے بن گئی ہے۔"

"آرہی ہوں خالہ۔" کہتی جاتی مگر اپنی جگہ سے ہلنے کو تیار نہ ہوتی۔

اخبار جہاں میں بچوں کے صفحات کے لیے کہانیاں لکھ کر بھیجتی، مزے کی بات وہ کہانیاں چھپ بھی جایا کرتیں اور اسے کئی زمانوں تک علم نہ ہوتا نہ جانے یہ کیسا اتفاق تھا کہ جب بھی اس کی کہانی چھپی عین اسی وقت کسی بھی وجہ سے اخبار جہاں ہم تک نہ پہنچا۔ کبھی راہ چلتے کوئی صفحہ گرا ہوا ملتا تو پتا چلتا کہ فلاں وقت میں اس کی کہانی چھپ گئی تھی اور اس سمیت ہم سب لاعلم ہوتے تھے۔

وہ کبھی بھی مایوس نہیں ہوئی تھی۔ لکھنے لکھانے اور پڑھنے کی شوقین، وہ میٹرک میں تھی۔ جب اسکول میں کلچرل شو منعقد ہوا۔ سب ہی اسٹوڈنٹ اپنے ہاتھ سے بنے ہوئے فن پارے لے کر آئے یہ نہ جانے کہاں سے مٹی ڈھونڈ کر لائی اور کسی سندھی شخص کا مجسمہ بنا ڈالا۔ اپنے ہاتھوں سے مٹی کو گوندھا، ایسا چہرہ تخلیق کیا کہ اس پر حقیقت کا گمان ہوتا تھا۔ اور جب مجسمے کو سندھی اجرک پہنائی تو تمام اسکول ٹیچرز انگشت بدنداں رہ گئیں۔ کیا حقیقت کا رنگ تھا اس کے کام میں! ہماری والدہ اور والد بھی ساکت وجامد رہ گئے۔

اور جب وہ آٹھویں جماعت کی طالبہ تھی۔ اسکول میں 14 اگست کی تیاریاں عروج پر تھیں۔ لڑکیوں کے کسی ملی نغمے پر ٹیبلو پیش کرنا تھا۔ سب نے ایک جیسے ہرے رنگ کی شلواریں اور سفید قمیصیں پہنی تھیں۔ قمیصوں کا مسئلہ نہیں تھا۔ شلواریں سلوائی تھیں تو آپی نے ٹیچر کو اپنی خدمات پیش کیں، نہ ہی اس نے ابھی کسی سے بھی سلائی سیکھی تھی۔ ٹیچرز کو اس کی دی ہوئی آفر بہت اچھی لگی۔ ایک دن لگا کر غالباً بارہ یا چودہ شلواریں تیار کردیں۔

ایک دن آپی کی تمام دوستیں گھر آئیں۔ خوب باتیں کیں۔ اچھا وقت گزارا۔ آپی سے کہتی ہیں۔

"سائرہ! ہمیں ٹریٹ دو اب تمہاری کہانیاں چھپنے لگی ہیں۔"

آپی نے انہیں جواب دیا۔ "جب میری کہانیاں خواتین ڈائجسٹ میں چھپیں گی، تب ٹریٹ دوں گی۔"

وقت گزرتا رہا۔ کہانیاں چھپتی رہیں۔ کالج میں مقابلہ افسانہ نگاری میں اس نے فرسٹ پرائز لیا۔ یہ ایک گونگے لڑکے کی کہانی تھی۔ جو اپنی کزن سے محبت کرتا ہے اور وہ کزن اسے ریجکٹ کردیتی ہے۔ کالج کا فرسٹ ایئر ہے۔ پورے سرسید گورنمنٹ گرلز کالج

میں سائرہ کا نام گونج رہا ہے۔
کالج کی اردو پڑھانے والی ٹیچر تمام کریڈٹ لے رہی ہیں کہ میں اس بچی کو پڑھاتی ہوں جبکہ آپی کو ان سے شدید اختلاف ہے۔ دل ہی دل میں وہ یہ کریڈٹ اپنی اسکول ٹیچرز کو دیتی ہے جہاں زندگی کے دس سال گزرے ہیں۔ یہ چند مہینوں سے شروع ہوا کالج (فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ تھی) کیسے کریڈٹ لے سکتا ہے۔ مگر کبھی کچھ نہیں کہتی تھی۔
شادی ہوگئی، غالباً ایک بچی کی ماں بن چکی ہے۔ یہ بچی آبگین ہے۔ حسب معمول بازار گئی تو کتابوں کی دکان میں داخل ہوگئی۔ اب آپی ہے اور ڈائجسٹ ہے۔ (مجھے قطعاً نہیں پتا کہ خواتین ہے یا شعاع) ورق گردانی کرتے کرتے ایک نام پر آ کر ٹھہر جاتی ہے۔
یہ نام سائرہ رضا ہے۔
کہانی پڑھتی ہے۔ اور شدید صدمے کے زیر اثر آجاتی ہے کہ خدا جانے کس لڑکی کی دن رات کی محنت ہے۔ اس کہانی کو لکھنے میں اور اس پر میرا نام چھپ گیا۔ اب ڈائجسٹ خریدا، گھر آگئی اب چلتے پھرتے بول رہی ہے۔ میں امتل کو کال کروں گی ایسے کیسے اتنی بڑی کوتاہی کوئی کر سکتا ہے۔ اس لڑکی کا کتنا دل دکھے گا۔ محنت اس کی نام میرا، آپی کو کسی پل چین نہیں آرہا تھا۔
بار بار کہانی پڑھتی افسوس کا اظہار کرتی، پھر بے چین ہو کر کہانی پڑھتی، اب آہستہ آہستہ ذہن کام کرنے لگا۔ تو ایک دم چیخ ماری۔
”امی امی جی! یہ تو میری ہی لکھی ہوئی کہانی ہے جو کہ میں نے شادی سے بھی بہت پہلے لکھی تھی، انہوں نے اسے اب جگہ دی جب کہ میں شادی شدہ اور ایک بچی کی ماں ہوں۔ کوئی اتنی دیر بھی کرتا ہے۔ ہاں امی یہ تو میں نے فلاں وقت میں لکھی تھی۔ اب وہ خوشی سے جھوم رہی ہے۔ خوش ہے بے تحاشا خوش۔“
مجھے یاد آیا۔ جب اس کی شادی ہوگئی تو اگلی صبح پاپا اسے یاد کرنے لگے۔ اب پاپا آنسوؤں سے رو رہے ہیں اور پنجابی میں امی سے کہتے ہیں۔ ”کسی کو کچھ نہیں کہتی تھی وہ، سارا وقت ایک کونے میں بیٹھ کر پتا نہیں کیا لکھتی رہتی تھی۔“
آپی کو پودوں سے عشق تھا۔ گھر میں منی پلانٹ، موتیا، گل دوپہری، اسنیک پلانٹ اور بہت سے پودوں کے نام تو مجھے آتے ہی نہیں ہیں جو کہ اس نے گملوں میں لگا رکھے تھے۔ پودوں سے اس کی محبت کا مجھے اندازہ تب ہوا جب ایک دن صحن میں منی پلانٹ کے پودے کے پاس بیٹھی ہے، ہاتھ میں ڈائری اور قلم ہے۔ میں اچانک کمرے سے نکلی تھی یہ دیکھ کر ساکت و جامد ہوگئی کہ وہ ڈائری میں لکھ رہی ہے کہ کس پودے کی کتنی شاخیں نکلی ہیں۔ کتنے پودوں پر کلیاں آگئی ہیں کتنے پتے نئے نکلے ہیں۔ مجھے دیکھ کر اس نے ڈائری بند کردی اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھا کہ۔
جاؤ تمہارا یہاں کیا کام۔
”ساری زندگی امی اور میرے کپڑے اس نے سیئے۔ میں اسکول میں پڑھاتی تھی۔ جب اس کی زندگی میں دو بچیاں تھیں۔ آبگین اور اعناب وہ اتنی مصروفیت کے باوجود میرے کپڑے سیتی۔
میں سدا کی ناشکری، بدتمیز۔ وہ میرے آگے سلا ہوا سوٹ رکھتی، میں اس میں نقص نکالتی۔ اس میں یہ کمی ہے۔ یہ سلائی کچھ ٹیڑھی نہیں لگ گئی، وہ صبر سے سب سنتی اور برداشت کرتی۔
ایک دن اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ مجھے تو کچھ نہ کہا۔ گھر آئی میری قمیض کا گولا بنایا اور غصے سے پھینک دیا اور امی سے کہتی ہے۔
”امی یہ میرے ساتھ ایسا سلوک کرتی ہے کہ جیسے میں ایک بیوہ سلائی کرنے والی ہوں اور یہ مجھے سلائی دیتی ہے تو اس سے میرا گھر چلتا ہے۔ میں اللہ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ آج کے بعد اس کا کوئی کپڑا نہیں سیوں گی۔“
امی حیران ہو کر اس کا غصہ دیکھ رہی ہیں، میں شرمندہ پلس خوف زدہ کہ ہائے یہ کیا کہہ دیا آپی نے، اب آپی کبھی میرے کپڑے نہیں سیئے گی۔

چند دن گزرے، وہ عابدہ باجی کے گھر گئی ان کے گھر سے بہتی زیور اٹھا کر لائی۔ دو کمروں کا ہمارا گھر چھپ چھپ کر کتاب پڑھے۔ مجھے تجسس کہ یا اللہ ایسا کیا پڑھ رہی ہے آپی کہ ساتھ ساتھ چھپا بھی رہی ہے۔ بہر حال کتاب پر نشانی لگائی اور کمرے سے نکل گئی۔

جب مجھے یقین ہو گیا کہ وہ اب کافی دیر تک نہیں آئے گی تو کتاب اٹھا کر کھولی اور مجھ پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑے، وہ ''قسم توڑنے کا کفارہ کیسے ادا کیا جائے۔'' باب پڑھ رہی تھی میں اس کی اتنی محبت پر نہال ہو گئی۔ میں نے اسے کبھی نہ جتایا کہ میں جان گئی ہوں کہ وہ کیا کرتی پھرتی ہے میری محبت میں۔

ایک بار کالج میں دوستوں کے گروپ میں کسی نے سوال کیا کہ اگر زندگی کا کوئی راز ہو تو سائرہ تم کسے بتانا پسند کرو گی دوست کو یا بہن کو۔ اس نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر جواب دیا کہ دوست کو بتاؤں گی۔

سب دوستیں پیچھے پڑ گئیں کہ بہن کو کیوں نہیں بتاؤ گی۔ تو اس نے اس بات کا جواب نہیں دیا۔

مجھے اس نے ہمیشہ ایک دودھ پیتی بچی کی طرح ٹریٹ کیا۔ وہ بہترین سامع تھی۔ آپ گھنٹوں اس کو اپنی بات بغیر وقفہ لیے سنا سکتے ہو۔ بہترین راز دار۔ بات اگر آپی کو بتائی ہے تو مطلب سمندر کی گہرائی میں دفن کر دی ہے۔ ساری زندگی نہ ہی کسی کا پہنا اوڑھا دیکھ کر حسد کیا۔ سب کو بہترین مشورے دیے۔ اگر کبھی کسی نے اس کے سامنے کسی دوسرے کی برائی کرنے کی کوشش کی تو آپی نے اسے وہیں روک دیا۔

وہ نہ کسی کی برائی کرتی تھی نہ ہی سننا پسند کرتی۔

چھوٹی بھابھی اکثر اپنے بچوں کی شرارتوں سے تنگ آ کر انہیں مارتیں۔ امی کی برداشت صفر ہو جاتی۔

امی انتظار کرتیں کہ کب سائرہ آئے اور میں اسے بتاؤں کہ گل ناز نے کتنے برے طریقے سے ابوبکر کو مارا۔ وہ آتی۔ امی اسے بتاتیں۔ آپی کبھی بھابھیوں کے خلاف بات نہ سنتی۔ الٹا امی کو ہی سمجھاتی۔

''امی گل ناز جتنا مرضی بچوں کو مارے آخر وہ ان بچوں کی ماں ہے۔ بچے اسی کے پاس جائیں گے۔'' یہ سن کر امی حیران ہو جاتیں۔

''آپ دادی ہیں۔ میں پھپھی ہوں۔ پہلا رشتہ ماں کا ہے۔ ہم بعد میں آتے ہیں۔''

یہ باتیں امی کی زندگی کے آخری دنوں کی ہیں جب وہ ہر چیز کے حوالے سے زود رنج ہو چکی تھیں۔ بچوں کی طرح ناراض ہو جاتیں اور آپی انہیں ہینڈل کرنا جانتی تھی۔ وہ امی کو مطمئن کر دیتی۔ سائرہ رضا کو سائرہ رضا بنانے میں اس کی ذاتی محنت تو تھی ہی، یہاں احمد کا کردار بھی قابل ذکر ہے۔ صبح صبح امی کو فون کرتی۔

''امی! احمد آفس کے لیے نکلا تو نہیں۔ میرے ناول کی قسط چینل پر دینی ہے۔''

امی جواب دیتیں۔

''سائرہ! تم بے فکر رہو۔ وہ تمہاری بلڈنگ کے نیچے کھڑا ہے۔ قسط لے کر جائے گا۔'' آپی کو آفس لے کر جاتا۔ واپسی پر آپی اس کے ساتھ ہی آتی احمد کہتا تھا۔

امی! مجھے آپی پیاری لگتی ہے اور حمیرہ سے محبت ہے اور میں امی سے کہتی۔

''امی جی ان دونوں باتوں کا ایک ہی مطلب ہے۔ احمد کہتا ہے کہ آپی بہت خوب صورت تھی اس کی ڈریسنگ کمال ہوتی تھی۔ جب آپی کو آفس سے پک کرتا تو اس پر نظر نہیں ٹھہرتی تھی۔

آپی میرے مزاج کا لحاظ کرتے ہوئے اپنا چہرہ دوپٹے سے اچھی طرح ڈھانپ لیتی۔ اب آپی کو کیسے کہوں کہ تمہاری آنکھوں کا کیا۔ ساری خوب صورتی تو آنکھوں میں سمٹ گئی ہے۔

امی کی سادگی پر بھی بڑا پیار آیا جب آپی کی شادی ہوئی امی کے اسکول کا تمام اسٹاف مدعو تھا۔ مس زاہدہ اپنی فیملی کے ساتھ شریک ہوئیں۔ شادی اٹینڈ کرنے کے بعد انکل نے کہا۔

''باجی شاہدہ کی بیٹی کی آنکھیں کس قدر خوب

صورت ہیں۔'' امی حیران کہ ایسا بھی کیا ہے میری بیٹی کی آنکھوں میں۔اس نے زاہدہ سے کہا۔

''باجی! سائرہ کی آنکھیں ہرے رنگ کی ہیں۔ کتنی بڑی بڑی بادام کی طرح۔'' پھر امی نے غور کیا اور مسکرادیں۔

پاپا بھی امی کو اکثر چھیڑا کرتے تھے۔کہ بڑے دو گورے بچے (آپی سائرہ رضا اور بھائی تیمور رضا) میرے ہیں۔اور چھوٹے دونوں بچے جو سانولے ہیں وہ تمہارے ہیں۔(حمیرا اور احمد)

(ہمارے ننھیال والوں کا رنگ سانولا تھا۔اور ددھیال والے گورے گلابی) امی خاموش رہتیں اور مسکراتی رہتیں۔کبھی امی نے پاپا کی اس بات کا برا نہیں مانا۔

تیمور سے آپی کی دوستی کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔تیمور گھر میں کلر کررہا ہے تو یقیناً اس کے پیچھے سائرہ کا ہاتھ ہے۔گھر کی سیٹنگ تبدیل ہورہی ہے دونوں بہن بھائی ایک دوسرے سے مشاورت کیے بغیر کوئی کام نہ کرتے۔پی ٹی وی کے بعد دوسرا بڑا چینل این ٹی ایم تھا۔ہم پی ٹی وی سیٹ کرتے این ٹی ایم غائب ہوجاتا اگر این ٹی ایم سیٹ کرتے پی ٹی وی غائب۔روز انٹینا سیٹ ہوتا ایک بار بھائی تنگ آ گیا ہم نے فیصلہ کیا کہ مستقل بنیادوں پر انٹینا این ٹی ایم کی طرف سیٹ کردیتے ہیں۔پھر رات بھر جاگ کر پاکستانی فلمیں دیکھا کرتے تھے۔این ٹی ایم کی مکمل نشریات دیکھتے دیکھتے سب بہن بھائی جوان ہوگئے۔

تیمور اور سائرہ کی محبت مزید گہری ہوتی گئی۔ ابھی اس محبت میں احمد کہیں نہیں ہے۔

اور پھر اچانک نہ جانے کب، کیسے ہم سب پر انکشاف ہوا کہ آپی تو احمد کی محبت میں غرق ہوچکی ہے۔احمد کا غم، احمد کی کوئی پریشانی اس سے ڈھکی ہوئی نہیں ہے۔کچھ عرصے سے ایسا لگتا تھا۔بس احمد ہی ہے جو اس کی زندگی میں ہے۔اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ تیمور سے اس کی محبت میں فرق آیا۔

بس ایسا محسوس ہوتا کہ اس کی روح احمد کی روح سے جڑ گئی ہے کیوں کہ حمیرا! آپی مجھ سے محبت نہیں کرتی تھیں۔انہیں مجھ سے عشق تھا۔

میری آپی بہت گہری تھی۔اول تو اس نے کبھی اپنے دکھ سکھ کسی کو بتائے ہی نہیں اور اگر بتائے بھی تو احمد کو۔احمد کا کہنا ہے کہ آپی نے اپنی ہر تکلیف، دکھ، پریشانی مجھ سے شیئر کی۔حتیٰ کہ امی تک کو کبھی کچھ نہ بتایا۔

وہ بہت غیرت مند تھی۔حساس دل کی مالک۔بقول اس کے وہ امی کو کبھی کچھ بتانا نہیں چاہتی تھی۔کہ میری ماں بیوہ عورت ہے انتہائی محنت اور محبت سے انہوں نے ہماری پرورش کی ہے۔میری ذات سے انہیں دکھ تکلیف کیوں پہنچے۔

کبھی اچانک بچیوں کی انگلی پکڑ کر گھر آجاتی اور امی سے کہتی کہ۔

''امی میں آج آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

امی بالکل یقین نہ کرتیں امی کہتیں۔

''سائرہ میں تمہاری ماں ہوں۔میں نے تمہیں پیدا کیا ہے۔میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔تم کبھی بھی مجھ سے ملنے نہیں آتیں۔''

(آپی کا گھر امی کے گھر سے پیدل کے فاصلے پر تھا۔دن رات ہم بہن بھائی اس کے گھر میں پائے جاتے تھے۔آپ کیونکہ ہمارے گھر کا پہلا بچہ اس کی محبت ہمیں مجبور کرتی کہ ہم ہر وقت آپی کے گھر میں موجود رہتے) امی کی بات پر آپی زیر لب مسکرائی۔مگر کبھی بھی دل کا بھید نہ دیتی۔

سارا دن گزار کر جس خاموشی سے آئی تھی۔اسی خاموشی سے اپنے گھر لوٹ جاتی جب بات بہت پرانی اور بے معنی ہوجاتی۔اس کا اثر ختم ہو جاتا تو سرسری سا بیان کردیتی۔

امی اس دن ہمارے گھر گیس نہیں آرہی تھی۔ یہ سنتے ہی امی کے ہوش گم ہوجاتے سائرہ تو نے کتنی پریشان اٹھائی ہوگی۔'' اور وہ مسکرادیتی۔

ہمارا گھرانہ متوسط تھا۔والد صاحب نظر کی

کمزوری کے باعث اب گھر پر ہی ہوتے تھے۔ اپنے وقت میں انہوں نے ہمیں خوب بہترین کھلایا پلایا۔

آپی کی شادی ہوئی، امی نے زیور، کپڑا، فرنیچر ہر چیز آپی کو دی، بس نہیں دے سکیں تو فریج نہ دے سکیں۔

آپی کی شادی کے شروع میں تو مجھے اس کمی کا اندازہ نہ ہو سکا۔ کچھ وقت بعد جب آبگین ہماری زندگیوں میں آئی، میں کالج سے گھر آ کر اسکول پڑھانے جاتی تھی۔ یہ اسکول آپی کے گھر سے دو گلیاں آگے تھا۔ تو لازمی آپی کے گھر کا چکر لگاتی آبگین سے ملنے کے لیے۔

شدید گرمی کا موسم آپی سے پانی کا گلاس مانگا، گرم پانی پکڑا دیا۔ میں نے حیرت سے آپی کو دیکھا۔

”آپی! برف نہیں ڈالی۔“ فوراً جواب حاضر۔

”ہاں، وہ مشتاق لینے گئے تھے دکان پر، گرمی بہت ہے ختم ہو گئی شاید۔“

میں خاموش ہو گئی آبگین کو پیار کیا اور اسکول چلی گئی۔ مگر اپنی بہن کا گرم پانی پینا برداشت نہ کر سکی وہ بہت صابر انسان تھی۔ کبھی حرف شکایت زبان پر نہ لائی۔

میں سدا کی احمق۔ گھر پہنچی ڈر ڈر کر امی کو بتایا کہ امی آپی گرم پانی پیتی ہے۔ امی ہم صبح کولر میں برف ڈال لیتے ہیں میرے اسکول جانے تک فریج میں دوبارہ برف بن جاتی ہے۔ کیوں نہ میں اسکول جانے سے پہلے یہ ساری برف آپی کو دے دیا کروں۔“

امی خاموش ہو کر سنتی رہیں نہ جانے دل کے کس کس گوشے میں درد کی ٹیسیں اٹھی ہوں گی کہ میری بیٹی گرم پانی پیتی ہے۔ فلیٹ بھی ٹاپ پر سورج سر پر۔ بس کہا تو صرف اتنا کہ تم اسے برف دے دو گی۔ تمہیں اسکول سے دیر نہیں ہو گی اور میں خوش پر جوش، جذباتی نہال ہو گئی۔

”جی امی! بالکل دے دوں گی۔ کوئی دیر نہیں ہو گی۔“ پھر یہ ڈیوٹی امی نے، میں نے تیمور بھائی نے ایک سال تک نبھائی۔

جب اسکول میں چھٹی ہوتی اتوار کے دن امی چلی جاتیں، بھائی جاتا۔ سائرہ اور تیمور ایک دوسرے سے جدا تھوڑی تھے۔ یہ دونوں ایک ہی تھے ایک دوسرے کے ہمراز۔

پھر نہ جانے کیا ہوا ایک دن اچانک تیمور بھائی نے آپی کا دروازہ بجایا اور سائیڈ پر ہونے کا کہا دو تین مرد اندر آئے وہ خالی ہاتھ نہیں تھے۔ ان سب کے ہاتھوں میں فریج تھا۔ فریج کی جگہ بنائی۔ چوکی رکھی۔ فریج اس پر کھڑا کر دیا۔

آپی حیران یہ سب کیا ہے۔ لالے (تیمور کا پیار کا نام) نے کہا ”لے سائرہ تیرا فریج آ گیا۔“

”نہ جانے کیسی خوشی تھی۔ اس کے چہرے پر فریج آنے کی تو نہیں تھی شاید، بھائی کی محبت کی احساس کرنے کی خوشی تھی۔ ساری زندگی قناعت سے گزار دی۔

امی اسکول سے آتی تھیں۔ تمام ٹیچرز سیدھی گھروں کو جاتی تھیں۔ مگر امی ناک کی سیدھ میں اسکول کی گلی سے نکل کر سبزی والے کی دکان پر جاتیں سبزی خریدتیں اور پھر بس اسٹاپ پر آ کر کھڑی ہو جاتیں۔ گھر آ کر تالا کھولا۔ چادر اتاری کپڑے بدلے۔ ہاتھ دھوئے اور کچن میں داخل ہو گئیں۔ تازہ کھانا بنایا۔ کبھی زندگی میں ہم نے باسی روٹی کا لقمہ تک نہ توڑا۔

اس دوران آپی اسکول سے آ جاتی کھانا پکنے میں ٹائم ہے اگر تو صبح کی بچی ہوئی روٹی یا پراٹھے کا کوئی ٹکڑا مل گیا۔ پیاز کو مکا مارا دو ٹکڑے کیے پیاز کے ساتھ روٹی کھائی۔ الحمد للہ کہہ کر ہاتھ جھاڑ لیے۔ اب کھانا تیار ہے امی نے کہا۔

”سائرہ! آؤ کھانا کھا لو۔“ تو جواب حاضر۔

”نہیں امی میرا پیٹ بھر گیا۔“ امی اس کی

قناعت پر حیران، زندگی کے ہر میدان میں قناعت پسندی اس کا شیوہ رہی، تقریباً چار یا پانچ ماہ پہلے میں نے اسے کال کی اور کہا۔

''آپی، آج کل تو جب بھی ٹی وی کھولو، بڑی بڑی رائٹرز مختلف چینلو پر انٹرویو دیتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ تم کیوں الیکٹرانک میڈیا پر نظر نہیں آتیں۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ لوگ تمہیں بھی چہرے سے پہچانیں۔'' تو اس نے ایک دم کہا۔

''حمیرا تیرا تو دماغ خراب ہے۔ میں کیوں دوں انٹرویو۔''

''آپی! میں تمہاری جگہ ہوتی تو ہر کسی کو انٹرویو دیتی اور مشہور ہو جاتی کیا تمہیں چینل والے بلاتے نہیں ہیں؟''

''جواب آیا۔'' کیوں حمیرا مجھے کیوں نہیں بلاتے۔ بس میں نہیں جانا چاہتی جتنا مشہور ہونا تھا ہو گئی میرے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ میرے سرکل کے لوگ مجھے پہچانتے ہیں۔''

اور میں حیران کہ ایسے بھی لوگ ہوتے ہیں دنیا میں کہ جنہیں شہرت کی بھوک بھی نہیں ستاتی۔

آپی کی نئی نئی شادی ہوئی تھی، جب وہ امی کے محلے سے اگلے محلے میں شفٹ ہو گئی یہاں ہر آنٹی، باجی نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ کم عمر، پیاری سی میری پیاری سائرہ آپی، ہر کوئی اس سے محبت کرتا۔

شمشاد آنٹی کی بہن کی شادی طے پائی تو لہنگا خریدنے کے لیے خاص طور پر سائرہ کو ساتھ لے کر بازار گئے کہ سائرہ کی پسند بہترین ہے۔ لالوکھیت مارکیٹ (المشہور لیاقت آباد) گئی۔ وہاں لہنگا پسند کیا۔ گھر آئے تو کیا دیکھتی ہے۔ ایک کے بجائے لہنگے کے ساتھ غلطی سے دو شرٹ پیس بھی آ گئے ہیں۔ انتہائی بے چین ہو گئی۔ شرٹ نکال کر اپنے قبضے میں کی کہ ہائے بے چارہ سلیز مین اس کی کم بختی آئے گی۔ اب دکاندار اس سے اس نقصان کا بدلہ لے گا۔

مصروفیت میں ایک دو دن گزرے۔ اب ہمارے دروازے پر کھڑی ہے۔

''آ حمیرا بازار چلیں کیوں کیا ہوا آپی؟''

''کہتی یہ شرٹ واپس کرنی ہے۔''

ہم جب دکان میں داخل ہوئے انکل نے آپی کو دیکھا مسکرائے۔ آپی نے شرٹ نکال کر انہیں پکڑائی تو بڑے مطمئن انداز میں کہتے ہیں۔

''میں جانتا تھا کہ میری بیٹی خود ہی آئے گی۔''

آپی حیران انکل سے کہتی ہے ''آپ پریشان نہیں تھے آپ نے نہیں سوچا کہ اب تو شرٹ واپس نہیں ملے گی (واضح رہے انکل میری آپی کو بالکل بھی نہیں جانتے تھے) انہوں نے کہا۔

''بیٹا میں جس جگہ بیٹھا ہوں روز یہاں نت نئے چہرے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ اب اتنا چہرہ شناس ہو گیا ہوں کہ پہچان جاتا ہوں کہ کون کیسا ہے مجھے یقین تھا کہ میری بیٹی ضرور آئے گی۔''

آپی مسکرائی اور ہم گھر کی جانب چل دیے۔

چند سال پہلے میری بڑی بھابھی، ناصرہ تیمور بھائی کی بیگم کے ساتھ بازار گئی۔ واپسی پر شدید بھوک کا احساس ہوا کسی لڑکے نے باربی کیو کی ریڑھی لگائی ہوئی تھی۔ اشتہاء انگیز خوشبو نے بھوک کو چار چاند لگا دیے۔

پہلے ہی اس لڑکے سے کہہ دیا۔

''دیکھو ہم نے تمہیں آرڈر تو دے دیا ہے۔ لیکن ہماری بس آ گئی تو آرڈر کینسل، ہم چلے جائیں گے۔''

تکہ تیار ہو گیا وہیں کھڑے کھڑے نند بھابھی کھانے لگیں۔ بلا کی بذلہ سنج تھی۔ میری آپی تکہ کھایا مزہ آ گیا۔ تکہ والے نوجوان کے قریب جا کر کہتی ہے۔

''بھائی! مجھے اس کے مسالے کی ترکیب بتا دو۔ لا الہ الا اللہ میں بالکل بھی تمہاری ریڑھی کے سامنے ریڑھی نہیں لگاؤں گی۔ بس اپنے بچوں کو

بنا کر کھلاؤں گی۔''
وہ لڑکا مسکرایا ساری ترکیب آپی کو بتا دی۔
گھر آنے پر ناصرہ بھابھی نے ہنس ہنس کر یہ واقعہ بتایا کہ ہمارے پیٹ میں بل پڑ گئے۔ دوتوں کو ہنسا دینے والی شخصیت تھی میری بہن۔
جب کبھی سنجیدہ لکھا تو حیران کر دیا اور اگر مزاحیہ لکھا تو ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو گئے۔ میں نے بارہا کہا کہ آپی تم نے میری شادی کا احوال نہیں لکھا اس کا یہی جواب کہ اگر چاچو کو پتا چلتا تو وہ برا مانتے میں جل کر خاک ہو جاتی۔ دلائل دیتی یہ اس کا انکار اقرار میں بدلتا نہ میں اس کا پیچھا چھوڑتی وہ ہار کر خاموش ہو جاتی اور میں روٹھ جاتی۔ میں صفحات کی بندش کے باعث مزید نہ لکھ سکوں گی۔
اس کی وہ کہانیاں جو کرن میں چھپیں کلاسک کا درجہ رکھتی ہیں۔ کچھ کرن اس سے گم ہو گئے جس پر اسے اکثر پریشان دیکھا۔ باقی اس کی جدوجہد سے تمام قارئین واقف ہیں کہ کس طرح ننھی سی آبگین کو امی کے پاس چھوڑا۔ اعناب کی انگلی پکڑی۔ تذکی کو گود میں اٹھایا۔ اور اجل کے پاس دفتر پہنچی اور اپنا مقدمہ اجل کی عدالت میں پیش کیا اور مقدمہ جیت کر ہی دم لیا۔
میری والدہ اکثر کہا کرتی تھیں۔
''سائرہ سے کوئی حسد نہ کرے۔ اس نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ سراسر اس کی ذاتی محنت کا نتیجہ ہے۔ سائرہ کو کوئی چیز پلیٹ میں رکھ کر نہیں ملی۔ سائرہ کی آنکھیں پانی ہو گئی ہیں۔ سر خالی ہو گیا (مراد سر کے بال جھڑ گئے) سائرہ گنجی ہو گئی۔''
خیر ایسا تو کچھ نہیں تھا۔ یہ تو ماں کی محبت کی انتہا تھی۔ انہیں لگتا سائرہ لکھتے لکھتے ختم ہو گئی ہے۔ اس کی صحت برباد ہو گئی ہے۔ اس میں کچھ نہیں بچا۔ میں خدا کی شکر گزار ہوں کہ میری ماں نے آپی کے جانے کا غم نہیں جھیلا۔ یہ غم امی کو جیتے جی مار دیتا۔
16 جون کو تیمور بھائی کی کال آئی کہ حمیرا، یاد ہے آج کیا تاریخ ہے۔ میں نے کہا بالکل آج امی کی پہلی برسی ہے۔ اس کے بعد بھائی نے جو کہا اس نے میرا دل مٹھی میں مسل دیا بھائی کہتا۔
''مجھے بتاؤ میں کس کو رووں؟ ماں کو یا بہن کو؟
اور میں نے انتہائی صبر اور ہمت سے جواب دیا کہ دونوں کو ہی نہ روؤ کیوں کہ یہ فیصلہ اللہ کا ہے۔ اللہ نے ہی ہمیں یہ بہت بڑے بڑے غم دیے ہیں ہم اس کی رضا میں راضی ہیں۔''
سائرہ آپی کی وال پر دنیا نے لکھا اللہ بیٹیوں کو صبر دے۔ میرا دل ٹوٹ گیا۔ میں نے آبگین سے کہا۔
''ہم بہن بھائیوں کا ذکر کیوں نہیں ہے کیا یہ ہمارا غم نہیں ہے۔''
آبگین نے کہا۔ ''میاء (یہ نام مجھے انہی بچیوں نے دیا ہے شروع سے) آپ کا گھر ہے۔ شوہر ہے۔ بچے ہیں آپ کو صبر آ جائے گا۔ ہماری تو ماں گئی ہے۔ ہمارا نقصان آپ سب سے بڑا ہے۔''
اور میں خاموش ہو گئی۔ بچیوں نے ماں کی قبر پر نہ نانا کا نام لکھنے دیا نہ ہی اپنے والد کا بقول بچیوں کے۔
''ہماری والدہ کو ایسے کسی تعارف کی ضرورت نہیں، وہ خود اپنی ذات میں ایک مکمل شخصیت ہیں۔ ان کی پہچان کے لیے صرف سائرہ رضا ہی کافی ہے۔''
آپی کی قبر کے کتبے پر تحریر
یہ آبگین، اعناب، اور تذکی کی مما مصنفہ سائرہ رضا کی آخری آرام گاہ ہے۔
آبگین نے بالکل سچ کہا نقصان تو ان بچیوں کا ہی ہوا ہے۔
بدقسمت حمیرا رضا جس کی آپی اب نہیں رہی۔

☆☆

خط آگہی

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

...عمر خان نے کراچی سے شرکت کی ہے، ... ہیں

اس بار نگہت سیما صاحبہ نے مجھے قلم اٹھانے پر مجبور کیا ہے۔ ماء الملوک کی زبردست اسٹوری ایک طرف مگر اس کہانی میں جو اپنے ملک کے حالات پر بات کی جاتی ہے غم زدہ دل اور اداس ہو جاتا ہے مارچ کے شمارے میں طیب کے یہ الفاظ ہم بہت احسان فراموش قوم ہیں سر''اپنے محسنوں کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے۔ میں جب جب سوچتا ہوں کہ ہم نے عبدالقدیر خان کے ساتھ کیا کیا تو میرا دل خون کے آنسو روتا ہے۔''

ان الفاظ نے مجھے جھنجھوڑ کر رکھ دیا، یہ سوال تو میں بھی اپنے آپ سے کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی۔ مگر جواب نہ میرے پاس ہے اور نہ کسی اور کے پاس۔ ہمارے پاس صرف شرمندگی ہے۔

میں کافی ٹائم سے خواتین میں چھپنے والے انشاء جی کے کالم کے بارے میں لکھنا چاہتی تھی، آج نگہت جی کی وجہ سے میری ہمت بھی مضبوط ہو گئی ہے۔ انشاء جی کے کالم پڑھ کر مجھے کبھی ہنسی نہیں آئی بلکہ عجیب طرح کی شرمندگی ہوتی تھی اور دل دکھ سے بھر جاتا تھا۔ انشاء جی نے یہ کالم آج سے تیس چالیس سال پہلے لکھے تھے، اس وقت ملک کے جو حالات تھے ایک لکھاری نے اپنا حق ادا کرنے کے لیے اور اس وقت کی حکومت کو احساس دلانے کے لیے طنز و مزاح کا انداز اپنایا۔

تیس چالیس سال کم عرصہ نہیں ہوتا ایک نسل پیدا ہو کر جوان ہو کر اپنے پاؤں پر کھڑی ہو گئی مگر ہمارا ملک آج بھی وہیں کھڑا ہے ایک فیصد بھی بہتری نہیں آئی حالات میں۔ ترقی تو چھوڑو۔ ہمارے بنیادی مسائل بھی حل نہ کیے جا سکے۔ تمام مسئلے آج بھی اپنی جگہ جوں کے توں موجود ہیں (نہیں بلکہ حالات ٹھیک ہونے کے بجائے اور خراب ہو رہے ہیں۔ میں جو اس دنیا میں چالیس سال گزار چکی ہوں مجھے ایسا لگتا ہے میرے بچپن میں حالات پھر بھی بہتر تھے۔ بجلی کی اتنی لوڈشیڈنگ نہیں ہوتی تھی گیس کا مسئلہ اتنا نہیں تھا جتنا اب ہے۔ پانی بھی نلکوں میں آتا تھا ٹینکر تو شاذ ہی کوئی ڈلواتا تھا۔ سرکاری اسپتال اور سرکاری اسکول بھی آج سے بہت بہتر تھے۔

میں نے خود سرکاری اسکول سے پڑھا ہے آج میں کہانیاں لکھ رہی ہوں جبکہ آج کل کے سرکاری اسکول میں پڑھنے والوں کو اردو پڑھنی بھی نہیں آتی۔ ہم نہ صرف اپنے محسنوں کو سر بازار ذلیل کرنے والے لوگ ہیں۔ بلکہ ہم اپنے حق کے لیے آواز نہ اٹھانے والے مردہ دل اور بے ضمیر لوگ ہیں کس کس بات پر روئیں۔ رونے سے مسئلے حل نہیں ہوتے ہمیں ایک قوم بننا ہوگا۔

ماء الملوک یہ کون لوگ ہیں، جو کہتے ہیں زل اور آزین الگ ہو جائیں گے ایسا ہو ہی نہیں سکتا بے میرا کہانیاں پڑھنے کا پچیس سالہ تجربہ کہتا ہے کہ زل آزین کی تھی، ہے، اور رہے گی۔

''عید تم سنگ'' صائمہ جی کیا خوب لکھا آپ نے۔ مجھے وہ وقت یاد کروا دیا جب میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ یہی سب کچھ میرے ساتھ ہوا تھا۔ شادی کے بعد میں صبح فجر کی اذان کے وقت اٹھتی اور ساس کو بھی آواز دیتی تھی، صرف ایک دن میری آنکھ نہیں کھلی۔ کسی نے میرا

دروازہ نہیں کھٹکھٹایا۔ جب سات بجے میں نے کمرے کا دروازہ کھولا تو نہ پوچھیں ساس کا چہرہ کیسا تھا۔ وہ بھی عاصمہ جیسی تھیں مجھے کچھ نہیں کہتی تھیں اگر وہ مجھے کچھ کہتیں تو میں بات کی وضاحت بھی کر دیتی مگر خیر بہت مشکل وقت تھا۔ وہ بھی مگر گزر گیا اور آج اپنا گھر اپنا اختیار اور ساس بھی ہر کام کے لیے مجھ سے مشورہ کرتی ہیں۔ سچ ہے صبر کا پھل مل جاتا ہے۔ واصفہ جی آپ سے تو کٹی ہو گئی یہ جو (کھلتا کسی پہ) میں جو آخری شعر ہے یہ میں نے بھی لکھ کر بھجوایا تھا تب تو نہیں لگایا آپ نے اور اب صنوبر جی نے بھیجا تو لگا دیا۔

"زرنم" پڑھ کر دل خوش ہو گیا بھئی بات ہو ہمارے فوجی جوانوں کی اور ہمارا دل خوشی سے سیلوٹ نہ کرے یہ تو ہو نہیں سکتا۔ کاش میرے ماموں زندہ ہوتے تو میں بھی ایسی کہانی لکھتی فوجیوں پر کہ سب پڑھ کر حیران رہ جاتے (میرے چھوٹے ماموں فوج میں تھے 2015ء میں وہ شہید ہو گئے تھے، وہ اتنے بذلہ سنج اور زندہ دل تھے اپنی یونٹ کا ہر قصہ اتنے مزے سے سناتے اور ہم ہنس ہنس کر پاگل ہو جاتے تھے۔

ریحانہ جی مبارک باد قبول کریں ماشاء اللہ سے رائٹر بن گئیں پڑھ کر ایسا لگا جیسے زرینہ لغاری صاحبہ نے لکھا ہو کیسی ہیں آپ زرینہ جی اور میری بھتیجی عینا کیسی ہے۔

"دستک" میں عروج بنت ارسلان کو پڑھا ہے لگن سچی ہو تو منزل مل جاتی ہے مجھے بہت حوصلہ ملا پڑھ کر ایک دن میں بھی ڈرامہ لکھوں گی ان شاء اللہ روشن ہے صبح عید، پڑھ کر مزا آیا عید اور عید کی خوشیاں ایک جیسی ہوتی ہیں۔

"عید کے رنگ" فرخندہ جی آپ نے تو ہنسا دیا اور کیا کیا یاد کروا دیا۔

ج: پیاری عینا! ڈاکٹر عبدالقدیر خان کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا غم میں نے جانا گویا یہ میرے دل میں ہے، سچ تو یہ ہے کہ یہ میری اور آپ کے دل کی ہی نہیں۔ ہم سب کے دل کی آواز ہے۔ چند کور چشم کوتاہ بیں لوگوں کو چھوڑ کر پوری پاکستانی قوم دل سے ان کی قدر کرتی ہے۔

اس عظیم انسان نے پاکستان اور مسلم امہ پر جو احسان کیا ہے۔ ہم اس کا قرض نہیں اتار سکتے۔ خیر ہم قرض تو کیا اتارتے۔ ہم نے تو ان کے ساتھ وہ کیا جو ان کے دشمن بھی نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلا مقام سے نوازے۔ آمین

کراچی سے اسماء بنت محمد فیاض خان نے لکھا ہے

شعاع کی محفل زبان، نسل، قومیت سے بالاتر ہو کر ایک فیملی کی طرح ہے۔ شعاع کے اس گل دستے میں ہم ایک نئی پیاری سی پھول (شہزادی ماہ رخ بلند سواتی) کو ہر کالے اشی والیوں پخیر راغلے۔ مرحبا، خوش آمدید۔ میری چھوٹی سی پیاری بہن۔

بہن رضوانہ وقاص کی بیماری کا پڑھتی ہوں تو دل سے ایک ہی دعا نکلتی ہے کہ اے ساری کائنات کے رب بہن رضوانہ وقاص اور جتنے بھی بیمار ہیں ان تمام کو صحت کاملہ عطا کر۔ ایک تو رسالے اتنے لیٹ ملتے ہیں (لیٹ ہونے کی وجہ) میرے رسالے میرے بابا جانی کراچی شہر سے مردان شہر، شکئی بھیجتے ہیں مجھے، پھر میں تبصرہ لکھ کر اپنے بابا جانی کے واٹس ایپ نمبر پر کراچی شہر ارسال کر دیتی ہوں۔ میرے بابا جانی ان خطوط کو اپنے شہر کراچی سے پوسٹ کر دیتے ہیں۔

یہ تمام کریڈٹ میں اپنے بابا جانی کو دیتی ہوں جو کہ اپنی بے انتہا مصروفیت میں سے وقت نکال کر میرے خطوط پوسٹ کر دیتے ہیں ویل ڈن (بابا جانی)

اب آتے ہیں مختصر تبصرے کی طرف۔ ٹائٹل اعلیٰ سے اعلیٰ مجھے بہت ہی اچھا لگا۔ معصوم سا چہرہ۔ حمد باری تعالیٰ اور نبی پاکؐ کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح اچھی رہیں۔ معروف ڈرامہ نگار ظفر معراج صاحب سے ملاقات اچھی لگی۔ کابلی پلاؤ کی تو بات ہی الگ ہے۔

شازیہ الطاف ہاشمی صاحبہ کی کامیاب عورت۔ واقعی حمدہ ناکام عورت ثابت ہوئی، پیسہ سب کچھ نہیں ہوتا ہے۔

ج: پیاری اسماء! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ خط بھیجنے کے لیے آپ کو جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس کا اندازہ ہے۔ آپ کے شوق اور آپ کے والد کی محبت کو سلام کرتے ہیں۔ آپ واقعی با صلاحیت ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ کی صلاحیتوں کو سامنے لانے

میں آپ کے والد اور دیگر گھر والے تعاون کر رہے ہیں۔

تنزیلہ حسن نے پوچھا ہے

میں نے ایک ناول لکھا ہے۔ میرا ناول تحریکِ پاکستان کے پس منظر میں ایک خاندانی کہانی ہے جس میں موجودہ دور کے مسائل اور احساسات بھی بیان کیے گئے ہیں، تا کہ نئی نسل ماضی اور حال دونوں سے روشناس ہو سکے۔

ج: پیاری تنزیلہ! آپ ناول بھجوا دیں۔ کہانی سے زیادہ اہم یہ ہوتا ہے کہ اسے لکھا کیسے گیا ہے۔ اگر آپ نے اچھے انداز میں کہانی لکھی ہے تو ضرور شائع ہو گی۔

سلمیٰ مسرت......راولپنڈی

جنوری میں میرا 24 سال کا بھانجا سوفٹ ویئر انجینئر چار دن پہلے اس کی منگنی کی تھی میری بہن نے بارہ سال بیوگی کے دو سال کینسر جیسے مرض پر صبر کیا اب بھی انتہا درجے کا صبر کیا، اللہ نے چن کر علی کی شکل میں ہیرا دیا تھا اور 25 جنوری کو یہ امانت واپس لے لی۔

اب شکوہ نہیں صرف دکھ ہے کہ جس ساتھی (شعاع خواتین) کو 35 سال دیئے بلکہ 40 سال کا عرصہ بنتا ہے 15 سال کی عمر سے باقاعدگی سے ان کو پڑھ رہی ہوں۔

اب سروے میں تو شریک ہونے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا، اتنی بار لکھ لکھ کر مجھے سوائے اگنور کرنے کے کچھ نہ ملا میں نے افسانے تو نہیں بھیجے نہ کبھی آپ کو تنگ کیا کیا میری تحریر اتنی بری ہے کہ میں سروے میں بھی شریک نہیں ہو سکتی۔

مریم عزیز کے ناول سے اب اس ویسا ہی انس ہو گیا ہے ورنہ پہلے کرداروں کی سمجھ نہیں آ رہی تھی نگہت کا ماء الملوک زبردست ہے۔

باقی سارے سلسلے زبردست جا رہے ہیں ناولوں افسانوں پر ناہید اسماعیل، صدف ناصر، فرخندہ زرینہ لغاری صائمہ گل سب کا ریگولر تبصرہ بہت شاندار ہوتا ہے۔

میں نے تو سوچا تھا کہ سروے کے سوالات میں آپ کی رہنمائی کروں گی کیونکہ قرآن کی تفسیر کے دوران مسلسل پندرہ سال سوال بنانے میں میرا تجربہ ہے باقی قارئین بھی آپ کی رہنمائی کر سکتی ہیں۔

تجھ سے ناتا جوڑا میں بہت ورائٹی ہے یہ ایسے ہی چلنے دیں البتہ باقی رشتوں مثلاً ساسوں کا اور نندوں کا تجربہ بھی شامل کریں۔

''ماء الملوک'' کے بارے میں صدف نے جو تبصرہ کیا بالکل درست ہے کہ سب کے معاملات ابھی ادھورے ہیں اس لیے آخری قسط کیسے ہو سکتی ہے۔

چاندی کے گھر میں مریم آخر میں نیک زندگی گزارنا چاہتی تھی اس کے بچے کے ساتھ اسے بھی زندگی مل جاتی تو کیا بات تھی۔

مئی کے شمارے میں ماہی والا افسانہ بالکل میرے حسب حال ہے بلکہ بہت ساری بہنوں کو اس میں اپنی جھلک نظر آئی ہو گی کہ شادی سے پہلے انسان کیا ہوتا ہے اور بعد میں کیا ہو جاتا ہے نئی رائٹرز بھی بہت محنت کر رہی ہیں اور آپ نے جہاں اتنے ہیرے تراشے ہیں ان میں سے بھی بہت ہیرے دریافت ہوں گے۔

ج: پیاری مسرت! آپ کی ناراضی بجا ہے۔ اتنی مصروف زندگی میں وقت نکال کر خط لکھیں اور وہ شائع نہ ہو تو غصہ بھی آتا ہے اور رنج بھی ہوتا ہے، خواہ مخواہ وقت ضائع کیا۔ آپ کے خط ہمیں ملے ہی نہیں۔

عزیز بہن خط میں پوتے، پوتیوں کے متعلق جو لکھا ہے وہ پڑھا نہیں گیا۔ اگلے خط میں دوبارہ لکھ دیجیے گا۔ اس بار سروے میں ضرور شرکت کریں۔ پہلے نمبر پہ آپ کا سروے ہو گا۔ سوالات بھی بھجوا دیں۔

آپ کی بہن کا پڑھ کر دل کانپ گیا۔ بیوگی کا دکھ، کینسر جیسی موذی بیماری اور یہ پہاڑ جیسا دکھ ذہین ہونہار جوان بیٹے کی موت کا صدمہ سہنا آسان نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور بہن کو دونوں جہان میں اس صبر کے اجر سے نوازے۔ آمین

بشریٰ شاہد نے ملتان سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

شازیہ الطاف ہاشمی موسٹ فیورٹ رائٹر شکر ان کا نام نظر آ گیا اور شکر تو اس بات کا بھی ادا کیا کہ نگہت صاحبہ نے باقی آئندہ کے بجائے آخری قسط آئندہ ماہ کی شکل دکھائی۔

دھوپ دریچہ مریم عزیز کا ابھی سلو موشن ہے سو تبصرہ

کیا کرنا۔ قانتہ رابعہ بھی بہت اچھا اور واقعی میں سبق آموز لکھتی ہیں۔

ج: پیاری بشریٰ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ آپ کا افسانہ لگ جائے گا۔

میشے علی خان...... خانیوال

سچ بات تو یہ ہے کہ جب سے شمارے ادارہ سے منگوانے شروع کیے ہیں تب سے ہی مزہ آنے لگا ہے پڑھنے کا اور تبصرہ کرنے کا۔ پہلی شعاع پڑھ کر بے اختیار امت مسلمہ کے اتحاد کی دعا کی۔

پیارے نبی کی پیاری باتوں سے فیض حاصل کیا۔ عید کے رنگ کے جوابات سب بہنوں کے پسند آئے زرینہ خانم سے گزارش ہے زرینہ! سویوں کا زردہ مجھے بھی کھانا ہے ہم پنجابی تو بہت سادہ سا کھانا کھاتے ہیں مظفر گڑھ بہت دور بھی نہیں خانیوال سے تو پلیز ایک پلیٹ میرے لیے بھی (اب دل کر رہا یہاں ایموجی ہوتا منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے والا۔

مریم عزیز کی کہانی سبک خرام ندی کی طرح آگے بڑھ رہی ہے۔ ''ماء الملوک'' زبردست ناول۔ لگ تو یہ رہا ہے کہ شینو بابا ہی زینب کے شہزادے ہیں اور اگر میرا اندازہ غلط نہیں (جو کہ پہلے بھی نہیں ہوا تھا) تو شہزادہ اپنے سگے رشتوں میں ہی موجود ہے۔ امت العزیز نام ہی کافی ہے بلاشبہ بہترین تحریر۔ چاندی کے گھر اچھی کاوش گو کہ موضوع بھی پرانا تھا اور انجام کا بھی اندازہ ہو رہا ہے۔

ج: پیاری میشے! یہ کس نے کہا ہے کہ آپ کی لکھائی خراب ہے۔ آپ کی لکھائی تو بہت اچھی ہے۔ آپ نے سطر چھوڑ کر صفحہ کے ایک جانب لکھا ہے۔ اور بہت اچھا لکھا ہے۔ اب محفل میں باقاعدگی سے شرکت کیجیے گا۔

عائشہ عامر نے کراچی سے لکھا ہے

السلام علیکم! جون کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی میں سب سے پہلے عیدالاضحیٰ کے سروے کی جانب بڑھی ایک نام پر میں رک گئی نام کچھ یوں تھا عائشہ علی (کراچی) میں نے سوچا وہ بھی عائشہ وہ بھی کراچی سے واہ۔ پر سروے پڑھ کر دل ٹوٹ گیا کیونکہ وہ عائشہ کوئی اور نہیں بلکہ میں ہی تھی اور چھپائی میں شاید غلطی کی وجہ سے میرے والد محترم کے نام بجائے پتا نہیں کس کے والد کا نام لگ گیا اور اس کی وجہ سے سروے کی خوشی بھی ماند پڑ گئی۔

ج: پیاری عائشہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ نے اتنی محنت سے سروے کے جواب لکھے اور ہم نے شائع کیے لیکن ذرا سی غلطی کی وجہ سے آپ کی خوشی ماند پڑ گئی ،اس کی تلافی ہم اس طرح کر سکتے ہیں کہ آپ شعاع کے سالگرہ نمبر کے سروے میں شرکت کریں ہم آپ کے جواب شائع کریں گے۔

اسماء بانو نے راولپنڈی سے لکھا ہے

آج سے ٹھیک 20دن پہلے میں اکتوبر 2024 کے شمارے میں تھی آج صبح میں نے مئی 2025 پڑھا۔ تمام ہی شمارے بہت اچھے تھے سارا دھیان تو خطوط میں اٹکا رہا۔ خاص طور پر وہ جن میں بہنوں نے اپنی کسی تحریر کی بابت پوچھا ہے معلوم نہیں کون کون میری طرح بے چین ہوگا۔

ج: ! ۔ اسماء بہن آپ کی تحریر ابھی پڑھی نہیں گئی۔

فاطمہ بنت ابراہیم نے کراچی سے لکھا ہے

چاند کی عید'' افشاں آفریدی کو دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کا ناول اپنے مخصوص انداز میں لکھا ہوا بہت پسند آیا'' چاندی کے گھر'' کا آخری حصہ بہت اچھے طریقے سے اپنے اختتام کو پہنچا، تمام افسانے اپنے اندر سبق لیے ہوئے تھے، بالخصوص، کہکشاں جگمگ، قانتہ جی نام ہی کافی ہے۔

ج: پیاری فاطمہ! آپ تینوں رسالے دو تین دن میں پڑھ لیتی ہیں۔ ماشاء اللہ بہت زبردست اسپیڈ ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

زل مزمل گجر لاہور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

کل ہی کی تو بات ہے جب نیا سال شروع ہوا تھا اور اب جون بھی وسط کو پیچھے چھوڑتے ہوئے اختتام کی جانب گامزن ہے۔ گزرتا وقت زندگی کی کمی کا احساس دلاتا ہے مگر اب ہم پر وقت تو کیا حالات بھی اثر کرنا چھوڑ گئے ہیں۔

''شفا'' عیشہ حسین آئیں اور چھا گئیں۔ باقی بہنوں کی طرح مجھے بھی کہانی کا انداز بیاں مالا کی طرح لگا۔ لیکن

کہانی نے شروع سے لے کر اینڈ تک اپنی گرفت میں جکڑے رکھا۔

راشدہ رفعت نے محبت کو معتبر ٹھہرایا۔ مزے کے پلاٹ کے ساتھ مزے کا ناول تھا۔

افسانے سب ہی اچھے تھے۔ دھوپ دریچہ بھی اچھا اضافہ ہے۔ خط لکھنے کی اصل وجہ اپنا افسانہ اور غزل پہنچانی تھی۔ ج: زمل! آپ کا افسانہ موصول نہیں ہوا، کیا آپ نے ای میل کیا ہے۔ غزل کے لیے معذرت۔

نصرت جبیں ملک خوشاب سے شریک محفل ہیں

پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں میں قربانی کی اہمیت و فضیلت اور احکامات کے بارے میں تفصیل سے جاننے کا موقع ملا۔

صوفیہ بٹ سے ملاقات بہت اچھی رہی، اس ملاقات میں مجھے ان کی شخصیت کی انکساری بہت پسند آئی۔ عید کے سروے میں سب سے اوپر اپنا نام دیکھ کر اتنا بڑا اعزاز ملا کہ میرے لیے یہ عید کا سرپرائز گفٹ ہو گیا۔

"خط آپ کے" میں پیاری رضوانہ وقاص کے لیے پیغام ہے کہ فکر نہ کریں۔ شوہر ایسے ہی دوسری شادی کی دھمکیاں دیتے رہتے ہیں مگر انہیں خبر ہوتی ہے کہ ایک طوفان کو سنبھالنا مشکل ہے دو اکٹھے ہو گئے تو اڑا کر کسی جھاڑی میں جا پھینکیں گے سو گھبرانا نہیں ہے، وہ آخر کار اپنی خیر ہی چاہیں گے۔

چاند کی عید افشاں آفریدی کی ایک بڑی فیملی پر لکھی گئی ہلکی پھلکی تحریر تھی مریم عزیز کا ناول "دھوپ دریچہ" قاری کو اپنی جانب واقعی متوجہ کرتا ہے گوشت کے پکوان میں اس مرتبہ پشاوری دم کباب بازی لے گئے۔

ج: پیاری نصرت! آپ کے افسانے ابھی پڑھے نہیں گئے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

خدیجہ نے میانوالی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

میری بہن کرن اور میرا بھائی ارسلان آپ کے پرچے بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔

پہلی شعاع پڑھی۔ عید کے رنگ بہت اچھے تھے۔ سارے افسانے پسند آئے۔ احد رضا میر کا انٹرویو بھی اچھا لگا۔

ماء الملوک کی آخری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔

ج: پیاری خدیجہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید۔ کرن اور ارسلان! آپ کو شعاع پسند آیا بہت شکریہ۔ خصوصاً ارسلان کا جو اتنی دور سے رسالے آپ کے لے کر آتے ہیں۔

بینش مریم نے لکھا ہے

میں آپ کے پرچوں میں لکھنا چاہتی ہوں میں پچھلے اٹھارہ بیس سالوں سے ٹیچنگ کے شعبہ سے وابستہ ہوں۔ شاعری بھی کرتی ہوں۔

ج: پیاری بینش آپ لکھنا چاہتی ہیں ضرور لکھیے آپ کو کس نے روکا ہے۔ آپ ایک سطر چھوڑ کر لکھیے اور درج ذیل ایڈریس پر بذریعہ ارجنٹ میل سروس پوسٹ کر دیجیے۔ خواتین ڈائجسٹ 37۔ اردو بازار کراچی۔

رضوانہ وقاص...... کرلاں ہری پور

ماڈل نے اتنی گرمی میں بال کھول رکھے ہیں۔ آنکھوں میں اداسی لیے۔ "پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں" بہت اچھی ہوتی ہیں۔

"ناتا جوڑا" م۔ش کا پڑھا۔ بچوں کے لیے آپ نے اتنا کچھ کیا لیکن بچوں کو آپ کی قدر نہیں ہوئی اس بات پر دل دکھی ہو گیا آپ کے لیے۔

احد رضا سے ملاقات اچھی رہی۔ "عید الاضحیٰ کے رنگ" سب کا پڑھا۔ قانتہ رابعہ کیا بات ہے۔ آپ کی بہت اچھا لکھتی ہیں۔ آپ کو حج کی بہت بہت مبارک ہو۔ "گل بہار کی عید" شکر ہے گل ناراض ہی ہوا اب تو ذرا ذرا سی بات پر گھر خراب ہو رہے ہیں۔ "قربانی سے پہلے قربانی" بچوں نے اپنے بڑوں کو صحیح آئینہ دکھایا۔ وہ راضی ہو گئے۔ مریم طاہر آپ نے بہت اچھا لکھا۔ "چاندی کے گھر" ماہم کا پڑھ کر دل ضرور اس کے لیے رنجیدہ ہوا لیکن جیسے وہ اپنے ماموں کے گھر رہ رہی تھی۔ وہ ٹھیک تھا، نازنین فردوس کا کیا بنے گا شیبا کا پڑھتے ساتھ ہنستی رہی۔ پسندیدہ ناول "ماء الملوک" پڑھا مجھے زین جتنا اچھا

بقیہ صفحہ نمبر 200 پر

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2025ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- "رت وصال کی" عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول،
- "چاہتوں کی بساط پر" فرح بھٹو کا مکمل ناول،
- "پردیس" سمیرا حمید کا مکمل ناول،
- "مالا" نمرہ احمد کا مکمل ناول،
- "کر چلے جاں نثار ہم" سلیقہ عمیر کا ناول،
- راشدہ رفعت اور بشریٰ احمد کا ناولٹ،
- حرا رفاقت، حمیرا شفیع، رخسار احمد، شازیہ الطاف ہاشمی، ریحانہ وقاص، انمول دعا عقیل، انیقہ عائش اور حنا بشریٰ کے افسانے،
- ابھرتی ہوئی مصنفہ "ثمین صداقت" سے ملاقات،
- "ماہ نور شیخ" سے باتیں،
- "سائرہ رضا" کی یاد میں،
- ہمارے نام، آپ کے خط، ہمارے جواب،
- نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی 2025 کا شمارہ آج ہی خریدلیں

مریم عزیز

دھوپ دریچہ

لاہور کے ایک بڑے بزنس مین غلام عباس کی خوب صورت بیٹی یونی ورسٹی میں پڑھتی ہے جہاں ایک لڑکا ثاقب اس میں دلچسپی لیتا ہے ہالہ اسے نظرانداز کرتی ہے۔ غلام عباس کا بڑا بیٹا حارث بزنس میں باپ کا ہاتھ بٹاتا ہے۔ اس کی ناہید خالہ جو لاہور کے پسماندہ علاقے میں رہتی ہیں اپنی ماں کے کہنے پر ان کی دیکھ بھال کرتا رہتا ہے، ان کی بڑی بیٹی کومل حارث کے خواب دیکھتی ہے جبکہ حارث کی منگنی بچپن ہی میں اپنے مرحوم چچا ایاز کی بیٹی زیمل سے ہو چکی ہے۔ زیمل کی ماں فرحانہ کی شادی اس کے لالچی بھائی وحید نے عبدالقدوس سے کر دی تھی زیمل اپنے ماموں کے پاس رہتی تھی اس کے ماموں ممانی اس کی شادی پیسوں کے لالچ میں کسی غنڈے سے کرانا چاہتے تھے۔

بیرون ملک سے آئی شاہانہ اپنی بھتیجی زیمل کو غلام عباس کے گھر لے آتی ہیں۔ ضامن اور فرقان

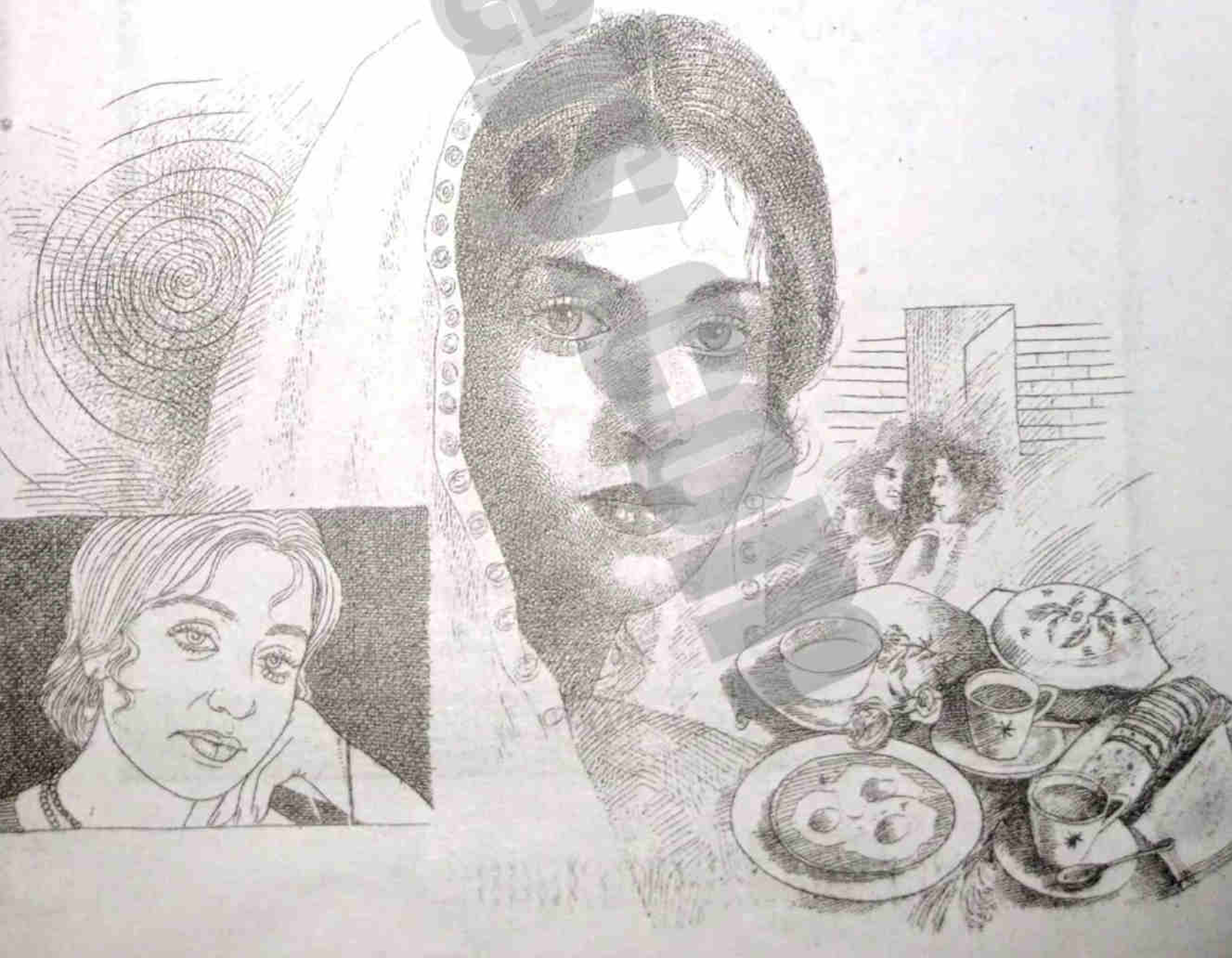

گہرے دوست ہیں ضامن کا باپ ہاشم اپنی بیوی شاہینہ سے رہتے ہیں جن کی کئی بہنیں کینیڈا میں رہتی ہیں۔
ضامن کی دوست علیزہ اس سے شادی کی خواہش مند ہے ایک فنکشن میں وہ ڈرنک کرتی ہے ضامن اس سے ناراض ہوتا ہے اور وہ معافی مانگتی ہے۔
کومل زیمل کے آنے پر خوف زدہ ہے وہ ہر حال میں حارث کو پانا چاہتی ہے اس کے لیے وہ نیند کی گولیاں کھالیتی ہے، مجبوراً حارث اس کو شادی کے لیے اپنا پہلا آپشن بتاتا ہے۔
عالیہ حارث کو زیمل کے خلاف بھڑکاتی ہے۔
علیزہ کا کزن سمیر پاکستان سے امریکا جاتا ہے اسے علیزہ پسند آجاتی ہے۔ جو اس کی ماں کی بھی پسند ہے۔
یونی ورسٹی کے چیریٹی فنکشن میں فائن آرٹس کا پاسٹ لڑکا ثاقب کا ہاتھ دیکھ کر سچ بتاتا ہے۔ جسے ثاقب جھوٹ قرار دیتا ہے جبکہ ہالہ کو کسی سازش کا شکار بتاتا ہے۔
ضامن کی پھوپھو اور ان کا بیٹا اسد امریکہ جاتے ہیں پھوپھو کو کینسر ہے اور وہ اپنے بھائی سے چھپاتی ہیں لیکن ضامن اسد سے اگلوالیتا ہے۔ زیمل کے ماموں وحید کے گھر اس کا نام نہاد منگیتر سردار اپنے غنڈوں کے ہمراہ زیمل کی تلاش میں آتا ہے۔

آٹھویں قسط

''نہیں اس نے کیا کہنا ہے۔ لیکن اسے کپڑوں کی ضرورت ہوگی نا۔ ابھی موسم زیادہ سرد نہیں۔ لیکن کالج میں اسے سویٹر، چادر شوز کی ضرورت ہوگی اور گھر کے لیے بھی کپڑے اور سلیپر لے لینا۔'' ان کی فرمائشوں پر ہالہ نے آنکھیں سکیڑ کر انہیں دیکھا۔

''اماں! آپ کو زیمل مجھ سے زیادہ پیاری ہوگئی ہے نا۔'' اس کی جیلسی پر نفیسہ ہنس پڑی تھیں۔

''تم سے زیادہ مجھے کوئی پیارا ہوسکتا ہے بھلا۔'' ان کے کہنے پر وہ ان کے قریب کھسک کر آئی اور سر ان کے گھٹنوں پر رکھ دیا تو وہ پیار سے اس کے گھنے بالوں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔

''یہ تو تمہارا گھر ہے نا ہالہ، تمہارے ماں باپ، تمہارے بھائی، تم مان سے کہہ سکتی ہو، فرمائش کرسکتی ہو، بے شک یہ اس کا بھی گھر ہے لیکن اس کو یہاں چند ماہ ہوئے ہیں اور میں نے دیکھا ہے وہ بہت صابر بچی ہے۔ کبھی اس نے کوئی فرمائش نہیں کی اور نہ کسی چیز کو حرص اور حسد سے دیکھا ہے۔ وہ ابھی تک وہی کپڑے پہن رہی ہے جو شاہانہ نے اسے لے کر دیئے تھے۔ اس دن تم لوگ شاپنگ کرنے گئے تھے تو زیمل کی کیوں نہیں کی۔'' ان کے پوچھنے پر ہالہ نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا۔

''اماں، میں نے اور حماد نے بہت کہا لیکن اس نے کچھ نہیں لیا، کہا کہ اس کے پاس کافی کپڑے ہیں۔ اور کچھ دن پہلے بھی میں نے اسے کتنا زور لگایا میرے ساتھ چلے لیکن نہیں وہی ایک ہی رٹ ضرورت نہیں۔''

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں پتا نہیں کیا بات ہے جو وہ اتنا جھجکتی ہے۔ لیکن اگر وہ کچھ نہیں کہے گی تو کیا ہمارا فرض نہیں اس کی ضرورتوں کا خیال رکھنا۔ ہوں۔'' ہالہ نے پرسوچ انداز میں سر ہلایا۔

''میں نے کچن کی کچھ چیزوں کی لسٹ بنائی ہے وہ لانی ہیں، اپنے اور زیمل کے لیے کچھ ریڈی میڈ کپڑے لے لینا، باہر آنے جانے کے لیے، زیمل کے لیے مائی لائٹ لینا، میرا خیال ہے اسے وہ برینڈ پسند ہے۔''

''آپ کو کیسے پتا۔'' ہالہ نے شرارتی انداز میں ماں کو دیکھا۔

''کیونکہ اس کے زیادہ تر کپڑے اسی برینڈ کے ہیں۔''

"وہ اس لیے میری بھولی اماں کیونکہ پھوپھو کو وہ برینڈ پسند ہے اور زیمل کی ساری شاپنگ پھوپھو نے کی تھی۔ میں کوشش کرتی ہوں زیمل کو ساتھ لے جاؤں اگر وہ نہ مانی تو میں اپنی مرضی سے اس کے لیے خرید لوں گی ویسے بھی اس پر ہر رنگ اچھا لگے گا۔" وہ کپڑے جھاڑتی ہوئی کھڑی ہوگئی۔

☆☆☆

دروازہ کھلنے کی آواز پر انہوں نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور دروازے کے درمیان کھڑے حماد کو دیکھ کر مسکرا دیں۔ وہ چلتا ہوا ان کے بیڈ کے قریب آ کر رکا اور ہتھیلی سے ان کے ماتھے کو چھوا۔

"بخار کب ہوا آپ کو۔" وہ بھنویں سکیڑے انہیں دیکھ رہا تھا جو بازو پر زور دیتی اب اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"بخار نہیں ہے، ویسے ہی جسم گرم ہے۔"

"واہ کیا فلسفہ ہے جسم ویسے ہی گرم ہے۔" حماد نے ہاتھ نچا کر کہا۔ تبھی نفیسہ اندر داخل ہوئیں۔

"بوا کی طبیعت اتنی خراب ہے اور آپ لوگوں نے انہیں یہاں اکیلا چھوڑا ہوا ہے۔"

"ارے اولڑکے، زیادہ جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ ہالہ اور زیمل ابھی میرے پاس تھیں، ہالہ سوپ بنانے گئی ہے اور زیمل میرے کپڑے استری کرنے گئی ہے۔ اور اکیلی کا کیا مطلب ہے میں کوئی ننھی کا کی ہوں جو اکیلے ڈر جاؤں گی۔" انوری بوا کی کلاس لینے پر نفیسہ کی ہنسی نکل گئی جبکہ حماد کا منہ بن گیا۔

"بھلائی کا کوئی زمانہ ہی نہیں ایک تو آپ کی فکر کر رہا ہوں اوپر سے مجھے ہی سنا رہی ہیں۔" وہ اسی طرح منہ بسورے ان کے ساتھ جڑ کر بیٹھ گیا۔

"ارے پیچھے ہو کر بیٹھو، زکام ہے مجھے تمہیں بھی لگ جائے گا۔"

"آپ کی طرح اتنا نازک نہیں ذرا ہوا لگی اور بخار۔" انوری بوا نے ایک دھپ اس کے کندھے پر لگائی۔

"تجھ سے زیادہ سخت جان ہے میری، اب تھوڑی بوڑھی ہو رہی ہوں تو یہ موسم اثر کرنے لگے ہیں ورنہ میں سردیوں میں ٹھنڈے پانی سے نہا لیتی تھی۔"

"واہ۔" حماد نے جیسے اس بہادری پر انہیں داد دی۔

"انوری، اب تیار ہو جاؤ ڈاکٹر سے ٹائم لے لیا ہے میں نے......" زیمل کو اندر آتے دیکھ کر انہوں نے انوری سے کہا تو انوری نے بدک کر انہیں دیکھا۔

"میں پاگل نہیں جو ان ڈاکٹروں کے ہتھے چڑھوں۔ یہ اتنی موٹی موٹی سوئیاں بازو میں گھسا دیں گے اور کڑوی گولیاں دے کر منہ کا ذائقہ الگ خراب کر دیں گے۔" وہ برے برے منہ بناتی بولیں، زیمل سائیڈ پر کھڑی مسکرا رہی تھی ان کی یہی باتیں تو وہ مس کر رہی تھی۔ وہ اس گھر کی رونق تھیں۔

"تو اس کا کیا مطلب ہے وہ آپ کو چاکلیٹ دیں۔" حماد کی زبان میں پھر کھجلی ہوئی تھی۔

"بوا۔ انھیں ایسے آرام نہیں آتا اور میں نے اماں کو کہہ دیا ہے کہ وہ ڈاکٹر کو منع کر دیں کہ میری بوا کو کوئی سوئی نہیں لگانی۔" ہالہ نے اندر آتے ہوئے، کہا وہ جانتی تھی بوا کو انجکشن سے ڈر لگتا ہے اسی لیے وہ کل سے ڈاکٹر کے پاس جانے سے آنا کانی کر رہی تھیں، ہالہ کے کہنے پر وہ نیم رضامند نظر آئیں لیکن پھر بغور اپنی سہیلی کا چہرہ دیکھا۔

"اپنی ماں کو سمجھا دو وہاں جا کر اگر مجھ سے غداری کی تو میں وہیں سے بھاگ جاؤں گی۔"

"ہاں بھاگ جانا، جب بھاگنے کی عمر تھی تب تو بھاگی نہیں۔" نفیسہ نے افسوس سے سر جھٹکتے ہوئے کہا۔

"اب چلو اٹھو ابھی حارث آ گیا تو مزید لیکچر شروع ہو جائے گا۔"

"اس سے تو برداشت نہیں ہوتا میں دو دن آرام کر لوں۔" انوری بوا پیروں میں سلیپر پہنتی بڑبڑاتی ہوئی

اٹھیں۔
"ٹھیک کہہ رہی ہیں بوا۔ اماں جلتی ہیں آپ سے، سارے گھر میں رونق آپ کی وجہ سے ہے، جب آپ مدھو بالا والی مسکان لے کر چلتی ہیں سارا گھر جگمگ کرنے لگتا ہے، اس دن میرا دوست جمشید پوچھ رہا تھا، تمہاری بوا کا شادی کا کوئی ارادہ ہے۔ میں نے تو اس کو ایسی سنائیں کہ یاد رکھے گا۔ میری اتنی خوب صورت بوا پر نظر رکھ کر بیٹھا تھا، مدھو بالا کو تو دلیپ کمار نہ پاسکا تھا تو اس کا گنجا چچا کیا چیز ہے۔" زیمل حیرانی سے حماد کو دیکھ رہی تھی جو بہت سنجیدگی سے بوا کا رشتہ کروا رہا تھا۔
"انکار کرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیتا کیا پتا میرا جوڑی دار ہوتا۔" آگے بھی انوری بوا تھیں وہ کیا حماد سے کم تھیں۔
"جوڑی دار بوا۔ آپ کا پاسنگ بھی نہیں اس کا چچا۔" حماد کی بات پر نفیسہ نے افسوس سے سر ہلایا۔ وہ دونوں شروع ہو چکے تھے۔
"انوری، اللہ کا واسطہ ہے تیار ہو جاؤ اور دونوں ماں بیٹا آ کر رشتہ دفتر کھول لینا۔ مجھے آ کر کھانا بھی بنانا ہے۔"
"ہاں بوا ابھی جائیں آپ پھر تفصیل سے بات کرتے ہیں۔" زیمل نے مسکرا کر بوا کو دیکھا جنہوں نے حماد کو کچھ اشارہ کیا تو جواباً حماد نے بھی انہیں اشارہ کیا اور دونوں ہنس دیئے۔ زیمل نے ہمیشہ کی طرح اشارے سمجھنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی۔ لیکن ہمیشہ کی طرح امید قوی تھی کہ وہ بھی سیکھ ہی جائے گی ان لوگوں کی زبان۔ کیونکہ اب وہ بھی ان کا حصہ تھی۔

☆☆☆

آنکھوں پر سن گلاسز لگائے وہ سامنے کھلے گیٹ سے نظر آتی سڑک کو دیکھ رہا تھا جبکہ انگلیاں میوزک کے ساتھ اسٹیئرنگ پر تھرک رہی تھیں، کار کا دروازہ کھلنے پر اس نے گردن گھمائی اور اس کے بیٹھنے پر دوبارہ میوزک پر سر دھننے لگا۔ اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر ہالہ نے ابرو اچکا کر سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
"اب چلو گے یا تمہارے لیے بینڈ باجوں کا انتظام کرنا پڑے گا۔" حماد نے نظر لکڑی کے منقش دروازے پر ڈالی جو بند تھا۔
"زیمل کہاں ہے۔"
"وہ نہیں جارہی۔" ہالہ نے منہ بنا کر کہا۔
"کیوں۔"
"تمہیں پتا تو ہے وہ کب جاتی ہے۔ زبردستی کرنی پڑتی ہے اس کے ساتھ۔"
"میں لے کر آتا ہوں اسے۔" اس سے پہلے حماد نکلتا ہالہ نے اس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے روک دیا۔
"وہ شاید ابھی یوز ٹو نہیں ہوئی یہاں کے ماحول سے، اسی لیے کمفرٹیبل فیل نہیں کرتی۔ اب اگر زبردستی کرنے پر وہ آ بھی گئی تو فائدہ نہیں، مقصد تو انجوائے کرنا ہے جو وہ نہیں کرے گی اور دوسرا اماں نے اپنا کارڈ دیا ہے، شاپنگ کے لیے، خاص زیمل کی شاپنگ کے لیے۔" ہالہ کے کہنے پر حماد نے شرارت سے آنکھیں گھمائیں۔
"تمہیں یاد ہے نا پچھلی دفعہ ہمارے اتنے اصرار پر بھی اس نے کچھ نہیں لیا تھا جبکہ بھائی نے ہمیں فری لمٹ دی تھی۔" ہالہ کے کہنے پر حماد نے سر ہلایا اور گاڑی اسٹارٹ کر دی۔
"پر زیمل کو یہ عادت بدلنی ہوگی اس طرح تو اس میں بالکل کانفیڈنس نہیں آئے گا۔ اگر وہ یوں لوگوں کو

آوائیڈ کرے گی۔'' حماد کے کہنے پر ہالہ نے سر ہلایا۔

''بالکل میں نے اکثر محسوس کیا ہے وہ کالج جانے سے بھی گھبراتی ہے۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر وہ ڈر جاتی ہے، پتا نہیں اپنے ماضی میں اس نے کیا کچھ فیس کیا ہے؟'' ہالہ افسردگی سے بولی تو حماد کے ماتھے پر آنے والی شکنیں بے ساختہ تھیں۔

''لیکن اب ہم اس کے ساتھ ہیں۔'' حماد کے کہنے پر ہالہ نے سر ہلایا۔

''اور حارث بھائی کے ساتھ زندگی گزارنے کے لیے تو اسے بہادر بننا ہوگا۔ وہ تو آنکھیں نکال کر ہونٹ بھینچ کر ایسی شکل بناتے ہیں کہ اگلے بندے کا آدھا دم تو وہیں نکل جاتا ہے اور اس معصوم لڑکی کا تو ہارٹ فیل ہی ہو جائے گا۔'' حماد کے کہنے پر ہالہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''اسے بھی شاید اندازہ ہو گیا ہے اسی لیے حارث بھائی کے آتے ہی وہ غائب ہو جاتی ہے۔'' ہالہ نے جیسے اس کی کیفیت یاد کر کے مزہ لیا۔

''پر مائی ڈیئر بکرے کی ماں آخر کب تک خیر منائے گی آخر کار اس منمناتی بکری کو اسی شیر کی کچھار میں جانا ہے۔'' حماد کے کہنے پر ان دونوں کا قہقہہ گاڑی میں گونجا تھا۔

☆☆☆

جوں جوں فون کی بیل جا رہی تھی۔ ویسے ویسے اس کا بی پی ہائی ہو رہا تھا۔ اس نے فون بند کر دیا اور ایک نظر آئینے میں اپنے مہکتے روپ پر ڈالی اور مٹھی بھینچ کر نمبر ری ڈائل کیا۔ اب وہ فون کان سے لگائے کمرے میں چکر لگا رہی تھی۔ پانچ بیلوں کے بعد فون ریسیو ہوا اور رضا کی آواز آئی۔

''کہاں ہیں آپ۔'' رضا کی ہیلو کے جواب میں وہ غصے سے بولی۔

''آفس میں ہوں۔'' ان کی دھیمی آواز سنائی دی۔

''آپ کو صبح بھی یاد دلایا تھا مجھے شاپنگ کے لیے جانا ہے، ایک گھنٹے سے انتظار کر رہی ہوں نہ آپ آئے ہیں اور نہ ہی فون اٹھا رہے ہیں۔''

''یار، مجبوری ہے مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ آج ایک کلائنٹ سے میٹنگ تھی آفس آ کر یاد آیا۔ اب اس کے ساتھ مصروف ہوں ٹائم لگے گا۔''

''میں کچھ نہیں جانتی رضا، مجھے شاپنگ پر جانا ہے۔'' اس کے ضدی انداز پر رضا نے گہرا سانس لیا۔

''ہنی ایک دن ویٹ کر لو کل میں خود لے جاؤں گا۔'' وہ نرمی سے بولے۔

''نہیں مجھے آج ہی جانا ہے، نہیں آسکتے تو نہ آئیں، ڈرائیور کو بھیج دیں۔''

''ڈرائیور نہیں ہے۔ اس کے گھر کوئی ایمرجنسی ہو گئی تھی اسے اپنی بیوی کو لے کر اسپتال جانا تھا تو میں نے ہی اس سے کہا تھا وہ میری گاڑی لے جائے۔'' ان کی بات سن کر عشنا کا غصہ مزید بڑھا تھا۔

''آپ کے نزدیک ہر انسان کی ویلیو ہے ڈرائیور تک مجھ سے زیادہ اہم ہے۔ اپنی گاڑی ہونے کے باوجود میں یہاں بیٹھی گاڑی کے انتظار میں سڑ رہی ہوں اور وہ نوکر ہو کر اپنی بیوی کو کار کی سیریں کروا رہا ہے۔''

''عشنا۔'' رضا صاحب نے بڑی مشکل سے اپنا لہجہ دھیما رکھا تھا۔

''حمید ہمارا بہت پرانا ڈرائیور ہے، میں نے اسے کبھی نوکر نہیں سمجھا......اور وہ اپنی بیوی کو سیریں نہیں کروا رہا، مجبوری میں میری کار لے کر گیا ہے اور وہ بھی میرے زور دینے پر۔'' اب ان کا لہجہ سخت ہو گیا تھا، عشنا نے ہونٹ بھینچ کر خود کو کچھ کہنے سے روکا۔ اس کی مسلسل خاموشی پر رضا صاحب نے اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے اضطرابی انداز میں پہلو بدلا۔ وہ جانتے تھے ان کی بیوی غصے میں ہے اور خاموشی کا مطلب ناراضی اور اس کی ناراضی وہ

افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ کیونکہ اس کو منانے کے چکر میں اکثر ان کے اکاؤنٹ سے بھاری رقم جاتی تھی۔

''اچھا میری جان، تم دل چھوٹا نہ کرو۔ تم نے شاپنگ کرنی ہے تو ٹھیک ہے، میں فائزہ سے کہتا ہوں وہ تمہیں لے جائے گی۔'' وہ جو سوچ رہی تھی کیسے اپنی ناراضی ظاہر کرے، رضا صاحب کی بات پر چونکی۔

''فائزہ۔'' اس نے ناک چڑھا کر اس کا نام لیا'' لے ہی نہ جائے مجھے۔'' وہ طنزیہ بولی۔

''ایسے کیوں کہہ رہی ہو اس کو کیا پرابلم ہو سکتی ہے۔''

''پرابلم تو خیر بہت ہے اسے مجھ سے لیکن...... خیر آپ اس سے بات کر کے دیکھ لیں۔'' اس نے مسکرا کر آئینے میں دیکھا اور فون بند کر دیا۔ وہ جانتی تھی فائزہ اسے پسند نہیں کرتی اور وہ ضرور انکار کرے گی اور اس انکار کا بتنگڑ کیسے بنانا ہے وہ اچھی طرح جانتی تھی۔

☆☆☆

چائے پیتے ہوئے وہ موبائل پر واٹس ایپ پر آئے ہوئے میسجز بھی پڑھ رہی تھی سب سے زیادہ بونگے میسجز ثانیہ کی طرف سے آئے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اس کے میسجز پڑھ رہی تھی جب اچانک اس کے موبائل پر رضا صاحب کی کال آنے لگی۔ اس نے حیران ہوتے ان کی کال اٹینڈ کی۔

''السلام علیکم پاپا۔''

''جیتی رہو اٹھ گئی تھیں یا میں نے نیند خراب کر دی تمہاری۔'' ان کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''پاپا مذاق اڑا رہے ہیں میرا۔''

''ارے میری ایسی مجال۔'' وہ شرارت سے بولے۔

''میں جلدی اٹھ جاتی ہوں وہ تو یونیورسٹی سے چھٹیاں ہیں تو اس لیے دیر ہو جاتی ہے۔''

''اچھا بابا حساب کون مانگ رہا ہے میری گڑیا، جب چاہے جو چاہے کر سکتی ہے۔'' ان کی بات پر وہ مان سے مسکرائی تھی۔

''ابھی فری ہو۔''

''جی پاپا۔''

''تو بیٹا تم سے تھوڑی فیور چاہیے تھی۔''

''حکم کریں سر۔'' وہ مذاق سے بولی۔

''میں نے عشنا کو شاپنگ پر لے جانے کا کہا تھا، پر اس وقت مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ میری میٹنگ ہے۔ اور حمید کو اپنی بیوی کو ہاسپٹل لے کر جانا تھا وہ بھی نہیں تھا۔ ابھی عشنا کا فون آیا تو میں نے تم سے پوچھے بغیر اسے کہہ دیا کہ تم اسے شاپنگ پر لے جاؤ گی۔'' ان کی بات پر مسکراتی فائزہ کے ہونٹ بھینچ گئے۔

''ہیلو۔'' اس کی خاموشی پر رضا صاحب زور سے بولے۔

''جی پاپا۔'' وہ بمشکل نارمل انداز میں بولی۔

''تو پھر میں اسے کہوں کہ وہ ریڈی رہے۔'' فائزہ نے گہرا سانس لیا۔

''جی پاپا، ان سے کہہ دیں کہ نیچے آ جائیں میں چینج کر لوں۔''

''تھینک یو بیٹا۔'' وہ ممنون انداز میں بولے۔

''ڈونٹ سے تھینک یو پاپا میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ مجھے کچھ بھی کہہ سکتے ہیں۔''

''لو یو میری گڑیا۔'' کہہ کر انہوں نے فون بند کر دیا جبکہ وہ ہونٹ بھینچے کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

فون بند کر کے کتنی دیر وہ ماتھے پر بل ڈالے سامنے دروازے کو گھورتی رہی۔ اس لڑکی نے ایک بار پھر اس کے پلان پر پانی پھیر دیا تھا۔ رضا سے اس کی شادی کو تقریباً دو سال سے زائد کا عرصہ ہو گیا تھا، شروع میں شاید فائزہ کے لیے اس رشتے کو قبول کرنا مشکل تھا تو وہ عشنا سے تو اکھڑی رہتی تھی، باپ سے بھی کلام نہیں کرتی تھی۔ لیکن وہ باپ بیٹی تھے آخر میں ایک جان ہو ہی گئے تھے، لیکن ان کے درمیان جو اجنبیت اور کڑواہٹ پہلے دن سے تھی وہ ان کے درمیان اب بھی قائم تھی۔ فائزہ نے باپ کی خوشی کے لیے اسے قبول کرلیا تھا لیکن عشنا رضا کی خاطر ایسا بھی نہیں کر سکی فائزہ شروع سے ہی اس کی آنکھ میں کانٹے کی طرح چبھتی تھی، فائزہ اس کے کسی کام یا معاملے میں دخل نہیں دیتی تھی پر اس کے باوجود عشنا کو اس سے خدا واسطے کا بیر تھا، بس نہیں چلتا تھا اس کو ذلیل کر کے دھکے دے کر گھر سے نکال دے۔ لیکن وہ رضا کی بے حد لاڈلی تھی وہ اس کے خلاف کچھ نہیں سنتے تھے اور وہ رضا کی نظر میں کچھ غلط کر کے بری نہیں بننا چاہتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کسی طرح فائزہ کو رضا کی نظروں میں گرا دے یہ کام وہ کھلے عام نہیں کر سکتی تھی اس لیے چھپ چھپ کر کرتی تھی۔ موقع محل دیکھ کر۔

رضا صاحب کے کان بھرنا، آخر کب تک وہ اس کی باتیں اگنور کرتے کبھی نہ کبھی تو وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوتی اور اس سلسلے کی پہلی کڑی اس کی اپنی اولاد کی خواہش تھی۔ ایک اور اولاد ہو جاتی تو لازمی بات ہے، رضا کا دھیان فائزہ سے زیادہ اس بچے پر ہوتا اور یہ مشورہ اسے اس کی بڑی بہن نے دیا تھا۔

ساری سوچوں کو جھٹک کر اس نے آئینے میں خود کو ایک بار دیکھا ہونٹوں پر لگی لپ اسٹک کو گہرا کیا، کرل کیے بالوں کو ہاتھوں سے ہلکا ہلکا سنوار کر کندھوں پر پھیلایا، پرفیوم کا اچھا خاصا چھڑکاؤ کیا۔ بیڈ پر رکھے اپنے سنہری چین والے پرس کو کندھے پر لٹکایا اور لمبی ہیل پر ٹک ٹک کرتی سیڑھیاں اترنے لگی، دروازہ کھول کر پورچ میں آئی تو فائزہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی یقیناً اسی کا انتظار کر رہی تھی، جبکہ چوکیدار گیٹ کھولے کار نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس کے بیٹھتے ہی فائزہ نے کار اسٹارٹ کر دی۔

"کہاں سے شاپنگ کرنی ہے آپ نے۔" کار کو مین روڈ پر لاتے فائزہ نے عشنا سے پوچھا۔

"میں تو مختلف جگہوں سے شاپنگ کرتی ہوں آج چونکہ تم مجھے لے کر جا رہی ہو تو تمہاری پسند کی جگہ سے شاپنگ کر لیتے ہیں۔" وہ عادتاً بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

"میری اور آپ کی پسند میں بہت فرق ہے اس لیے آپ وہیں سے شاپنگ کریں، جہاں سے آپ کو پسند ہے۔" عشنا نے گردن گھما کر فائزہ کو دیکھا جو سنجیدگی سے گاڑی چلا رہی تھی۔ اس کے چہرے سے وہ اندازہ نہیں لگا سکی، اس نے واقعی اسے مشورہ دیا ہے یا طنز کیا ہے۔

سر جھٹک کر قریب ترین واقع مال کا نام لیا۔ کار پارک کر کے وہ دونوں مال کے اندر داخل ہوئیں۔ یہ کوئی چوتھی دوکان تھی جہاں بے مقصد گھومنے اور سیلز مین کا دماغ خراب کرنے کے بعد وہ خالی ہاتھ باہر آئی اور اس کے پیچھے خود پر ضبط کرتی فائزہ آئی تھی۔

پتا نہیں اسے کچھ لینا بھی تھا یا نہیں کیونکہ فی الحال تو وہ صرف اسے پریشان کر رہی تھی۔

وہ پانچویں دوکان میں گھسی تو فائزہ اندر جانے کے بجائے باہر والے ریک کے قریب لگے ہینڈ میڈ کلچ دیکھنے لگی۔ جیولری کاؤنٹر پر کھڑی عشنا نے دل جلاتی مسکراہٹ ہونٹوں پر سجا کر فائزہ کو دیکھا اور اگلے ہی پل اس کی مسکراہٹ سکڑ گئی۔ سامنے فوڈ کورٹ میں کرسیوں پر بیٹھے دولڑکے بڑے غور سے فائزہ کو دیکھ رہے تھے جبکہ وہ اردگرد سے لاپرواہ کلچ دیکھ رہی تھی، اس نے ہاتھ میں پکڑی بریسلٹ کی قیمت پوچھنے کے لیے اس لڑکے کو مخاطب کرنا چاہا، پر وہ بھی عشنا کی طرف متوجہ نہ تھا۔ حسد کی ایک لہر تھی جو عشنا کے وجود میں دوڑ گئی تھی اس نے ایک بار پھر فائزہ کو دیکھا جو ڈھیلے ڈھالے ٹراؤزر پر گھٹنوں تک آتی کرتی پر اسٹالر کو گردن کے دونوں اطراف سے لپیٹ

کر اس کے سرے سینے پر پھیلائے ہوئے، گھنے بالوں کی اونچی سی پونی بنی تھی۔ چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس سادگی اور بے نیازی کے ساتھ وہ واقعی نمایاں ہو رہی تھی۔

اس نے بے اختیار سامنے لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ سلیقے سے کیے میک اپ نے اس کے تیکھے نقوش کو اور نکھار دیا تھا۔ ٹائٹ جینز پر فٹنگ والی شرٹ اس کے متناسب سراپے پر بہت جچ رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ینگ اور ہینڈسم لڑکے اس کے بجائے فائزہ کو دیکھ رہے تھے یہ نہیں کہ اس کو آتے جاتے مردوں نے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھا تھا بلکہ ایکسرے کرتی نظروں سے دیکھا تھا، کیونکہ دعوت نظارہ دینے والا لباس تو اس نے خود پہنا تھا۔ لیکن ان نظروں میں ہوس تھی، گندگی تھی جبکہ جو نظریں فائزہ پر تھیں۔ ان میں پسندیدگی تھی، جب سے اس کی شادی رضا سے ہوئی تھی امیر بننے اور لگنے کی کوشش میں اس نے سراپا خود کو بدل ڈالا تھا چادر جو اس کی غربت کی ساتھی تھی۔ امیر بنتے ہی سب سے پہلے اس نے اس کو اتارا تھا، وہ پارلر میں ہزاروں خود پر خرچ کرتی تھی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ ستائش اور تعریف کی مزید بھوکی ہوتی جا رہی تھی۔

اس نے تلملاتے ہوئے بریسلیٹ کاؤنٹر پر پٹخا تو سیلز بوائے نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''کام پر تمہارا دھیان نہیں۔ کروں تمہارے اونر سے کمپلین۔'' اس نے ابرو اچکا کر اسے دھمکی دی تو وہ مزید گھبرا گیا۔

''سوری میم، میرا دھیان آپ کی طرف ہی تھا یہ بریسلیٹ آپ کے خوب صورت ہاتھوں پر بہت اچھا لگ رہا ہے۔ لیکن میری نظر میں ایک اور ہے میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' وہ اب دوسرا بریسلیٹ نکال رہا تھا۔ فائزہ نے اکتا کر اندر نظر ڈالی جہاں عشنا جیولری کاؤنٹر پر کھڑی جیولری دیکھ رہی تھی۔ اس نے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا ڈیڑھ گھنٹہ ہو گیا تھا فضول مٹرگشتی کرتے ہوئے۔ اس سے پہلے وہ اندر جا کر عشنا کو باہر نکالتی اپنے نام کی پکار اور جانی پہچانی آواز پر وہ حیرت سے مڑی اور ہالہ کو دیکھ کر وہ بے ساختہ اس کی جانب بڑھی اور گلے لگ گئی۔

''میں بتا نہیں سکتی تمہیں دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے۔'' وہ اسی طرح اس کو بازو کے گھیرے میں لیے پرجوش انداز میں بولی۔ جبکہ اس کے جذباتی انداز پر ہالہ جھینپ کر مسکرائی کیونکہ اردگرد آتے جاتے لوگ بھی انہیں دیکھنے لگے تھے۔

''مجھے پتا چل گیا ہے مجھے دیکھ کر تمہیں بہت خوشی ہوئی ہے پر اب مجھے چھوڑ دو۔ سب دیکھ رہے ہیں۔'' ہالہ نے دھیرے سے اس کے کان میں سرگوشی کی تو وہ ایک دم سنبھلی پھر سیدھی ہوئی اور کھسیا کر اردگرد نظر ڈالی، تب ہی اس کی نظر ہالہ کے پیچھے خود کو گھورتے حماد پر پڑی اس کی نظروں میں ناگواری محسوس کر کے اس نے بے ساختہ انداز میں نظروں کا زاویہ بدلا۔

''سوری یار، میں کچھ زیادہ ہی جذباتی ہو گئی۔'' وہ اب اشتیاق سے ہالہ کا براؤن اسکارف میں لپٹا خوب صورت چہرہ دیکھ رہی تھی۔

''اکیلی آئی ہو۔'' ہالہ نے اس کے اردگرد دیکھ کر پوچھا تو فائزہ نے سر نفی میں ہلایا اور دزدیدہ نظروں سے دکان کے اندر دیکھا اور پھر ہالہ کی طرف دیکھا تو نظر پیچھے کھڑے بندے سے ٹکرا کر واپس آئی۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو۔'' پیچھے کھڑے بندے کی نظروں سے کنفیوژ ہو کر اس نے پھر ایک بونگا سا سوال کر دیا۔

''شاپنگ، اماں نے لسٹ دی تھی گروسری کی۔ وہ لینی تھی اور کچھ کپڑے لینے تھے سیزن کا اینڈ تھا تو سوچا سیل لگی ہو گی فائدہ اٹھایا جائے۔'' ہالہ نے مذاق اڑانے کے بجائے تفصیل سے جواب دیا جبکہ حماد نے اکتا کر اردگرد نظر ڈالی پتا نہیں یہ لڑکیوں کو کیا بیماری ہوتی ہے، پانچ دن کے گیپ سے بھی ملیں تو یوں ملتی ہیں جیسے پانچ

ہزار سال بعد مل رہی ہوں۔
"ہالہ! میرا خیال ہے دیر ہو رہی ہے۔" حماد کے دانت پیس کر کہنے پر ان دونوں نے اس کی طرف دیکھا جو دونوں ہاتھوں میں شاپنگ بیگز اٹھائے کافی اکتایا ہوا لگ رہا تھا۔
"یہ تمہارا بھائی اتنا سڑیل کیوں ہے۔" ہالہ کے قریب منہ لے جا کر سرگوشی کی تو ہالہ کی ہنسی نکل گئی اور ہمیشہ کی طرح حماد نے وہ تعریف سن لی تھی، اس سے پہلے وہ بولتا جس دوکان کے آگے وہ کھڑے تھے وہاں سے ایک ماڈرن لڑکی نکلی۔
"چلیں فائزہ۔" پیچھے سے آتی آواز پر فائزہ نے بے ساختہ آنکھوں کو میچ کر کھولا۔
"اوکے ہالہ، پھر یونی ورسٹی میں ملتے ہیں۔" فائزہ جلدی جلدی بول کر وہاں سے ہٹنا چاہتی تھی حماد نے حیرت سے اس لڑکی کی گھبراہٹ دیکھی۔ پہلے کیسے مطمئن ہو کر باتیں کر رہی تھی اور اب اتنی جلدی میں تھی جیسے دو لمحے اور رکی تو اس کی ٹرین چھوٹ جائے گی۔
"ارے رکو تو۔" اس سے پہلے وہ مڑتی عشنا نے اس کا بازو پکڑ کر اسے روک لیا۔ فائزہ نے ہونٹ بھینچ کر خود کو قابو کیا۔
"تعارف تو تم نے کروایا نہیں۔" وہ ہالہ اور حماد کو دیکھتے ہوئے بولی تو ہالہ کی نظریں عشنا کی طرف دیکھ کر مجبوراً فائزہ کو بولنا پڑا۔
"یہ ہالہ ہے میری دوست......" اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گئی تو عشنا نے ابرو اچکا کر معنی خیز نظروں سے حماد کو گھورا۔
"اور اس ہینڈسم کا نہیں بتاؤ گی یہ بھی تمہارا دوست ہے۔" عشنا کے بے باک انداز پر ہالہ نے الجھ کر جبکہ حماد اور فائزہ نے ناگواری سے اسے گھورا۔
"یہ ہالہ کے بھائی ہیں۔"
"یہ بھی تمہارے ساتھ پڑھتا ہے۔" وہ بغور حماد کا جائزہ لے رہی تھی اس کی نظروں سے حماد کو کوفت ہو رہی تھی۔
"میرا خیال ہے اب چلنا چاہیے۔" اب کی بار فائزہ کا انداز سنجیدہ تھا۔
"چلتے ہیں بھئی...... اینی ویز ہالہ خوشی ہوئی تم سے مل کر بھئی تم فائزہ کی اتنی خاص دوست ہو تو گھر کیوں نہیں آتیں۔"
"آؤں گی۔" ہالہ نے مسکرا کر جواب دیا۔
"اف، دیکھو کتنی بھلکڑ ہوں، اپنا تعارف کروانا تو میں بھول ہی گئی۔" عشنا نے اپنے سر پر ہاتھ مارا تو فائزہ کے اکڑے ہوئے کندھے بے اختیار ڈھیلے پڑے۔
"میں فائزہ کی ممی ہوں۔" عشنا کے تعارف پر ہالہ اور حماد دونوں نے بے یقینی سے عشنا کو اور پھر فائزہ کو دیکھا جو ایسے زمین پر نظریں گاڑے تھی جیسے اس سے ضروری اور کوئی کام ہی نہ ہو۔ عشنا نے ایک نظر فائزہ کے دھواں دھواں ہوتے شرمندہ چہرے پر ڈالی اور سرشاری سے مسکرائی یہی تو وہ چاہتی تھی کہ وہ سب کی نظروں میں بے اعتبار اور اکیلی ہو جائے۔
حماد اور ہالہ کی حیرت زدہ نظریں وہ اب بھی اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی، اسی لیے ان سے نظریں ملائے بغیر مڑی۔
"اوکے ہالہ، پھر ملاقات ہو گئی۔" عشنا نے مسکرا کر ہالہ کا کندھا تھپتھپایا، جو حیرانی سے جاتی فائزہ کو دیکھ

رہی تھی۔

"یہ کیسی عجیب دوست ہے تمہاری؟" ہالہ جو ابھی بھی فائزہ کے عجیب وغریب رویے کے بارے میں سوچ رہی تھی حماد کی بات پر چونک کر اسے دیکھا۔

"کیا مطلب عجیب سی، اچھی تو ہے۔"

"تم جس طرح دن رات فائزہ فائزہ کرتی تھیں مجھے لگا پتا نہیں کیا توپ چیز ہوگی۔"

"وہ توپ چیز ہی ہے۔" ہالہ نے جیسے اس کی سوچ کی تردید کی۔

"جو بھی ہے پر تمہارے ٹائپ کی بالکل نہیں...... تم لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔" یقیناً اس کا اشارہ فائزہ کی ڈریسنگ کی طرف تھا۔

"تم کسی کو اس کے لباس سے جج نہیں کر سکتے، فائزہ کی ڈریسنگ بے شک ماڈرن ہے لیکن ولگر بالکل نہیں اور اس سے میری دوستی ہماری ذہنی مطابقت کی وجہ سے ہے وہ مضبوط کردار کی مالک ہے۔" وہ نہیں چاہتی تھی کہ حماد فائزہ کے بارے میں کوئی غلط رائے قائم کرے کیونکہ اس کی رائے ان کی دوستی پر اثر انداز ہو سکتی تھی۔

"میں بالکل اسے جج نہیں کر رہا۔ بس اپنی رائے دی ہے مجھے وہ تم سے بہت مختلف لگی اور اس کی ممی۔" اس نے کہہ کر آنکھیں گھمائیں۔ "اتنی ینگ ممی میں نے پہلی دفعہ دیکھی ہے۔ بیٹی کی ہم عمر اب جب اپنی دوست سے ملو تو اس سے پوچھنا کہ اس کی ممی کھاتی کیا ہیں۔" اب وہ مذاق اڑا رہا تھا لیکن ہالہ سنجیدہ تھی۔

"اس کی ممی کو دیکھ کر تو میں بھی حیران ہوں کیونکہ فائزہ نے تو مجھے یہی بتایا تھا کہ اس کی ممی کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔" وہ الجھی ہوئی تھی جبکہ حماد نے سن کر ابرو اچکائے۔

"اسٹرینج۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں بہت عجیب ہے تمہاری دوست۔ اور اس سے بھی زیادہ عجیب ہے اس کی ممی مجھے ایسے گھور رہی تھی جیسے آنکھوں کے راستے نگل جائے گی۔ پر اس کا بھی قصور نہیں لڑکیاں مجھے دیکھ کر اکثر اپنے حواس کھو بیٹھتی ہیں۔" ہالہ جو فائزہ کے بارے میں سوچ رہی تھی حماد کی بات سن کر اس کی ہنسی نکل گئی۔

"کیا بات ہے یوسف ثانی صاحب۔"

"ارے مذاق سمجھ رہی ہو۔" حماد اب پتا نہیں اسے کون کون سے قصے سنانا شروع ہو چکا تھا۔

☆☆☆

معین ٹکٹ لے کر آیا تب تک وہ پاپ کارن اور کولڈ ڈرنک خرید چکا تھا۔ مووی اسٹارٹ ہونے میں ابھی پندرہ منٹ تھے۔ وہ دونوں وہیں کھڑے ہو کر آتے جاتے لوگوں کو دیکھنے لگے معین نے غور سے اس کی سنجیدہ شکل دیکھی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے دوپہر تک تو بالکل ٹھیک تھے میرے سونے کے درمیان کون تم پر حملہ کر کے گیا ہے۔" معین نے کولڈ ڈرنک کا بڑا سا گھونٹ لے کر پوچھا۔

"اچھا بھلا ہوں اب کیا یہاں تمہیں ناچ کر بتاؤں۔"

"ہاں اگر ایسا کر سکتے ہو تو کر لو تھوڑے پیسے بھی جمع ہو جائیں گے اور مجھے بھی پتا چلے گا بندر ناچتا ہوا کیسے لگتا ہے۔"

"لعنت ہو تم پر۔" معین کی بات پر ثاقب نے ناراضی سے اسے دیکھا تب ہی اس کی جیب میں رکھا اس کا موبائل وائبریٹ ہوا تو اس نے موبائل نکال کر دیکھا جس پر پاپا کالنگ آ رہا تھا اس نے فون واپس جیب میں رکھ لیا۔

"چلو مووی اسٹارٹ ہونے والی ہے۔" کہتے وہ عجلت بھرے انداز میں سینما ہال کے اندر داخل ہوئے کرسی

پر بیٹھتے اپنا موبائل آف کر گیا۔

"یار، کیا بکواس مووی تھی قسم سے۔ اس کے لیے اتنا شور مچایا ہوا تھا لوگوں نے۔" مووی دیکھ کر معین کافی بد دل ہوا تھا۔ پر وہ کوئی تبصرہ کیے بغیر اس کے ساتھ اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا، معین نے اپنا فون جو سائلنٹ پر تھا نکالا تو چونکا۔

"او مارے گئے، مقصود انکل کی چھ مسڈ کالز خیر ہو۔" اس نے پریشانی سے ثاقب کی طرف دیکھا جو اس کے برعکس مطمئن تھا۔

"کال بیک کر کے پوچھ لو۔" مشورہ دے کر وہ پھر چلنے لگا جبکہ معین نے حیرت سے اس کا ٹھنڈا انداز کو دیکھا، دوسری بیل پر فون اٹھا لیا گیا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔"

"وعلیکم السلام...... کہاں ہو تم۔" ان کی سنجیدہ آواز پر اس نے تھوک نگلا اور اس کا جواب سنے بغیر اگلا سوال کر دیا۔

"ثاقب کہاں ہے۔"

"میرے ساتھ ہے انکل۔" وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ثاقب کے ہم قدم ہوا۔

"ایک گھنٹہ ہو گیا ہے مجھے فون کرتے ثاقب کا فون بند جا رہا ہے اور تم فون پک نہیں کر رہے ہو کیا ہو رہا ہے۔" پریشانی کی وجہ سے ان کا لہجہ غصیلا ہو گیا تھا۔

"انکل، لائٹ گئی ہوئی تھی تو ثاقب اپنا فون چارج نہیں کر سکا۔" معین کے جھوٹ پر ثاقب مسکرایا تو معین نے غصے سے آنکھیں نکال کر اسے گھورا۔

"اس کو فون دو۔"

"جی۔" معین نے جلدی سے فون اس کی طرف بڑھایا۔

"السلام علیکم پاپا۔"

"وعلیکم السلام اتنے فون کیے تمہیں، تمہارا فون بند جا رہا تھا میں پریشان ہو گیا تھا۔"

"سوری پاپا، مجھے آئیڈیا نہیں تھا کہ آپ کا فون آئے گا۔ آپ اتنی کالز کر رہے تھے...... خیریت تھی۔"

"ہاں خیریت تھی، ویسے ہی کال کی تھی کال ملی نہیں تو پریشان ہو گیا۔ خیر تم بتاؤ پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔"

"اچھی جا رہی ہے۔"

"کسی چیز کی ضرورت تو نہیں۔"

"نہیں پاپا، فی الحال تو نہیں۔"

"تمہاری اپنی ماں سے بات ہوئی تھی۔" ان کے پوچھنے پر ثاقب کے ہونٹوں پر ایک پل کے لیے مسکراہٹ آئی تھی۔

"نہیں پاپا، ہو سکتا ان کی بھی کال آئی ہو پر میرا فون بند تھا۔"

"ہوں۔" اس کی بات پر انہوں نے ہنکارا بھرا۔

"کوئی خاص بات تھی پاپا۔"

"نہیں خاص نہیں بس تمہاری دادی پھوپھو تمہیں بہت یاد کرتے ہیں، تمہاری سالگرہ بھی آ رہی تھی تو سب چاہتے تھے تم گھر آ جاؤ تو مل کر سلیبریٹ کریں۔" ثاقب نے گہرا سانس لیا۔

"پاپا، میں خود آپ لوگوں کو بہت یاد کرتا ہوں لیکن یہ جو اچانک چھٹیاں آئی ہیں۔ اس کی وجہ سے اسٹڈی

کافی متاثر ہوئی ہے۔ کافی لیکچرز مس ہوئے ہیں اب دو تین دن میں یونیورسٹی کھل جائے گی تو شیڈول مزید ٹف ہو جائے گا کیونکہ اس کے بعد ہمارے ایگزیمز ہونے والے ہیں میں اگر آیا تو اتنا ٹائم ضائع ہو جائے گا۔"
ثاقب کی وضاحت نے مقصود صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"میں جانتا ہوں جانتے ہوئے میں نے ہی تمہیں کہا تھا کہ مجھے میرٹ کے مطابق تمہارے نمبر چاہیے پر ثاقب، اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم دنیا ہی تیاگ دو اس طرح تو تم سوشل لائف سے کٹ کر رہ جاؤ گے صحت علیحدہ خراب ہوگی۔ جب سے تم گئے ہو آٹھ ماہ ہونے والے ہیں صرف دو بار تم گھر آئے ہو وہ بھی چار پانچ دن کے لیے، مجھے سمجھ نہیں آتی کیوں تم نے پڑھائی کو اتنا سر پر سوار کر لیا ہے۔ منع بھی کیا تھا کنول کو کہ تمہیں اتنی دور نہ بھیجے پر وہ عورت۔"

"پاپا۔" اس سے پہلے وہ کنول کے بارے میں کچھ کہتے وہ بول پڑا۔

"ممی کا اس میں کوئی قصور نہیں۔ میں تو لندن جانا چاہتا تھا پر ممی نے مجھے کہا کہ میرے بغیر دادی اور آپ اکیلے ہو جائیں گے۔ وہ جانتی ہیں کہ آپ دونوں مجھ سے کتنا اٹیچ ہیں انہوں نے آپ لوگوں کی خاطر مجھے لندن جانے نہیں دیا اور آپ ممی کو ہی غلط سمجھ رہے ہیں وہ جو بھی آپ لوگوں کے لیے کر لیں آپ اور دادی نے ہمیشہ انہیں غلط ہی کہنا ہوتا ہے۔" اس کے ناراض لہجے پر انہوں نے پیشانی مسلی۔

"ایسا بالکل نہیں ثاقب، مجھے پتا ہے کنول سب کا کتنا خیال کرتی ہے بس سب اداس ہیں تو۔" کہہ کر وہ خاموش ہو گئے۔

"پھر کوشش کرو چکر لگا لو تمہاری سالگرہ کے بہانے سب اکٹھے ہو جائیں گے۔"

ہاں سالگرہ کے بہانے مجھے بلی کا بکرا بنا دیں۔ وہ دل میں بولا۔

"پاپا، میں ضرور آتا لیکن ابھی مجبوری ہے نہیں آ سکتا لیکن ایگزیمز کے بعد تو لازمی آؤں گا۔ دو ماہ کے لیے آپ دادی اور سب گھر والوں کو میرا اسلام دیجیے گا۔ میں پھر آپ کو کال کروں گا۔ معین کے فون پر کال آ رہی ہے۔"

"اللہ حافظ" کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

"کہاں کال آ رہی ہے؟" معین نے ابرو اچکا کر اسے گھورا فون بند کرنا تھا تو کوئی بہانہ تو چاہیے تھا۔

"تمہارے پاس فائزہ کا نمبر ہے۔" ثاقب کے سوال پر معین نے چونک کر اسے دیکھا۔

"فائزہ کیوں۔" اس نے آنکھیں سکیڑیں۔

"کہیں تم ہالہ سے مایوس ہو کر اب فائزہ پر ڈورے ڈالنے کا تو نہیں سوچ رہے۔" معین کی بات پر اس نے افسوس سے سر ہلایا۔

"جب بھی بات کرنا منحوس ہی بات کرنا۔"

"میں ہالہ سے کہیں باہر ملنا چاہتا ہوں اور میری سالگرہ سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"اور تجھے لگتا ہے ہالہ آئے گی؟" معین نے اب سنجیدگی سے پوچھا۔

"میں جانتا ہوں مشکل ہے اسی لیے تو فائزہ سے بات کرنا چاہتا ہوں وہ لڑکی انڈرسٹینڈ کرے گی اور اسے اندازہ ہے میں ہالہ کے لیے سیریس ہوں صرف وہی ہالہ کو کنوینس کر سکتی ہے۔"

"نہ میرے بھائی۔" معین نے برا سا منہ بنایا۔

"ہالہ بی بی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ وہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"اور اگر آ گئی تو۔" ثاقب کے کہنے پر معین نے اس کا چہرہ دیکھا جس کی آنکھیں اس کے آنے کے خیال

سے چمک رہی تھیں اس نے دل ہی دل میں اس کی خوشی برقرار رہنے کی دعا کی لیکن بظاہر چہرے پر مایوسی طاری کر کے اسے دیکھا۔

"ہو ہی نہیں سکتا۔"

"تم شرط لگاؤ۔"

"ٹھیک ہے پھر لگی شرط۔ اگر میں جیتا تو تیری وہ فیورٹ بلیک لیدر جیکٹ میری۔" معین نے انگلی اٹھا کر اسے جتایا تو ثاقب کا دل کیا اس کمینے کی گردن مروڑ دے۔

"منحوس، تیری کب سے اس پر نظر ہے میں شرط جیت بھی گیا تو بھی وہ جیکٹ تیری حسرتی نظروں کی وجہ سے جلد میرے بھی کسی کام کی نہیں رہے گی۔"

"اور بچو، اگر میں جیتا تو تم مجھے بیس ہزار کیش دو گے وہ بھی آن دا اسپاٹ۔"

"دفع دور...... شکل دیکھی ہے اپنی۔" معین تو جیسے اس کی شرط سن کر تڑپ اٹھا تھا۔

"کبھی بیس ہزار اکٹھے بھی دیکھے ہیں۔" معین نے کانوں کو ہاتھ لگائے جیسے ثاقب نے بیس ہزار نہیں بیس لاکھ مانگ لیے ہوں۔

"میں تجھے پھوٹی کوڑی نہیں دینے والا کیونکہ جانتا ہوں۔ ہالہ کبھی نہیں آئے گی۔"

"وہ تو وقت بتائے گا تم بس کسی اچھے سے ریسٹورنٹ کا پتا کرو۔" کہہ کر وہ بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھنے لگا اور اس کے پیچھے موبائل پر اچھا سا ریسٹورنٹ سرچ کرتے ہوئے معین بڑبڑا رہا تھا۔

"پتا نہیں اس کے شیطانی دماغ میں کیا کیا منصوبے چلتے رہتے ہیں۔"

"مجھے آواز آ رہی ہے۔" فلیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے ثاقب نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"سن لیا ہے تو اچھی بات ہے میں کیا ڈرتا ہوں تم سے۔" وہ اونچی آواز میں کہہ کر ایک بار پھر بڑبڑاتا ہوا فلیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

☆☆☆

"کیا اس نے آنے سے منع کر دیا۔" قمر جہاں نے غصے سے پہلے اپنے بیٹے کو اور پھر اس کے ساتھ بیٹھی اس کی بیوی کو گھورا۔

"یہ سب تمہاری بیوی کی کرامات ہو گی۔ اس نے منع کیا ہو گا اسے پتا نہیں کیا کیا باتیں کر کے ہمارے خلاف کرتی ہے۔ اتنی محبت کرنے والا بچہ تھا اس کے دل میں اتنا زہر ہمارے خلاف بھرا ہے کہ وہ ہماری صورتیں دیکھنے کا روادار نہیں۔" قمر جہاں کے الزام پر کنول نے شکایتی نظروں سے اپنے شوہر کو دیکھا۔

"بی بی جان، آپ ہر بات کنول پر کیوں ڈال دیتی ہیں کنول کی تو بات ہی نہیں ہوئی ثاقب سے۔"

"چل تو بھی بیوی کی حمایت میں جھوٹ بولنا شروع کر دے بس یہی کسر رہ گئی تھی۔" مقصود صاحب نے گہرا سانس لیا۔

"بی بی جان، میں حمایت نہیں کر رہا سچ کہہ رہا ہوں میں آج تقریباً سارا دن ثاقب کا نمبر ٹرائی کرتا رہا ہوں پر وہ بند جا رہا تھا معین کے فون سے رابطہ کیا میں نے ثاقب سے۔"

"اگر تمہاری بیوی کی بات نہیں ہوئی تو پھر کس وجہ سے اس نے آنے سے انکار کیا ہے۔"

"اس کے ایگزیمز ہونے والے ہیں بی بی جان۔" اب کہ مقصود صاحب زچ ہو کر بولے۔

"مقصود، میں کوئی جاہل عورت تو ہوں نہیں جس کو تم بار بار یہ پڑھائی کی کہانی سنا رہے ہو ماشاءاللہ ہمارا سارا خاندان ویل ایجوکیٹڈ ہے میں اپنے زمانے کی ماسٹرز ہوں جب لڑکیوں کو اتنی تعلیم دینا ضروری نہیں سمجھا

جاتا تھا، تمہارے فادر انگلینڈ سے پڑھ کر آئے تھے تم اور فیاض اس ملک کی بہترین، کالج اور یونی ورسٹیوں سے پڑھے ہو تمہاری بہن نے انگلش لٹریچر میں ایم اے کر رکھا ہے، تمہارے بھتیجے، بھتیجیاں، بھابھی بہترین کالجوں سے پڑھ رہے ہیں کسی کو یوں پڑھائی کو اوڑھنا بچھونا بناتے نہیں دیکھا، کتنا منع کیا اسے اتنی دور نہ بھیجو پر نہیں تمہاری بیوی کو تو ہر اس بات کی ضد ہے جو میں کہوں، تمہاری بیوی نے بات تمہارے کان میں ڈال دی اور تم بھی وہی کرتے ہو جو وہ کہتی ہے۔'' قمر جہاں نے ٹیڑھی نظروں سے کنول کو دیکھا۔

''پڑھائی تو بہانہ ہے صرف اسے ہم سے دور کرنا چاہتی ہے یہ اور دیکھو۔ ویسا ہی ہو رہا ہے۔ آٹھ مہینوں میں چند دن آیا اور وہ بھی چند گھڑی میرے پاس آ کر بیٹھا باقی سارا ٹائم ماں نے اسے پلو سے باندھ کر رکھا تھا۔'' ان کی بات پر کنول نے بے ساختہ پہلو بدلا اور دانتوں پر دانت جما کر خود کو کچھ بھی کہنے سے روکا۔ ورنہ دل تو کہہ رہا تھا کہ ان کو کہہ دے کہ اپنے بیٹے کو تو ہر وقت پلو سے باندھ کر رکھنا ٹھیک ہے اور اگر ان کا بیٹا باپ کے نقش قدم پر چلتا ہوا اپنی ماں کے پلو سے بندھا تھا تو ان کو برا لگ رہا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بیٹے کے ساتھ اکلوتے پوتے پر بھی اپنا تسلط چاہتی تھیں۔

''بس کریں بی بی جان...... ہر وقت بھابھی کے پیچھے پڑی رہتی ہیں۔'' آخر ثمینہ اس کی نند کو خیال آ گیا یا رحم آ گیا جو اس کی جان خلاصی کروائی۔

''غلط کہہ رہی ہوں کیا میں۔'' قمر جہاں چمک کر بولیں۔

''بی بی جان پلیز۔'' بہن کو دیکھ کر مقصود نے بھی ماں کو ٹوک دیا تو وہ سر جھٹک کر رہ گئیں۔

''اب چائے بھی ملے گی یا وہ بھی نہیں ملے گی۔'' ان کے چڑ کر بولنے پر کنول اٹھی تو ان کے ساتھ کب سے خاموشی سے سنتی کنزا بھی اٹھ گئی۔

''اریبہ، جاؤ بیٹا ممانی کے ساتھ کچن میں ہیلپ کروا دو۔'' ثمینہ کے کہنے پر اریبہ بھی اٹھ کر کنول کے پیچھے چل دی۔

''بی بی جان، آپ بھی حد کرتی ہیں بھابھی چپ رہتی ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں جو بھی آپ کا دل کرے آپ انہیں سنا دیں۔ وہ اب مجبور اور بے چاری نہیں، جن کو لاوارث سمجھ کر آپ طعنے دیتی رہتی تھیں اب وہ ایک بیٹے اور بیٹی کی ماں ہیں اور ان کا بیٹا کروڑوں کی جائیداد کا مالک ہے۔ آپ کو تو پتا ہی ہوگا آخر یہ سب کرنے والے آپ کے شوہر محترم تھے۔'' ثمینہ نے طنزیہ انداز میں کہتے انہیں دیکھا۔

''اور ثاقب کتنا ماما بوائے ہے سب جانتے ہیں اگر آپ کا رویہ ایسا ہی رہا تو میں جو ثاقب کو اپنا داماد بنانے کے خواب دیکھ رہی ہوں وہ خواب ہی رہ جائے گا۔''

''اس کی اتنی مجال۔'' قمر جہاں تلملا کر بولیں۔

''خدارا بی بی جان، بس کر دیں اب ماضی کی غلطیوں کو حال میں کو جتا جتا کر میری بیٹی کا مستقبل تاریک نہ کریں۔'' ثمینہ نے تنگ آ کر ان کے آگے تقریباً اپنے ہاتھ جوڑ دیئے، ان کے انداز پر قمر جہاں نے غصے سے ہونٹ بھینچ لیے۔

''بھائی، آپ نے بھابھی سے بات کی تھی اریبہ اور ثاقب کی۔'' اب کہ ثمینہ نے کب سے سوچ میں ڈوبے سر جھکائے مقصود کو مخاطب کیا تو انہوں نے چونک کر ثمینہ کو دیکھا اور گہرا سانس لیا۔

''ہاں کی تھی۔''

''پھر۔'' وہ اشتیاق سے پوچھنے لگیں۔

''منع کر دیا ہوگا۔'' مقصود کو خاموش دیکھ کر قمر جہاں بولیں تو ثمینہ نے یوں سر جھٹکا جیسے کہہ رہی ہو کہ ان کا

کچھ نہیں ہو سکتا۔

"نہیں اس نے منع نہیں کیا۔ اس نے کہا میرے لیے اریبہ اور امیرا دونوں کنزہ کی طرح ہیں۔ ثاقب نے زندگی گزارنی ہے اسے جو پسند ہوگی وہی اس کی پسند ہوگی۔" ان کی بات پر ثمینہ اور قمر جہاں دونوں نے گہرا سانس لیا۔ تھوڑی دیر بعد خاموشی میں قمر جہاں کی آواز گونجی۔

"مقصود، میری ایک بات لکھ کر رکھ لے۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔ میرا تجربہ کہتا ہے تیری بیوی کے دماغ میں ضرور کوئی کھچڑی پک رہی ہے۔ کوئی چال چلنے والی ہے وہ گھنی میسنی اور اس میں تمہارا بیٹا بھی شامل ہے۔ اور یہ جو خاص طور پر باہر کی یونی ورسٹی چھوڑ کر لاہور پڑھنے گیا ہے یہ اسی چال کا کوئی حصہ ہے۔ ایک ہی گھر میں سب رہتے تھے تمہاری بیوی کو خدشہ ہوگا کہیں ثاقب اریبہ یا امیرا کو پسند نہ کرلے اس لیے اسے دور بھیج دیا اور اب وہ یہاں آ ہی نہیں رہا۔ مجھے تو لگتا ہے کہیں وہاں کوئی لڑکی کا چکر تو نہیں اور کیا پتا اس نے وہاں شادی کر رکھی ہو۔" قمر جہاں کی بات سن کر ثمینہ نے بے ساختہ اپنا ماتھا پیٹا جبکہ مقصود صاحب نے بے ساختہ لاحول پڑھا۔

"بی بی جان، آپ سارا دن بیٹھ کر یہی سوچتی رہتی ہیں۔" بھائی کا پریشان چہرہ دیکھ کر ثمینہ نے ناراضی سے اپنی ماں کو دیکھا لیکن وہ قمر جہاں ہی کیا جن پر کسی بات کا اثر ہوجائے۔

"میری مان مقصود خود ایک بار جا کر چکر لگا کر آ پتا تو کر وہاں چل کیا رہا ہے اور اگر سچ معلوم کرنا ہے تو بیوی اور بیٹے کو بتائے بغیر جانا۔" ماں کے کہنے پر مقصود صاحب کتنی دیر تک ماتھے پر سوچ کی لکیریں سجائے وہی بیٹھے رہے۔

☆☆☆

تین ہفتوں سے زیادہ ہوئے تھے اسے لاہور آئے ہوئے لیکن وہ ہنوز اپنے مقصد کو حاصل کرنے میں ناکام تھا جبکہ حویلی اور فیکٹری سے فون پر فون آرہے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ تین ہفتوں سے گھر نہیں جا سکا اور فیکٹری کے کتنے کام ادھورے تھے حتیٰ کہ دوستوں کی محفلیں اور پینا پلانا سب بھولا ہوا تھا۔ یاد تھا تو بس زیمل کو حاصل کرنا۔ اگر اسے حاصل ہی کرنا ہوتا تو اسے اغوا کروا چکا ہوتا۔ یہ اس کے لیے اتنا مشکل نہ تھا جب وہ وحید اصغر کے پاس تھی پر اب اس کی ایک جھلک بھی دیکھنا مشکل لگ رہی تھی۔ وہ اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا مناسب طریقے سے اس تک پہنچنا چاہتا تھا۔ لیکن ابھی تک وہ راستہ نہیں مل سکا تھا۔ اس نے گہرا سانس لے کر گردن ساتھ بیٹھے نبیل کی طرف گھمائی۔

"تمہارا کام کہاں تک پہنچا۔" نبیل جو کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا۔ چونک کر اس کی طرف گھوما۔

"سر، کافی انفارمیشن مل چکی ہے لیکن صرف پروفیشنل لیول پر ان کی پرسنل لائف کی اتنی انفارمیشن نہیں مل سکی۔"

"غلام عباس کے بیٹے کیا کرتے ہیں کیا ان کی کوئی مشکوک سرگرمی نہیں۔"

"سر، کوئی ایسی سرگرمی کی خبر نہیں ملی جسے ویک پوائنٹ کے طور پر استعمال کیا جاسکے۔ کلب وغیرہ میں وہ نہیں جاتے حتیٰ کہ کسی کی کوئی گرل فرینڈ کے بارے میں بھی نہیں سنا۔" سردار نے ابرو اچکائے۔

"اتنے پارسا۔" وہ طنزیہ مسکرایا۔

"نبیل، ایسا تو ہو نہیں سکتا۔ امیر بندہ ہو اور عیاشی نہ کرے میں نہیں مانتا۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"ہو سکتا ہے، سر، لیکن اگر ایسا ہے بھی تو پھر چھپا ہے، کیونکہ منظر عام پر تو وہ سنگل ہیں۔"

"تمہارا مطلب ہے کہ وہ جو وحید کی بیوی کہہ رہی تھی کہ غلام عباس کے کسی بیٹے سے اس کی منگنی ہوئی ہے تو

کیا وہ جھوٹ تھا۔"

"مجھے تو جھوٹ ہی لگ رہا ہے سر...... کیونکہ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے غلام عباس کے دونوں بیٹے کہیں انگیج نہیں۔"

"اور تمہارا سورس آف انفارمیشن کیا ہے؟"

"ان کے آفس کے لوگ۔"

"ہوں۔" سردار نے ہنکارا بھرا۔

"یہ وحید گھٹیا آدمی اس وقت سے مجھے دھوکا ہی دے رہا ہے اور اب یقیناً اس کی نیت بدل گئی ہے کہیں سے اسے زیادہ پیسے مل رہے ہوں گے۔ اگر مجھے زیمل نہ ملی تو وحید کو گولی تو میں اپنے ہاتھ سے ماروں گا۔" غصے سے اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

"سر، بڑی بیگم صاحبہ اور بڑے سردار کے بار بار مجھے فون آ رہے ہیں۔ انہیں کیا جواب دوں۔" نبیل نے ذرا جھجک کر اسے بتایا۔

"میں جا رہا ہوں آج حویلی...... کچھ دن وہیں رکوں گا فیکٹری اور زمینوں کے بھی کتنے کام رکے ہیں۔ پتا نہیں کتنے دن لگ جائیں تم مجھے فائنل بتاؤ۔ کتنے دن میں مجھے فائنل رزلٹ ملے گا۔" سردار کے انداز پر نبیل جیسے الرٹ ہوا۔

"سر، مجھے بس دس دن دے دیں۔"

"دس دن کا مطلب دس دن ایک دن بھی زیادہ ہوا نا نبیل، تو تم مجھے جانتے ہو۔"

"جی سر۔" نبیل تابعداری سے بولا۔

"زیمل جس کالج میں جاتی ہے، اس کی کوئی دوست ہے تو اس کا پتا کراؤ کتنے بجے کالج جاتی ہے اور کتنے بجے گھر آتی ہے اس کے علاوہ اور کہاں جاتی ہے سب کی تفصیل مجھے مل جانی چاہیے کیونکہ واپس آ کر میں سب سے پہلے اس کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"جی سر۔" نبیل ایک بار پھر تابعداری سے بولا تو سردار نے سن گلاسز آنکھوں پر لگا لیے اور نظریں باہر سڑک پر دوڑتی ٹریفک پر ٹکا دیں۔ نبیل کے موبائل کی بیپ بجی اور موبائل پر نظر آنے والا نمبر دیکھ کر اس نے گھبرا کر سردار کی طرف دیکھا اور اگلے ہی پل وہ فون سائیلنٹ پر کر کے جیب میں ڈال گیا اور دوبارہ نظر سردار پر ڈالی لیکن وہ خیالوں میں ڈوبا اس سے لاتعلق باہر دیکھنے میں مصروف تھا۔ نبیل نے بے ساختہ گہرا سانس لیا۔

☆☆☆

کمپیوٹر اسکرین کے آگے بیٹھی وہ بے چینی سے گھڑی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وقت تھا کہ آج گزر ہی نہیں رہا تھا۔ اس کی ڈیوٹی آورز ختم ہونے میں پندرہ منٹ باقی تھے اور ہیلن ابھی تک نہیں آئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی مخصوص گھنٹی بجی تو اس نے بیزاری سے سامنے دیکھا اور سامنے سے آتی ادھیڑ عمر عورت کو دیکھ کر اس کی بیزاری مزید بڑھ گئی لیکن اس کی جاب کا تقاضا تھا کہ اسے ہر وقت چہرے پر مسکراہٹ رکھنی تھی۔ اس عورت کی پریسکرپشن لے کر اس نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے اس کا انشورنس نمبر ڈالا جو ایکسپائر تھا، اس نے کارڈ اس کی طرف دھکیلتے اسے بتایا کہ اس کی انشورنس ختم ہو چکی ہے لیکن وہ بضد تھی کہ اسے کوئی غلط فہمی ہوئی ہے فارمیسی کا مالک جو اپنے کیبن سے دیکھ رہا تھا اٹھ کر اس تک آیا اور پوچھا معاملہ کیا ہے۔ اس نے بتایا کہ اس عورت کی انشورنس ختم ہے اسے ابھی دوائیاں بھی چاہئیں لیکن وہ پے بھی نہیں کر رہی۔

فارمیسی کا مالک کاؤنٹر سے باہر گیا اس بوڑھی انگریز کو صوفے پر بیٹھا کر پیار سے سمجھایا۔ سمجھ میں آنے پر وہ

پریشان ہوئی لیکن عروج کو اس کی پریشانی سے کوئی سروکار نہیں تھا یہاں آئے روز کئی ایسے ڈرامے ہوتے تھے۔
ہیلین کے آنے پر اس نے سکون کا سانس لیا اور اسے چارج دے کر وہ تیزی سے واش روم کی طرف بڑھی، اندر داخل ہوتے ہی اس نے اپنا لیب کوٹ اتارا اور گلے میں لٹکتا نیم کارڈ اٹھا کر کوٹ کو ہینگ کیا اور اپنا باقی سامان اسٹاف لاکر میں رکھا، ربن والے نیم کارڈ کو ہینڈ بیگ میں ڈالا اور دوبارہ واش روم میں آ کر اچھی طرح فیس واش سے منہ دھو کر ٹشو سے خشک کیا۔
ہینڈ بیگ سے لوشن، بیس، مسکارا، لپ اسٹک نکالی۔ چہرے پر اچھی طرح بیس بنا کر بلش آن لگایا۔ مسکارا کا ڈبل کوٹ لگا کر لائنر لگایا ابھی وہ آنکھوں کو کھول بند کر کے لائنر کی موٹائی چیک کر رہی تھی۔ جب اس کی کولیگ جس سے اس کی دوستی بھی تھی واش روم میں داخل ہوئی اور اس کی تیاری دیکھ کر سیٹی بجائی۔
''کیا بات ہے۔ آج کل بڑا تیار ہو کر واپس جاتی ہو۔ کہیں بس میں کوئی خاص بندہ تو نہیں ملتا۔'' میناکشی کی بات پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
''وہ بس والا نہیں کار والا ہے۔'' کہہ کر اس نے لپ اسٹک کے دونوں شیڈز چیک کیے۔ ''گاڑی والا'' میناکشی نے آنکھیں گھمائیں۔
''بوائے فرینڈ ہے۔'' وہ اب اشتیاق سے اسے دیکھ رہی تھی۔ جو اپنے ہونٹوں کو پنک لپ اسٹک سے سجا رہی تھی۔
''کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے دونوں ہونٹوں کو ملا کر لپ اسٹک کو بیلنس کیا۔
''کرتا کیا ہے۔'' میناکشی نے سلیب سے ٹیک لگا کر پوچھا۔
''بزنس ہے اپنا......فلیٹ ہے اپنا۔''
''اچھا۔'' میناکشی نے متاثر ہو کر کہا۔
''تمہیں یہاں آئے تین مہینے ہوئے ہیں۔ آدھا دن جاب پر گزر جاتا ہے تو اتنے تھوڑے وقت میں اتنا امیر بندہ ملا کیسے۔''
''میرے کزن کا دوست ہے۔'' وہ اب اپنے ہینڈ بیگ سے چھوٹا سا پرفیوم نکال رہی تھی۔
''وہ تمہیں پسند کرتا ہے۔'' میناکشی نے غور سے اس کے نقوش دیکھے تو اس نے مسکراتے ہوئے میناکشی کو دیکھا۔
''کیا تمہیں لگتا ہے کوئی مجھے ناپسند کر سکتا ہے۔'' وہ اترا کر بولی تو اب کی بار اس کی خود پسندی پر میناکشی نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا۔
''اس کا مطلب ہے وہ سیریس ہے تمہارے بارے میں۔''
''ابھی تو بس چند ملاقاتیں ہوئی ہیں۔ ایک ماہ پہلے تو ملی ہوں اس سے اور وہ ملاقاتیں بس فارمل سی تھیں۔ پر میں ان ملاقاتوں کو خاص بنانا چاہتی ہوں۔'' کہتے ہوئے عروج نے اپنے پونی میں قید بالوں کو کھول دیا تھا۔
''دھیان سے دوستی کرنا یہاں وفاداری قسمت سے ملتی ہے۔ قدم قدم پر دھوکا ہے آزاد ماحول ہے دوستی کے نام پر یہاں ہر حد پار ہو جاتی ہے ایک دوسرے کو استعمال کیا دل بھر گیا تو کسی اور کی تلاش میں نکل پڑے۔'' میناکشی کی نصیحت پر وہ ایسے مسکرائی جیسے کوئی بچکانہ بات پر مسکراتا ہے۔
''میں کون سا اس کے عشق میں گرفتار ہو گئی ہوں اور اس کے ساتھ گھر بسانا چاہتی ہوں یہ صرف دوستی ہے بس۔'' اس کے موبائل پر میسج کی ٹون بجی تو اس نے مسکرا کر موبائل دیکھا اور میسج ٹائپ کر کے موبائل بیگ میں ڈالا، خود کا تنقیدی جائزہ لے کر دوبارہ میناکشی کو دیکھا۔

"وہ مجھے لینے آیا ہے آج ہمارا ڈنر کے بعد مووی کا پلان ہے۔"

"چلو میں بھی دیکھوں تم نے کسے پسند کیا ہے۔" میناکشی اشتیاق سے اس کے ساتھ چلتی ہوئی بولی، شیشے کے دروازے سے سامنے کا منظر صاف نظر آ رہا تھا، جہاں سڑک پار اپنی کار سے ٹیک لگائے ایک دراز قد ہینڈسم لڑکا کھڑا تھا۔

"واہ یہ تو بہت ہینڈسم ہے۔" میناکشی اس کی شخصیت دیکھ کر متاثر ہوئی تھی اور اس ستائشی جملے کو عروج نے بڑے فخریہ انداز میں سنا جیسے اس کے ہینڈسم ہونے میں سارا کمال اسی کا ہے۔

"سنگل ہے۔" میناکشی اب حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بالکل سنگل۔" وہ اٹھلا کر بولی۔

"میری بھی دوستی کروادو۔" میناکشی نے مذاق کیا تھا لیکن عروج کو برا لگا تھا۔

"چلتی ہوں کل ملتے ہیں۔" وہ بے رخی سے کہہ کر دروازہ کھولتی اس کی طرف بڑھی جو کب سے اس کا انتظار کر رہا تھا عروج کو دیکھ کر اس نے مسکراتے ہوئے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا وہ ایک ادا سے مسکراتی ہوئی بیٹھی۔ دروازہ بند کر کے وہ گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ میناکشی تب تک ان کو دیکھتی رہی جب تک گاڑی اس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوگئی۔

☆☆☆

وہ فون سن کر واپس آئی تو حارب ایک ہاتھ میں جوس کا گلاس پکڑے جبکہ دوسرے ہاتھ میں موبائل پکڑے کچھ دیکھ رہا تھا اس کے کرسی گھسیٹنے پر اس نے سر اٹھایا اور مسکرا کر فون واپس رکھ دیا۔

"کیا ہوا سب ٹھیک ہے۔" حارب نے بغور اس کا چہرہ دیکھا وہ کچھ پریشان لگ رہی تھی۔

"ہاں میں ٹھیک ہوں۔" وہ زبردستی مسکرائی اور خود کو نارمل دکھانے کے لیے مینیو کارڈ اٹھالیا۔

"تم نے اب تک کچھ آرڈر نہیں کیا۔" اس نے نظریں اٹھا کر حارب کو دیکھا جو اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

"بس تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

"ہوں۔" عروج نے ہنکارا بھر کر ویٹر کو اشارہ کیا۔

"میرا خیال ہے ہم دوست ہیں اور جہاں تک مجھے سمجھ میں آرہا ہے تو تم پریشان لگ رہی ہو۔ مجھے اچھا لگے گا اگر تم مجھ سے اپنی پرابلم شیئر کرو گی۔" حارب کے کہنے پر عروج نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"میری بہن کا فون تھا بتا رہی تھی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں اور میری بڑی بہن کے گھر بھی کچھ پرابلم ہے اور وغیرہ وغیرہ۔"

"وغیرہ وغیرہ کا مطلب؟" حارب کے پوچھنے پر عروج نے منہ بنا کر اسے دیکھا جو مکمل طور پر اس کی طرف متوجہ وغیرہ وغیرہ کی تفصیل جاننا چاہتا تھا۔

"چھوٹی بہن کی فیس بھی جانی ہے۔ وہ پیسوں کی بات کر رہی تھی۔" عروج نے بات مکمل کرنے کے بعد ہونٹ بھینچ لیے جیسے مجبوراً یہ بات بتائی ہو۔

"ٹھیک ہے یہ سب پرابلم والی باتیں ہیں لیکن کیا بات تمہیں زیادہ پریشان کر رہی ہے اور کیا چیز تمہاری پریشانی دور کر سکتی ہے۔" حارب کے کہنے پر عروج نے گہرا سانس لیا۔

"پاکستان میں جا نہیں سکتی ابھی تین ماہ ہوئے ہیں اور پاکستان میں ہر مسئلے کا حل پیسے ہیں انہیں پیسوں کی ضرورت ہے جبکہ مجھے سیلری ملنے میں ابھی پندرہ دن ہیں۔" وہ الجھی الجھی نظروں سے سامنے رکھے اسٹیک کو دیکھنے لگی جسے ویٹر ابھی ابھی رکھ کر گیا تھا۔

"بس اتنی سی بات ہے۔ اکاؤنٹ نمبر بتاؤ اور اماؤنٹ بتاؤ میں ابھی ٹرانسفر کر دیتا ہوں۔"

حارث نے فون اٹھائے ہلکے پھلکے انداز میں اسے کہا تو عروج نے گھبرا کر اسے دیکھا ابھی حارب کو وہ کچھ عرصہ سے ہی جانتی تھی اور دوستی بھی اس نے محض پیسوں کے لیے کی تھی لیکن اس وقت اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھی سو تھوڑا بوکھلا کر اسے دیکھا۔

"نہیں حارب، تمہیں بتانے کا مقصد بالکل یہ نہیں کہ مجھے پیسے چاہئیں۔ تم نے پوچھا تو بس میرے منہ سے نکل گیا۔"

"میں نے کب کہا کہ تم نے سوچ سمجھ کر صرف مجھ سے پیسے لینے کے لیے یہ کہانی بنائی ہے۔ میں جانتا ہوں میں نے تمہیں بتانے کے لیے فورس کیا اور میں اپنی مرضی سے تمہاری ہیلپ کر رہا ہوں۔" عروج نے تیزی سے نفی میں ہلایا۔

"اس کی ضرورت نہیں میں مینج کر لوں گی۔"

"آئی نو۔ تم مینج کر لو گی لیکن ابھی مجھے بھیجنے دو جب تمہاری سیلری آئے تو مجھے واپس کر دینا، تم جانتی ہو پاکستان کے حالات کیسے ہیں وہاں اتنی مہنگائی ہے کہ لوگوں کا گزارا مشکل سے ہو رہا ہے جبکہ تمہاری امی بیمار ہیں۔ انہیں علاج کی ضرورت ہے اگر خدانخواستہ۔" آگے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"لیکن حارب، میری سیلری اتنی زیادہ نہیں مجھے روم کا رینٹ بھی دینا ہوتا ہے اور اس کے علاوہ کھانا پینا بھی تو میں ایک ساتھ تمہارے پیسے واپس نہیں کر سکوں گی۔ ہر ماہ کچھ رقم ادا کر دوں گی۔"

"ویسے میں نے تو تم سے کوئی تقاضا نہیں کیا تھا تم ہی ایٹی ٹیوڈ دکھا رہی ہیں۔" حارب کے کہنے پر عروج نے پہلی بار مسکرا کر دل سے اسے دیکھا۔

اسے وہ دنیا کا سب سے خوب صورت انسان لگا تھا۔

"لو چلے گئے۔" اس نے موبائل کی اسکرین اس کے سامنے کی جہاں ٹرانزیکشن کی تفصیل تھی عروج نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا۔

"اب کھانا شروع کریں مجھے بھوک لگی ہے۔" عروج کے مسلسل دیکھنے پر اس نے ابرو اچکا کر اسے کھانے کی طرف متوجہ کیا۔

"کیا تم سب کے ساتھ اتنے ہی مہربان رہتے ہو۔" عروج کو میرز کی بات یاد آئی کہ وہ اپنی گرل فرینڈ پر کھلا خرچ کرتا ہے تو نا محسوس انداز میں عروج کے لہجے میں جیلسی کی آمیزش شامل ہو گئی۔

"نہیں۔" اس نے گوشت کا ٹکڑا کانٹے میں پھنسا کر منہ میں ڈالا۔

"ہر کوئی اتنا خوش نصیب نہیں کہ حارب غیور اس پر اپنا پیسہ لٹائے۔"

"تو میں خوش نصیب ہوں۔" عروج کا دل جیسے بلیوں اچھلا۔

"آف کورس۔" حارب اب گوشت میں کانٹا دبائے چھری سے دوسرا پیس کاٹ رہا تھا۔

"تم نے کبھی اپنی فیملی کے بارے میں بتایا نہیں۔" عروج نے حارب سے سوال کیا۔

"تم نے آج سے پہلے کبھی پوچھا ہی نہیں۔" حارب کے کہنے پر وہ شرمندہ ہو کر مسکرا دی۔

"میری امی ابا اور میرا بھائی......"

"اور رشتے دار؟"

"ہاں میرے تایا ہیں، پھوپھو ہیں، ماموں، خالہ کافی بڑا خاندان ہے ہمارا۔"

"اچھا۔" عروج حیران ہوئی۔ "پاکستان نہیں گئے۔"

"پہلے ہر سال جاتا تھا اب تین چار سال سے نہیں گیا۔"
"تم اتنے کامیاب ہو، ہینڈسم ہو تو اب تک سنگل کیوں ہو۔" عروج نے اسے غور سے دیکھتے سوال کیا تو حارب نے مسکراتی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تم سوال کے ساتھ میری تعریف بھی کر رہی ہو شاید۔" اس کے شرارتی انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"شاید نہیں، میں واقعی تمہاری تعریف کر رہی ہوں۔" "تمہیں لگتا ہے کہ میری عمر نکل گئی ہے شادی کی۔"
"او، نہیں نہیں۔" عروج نے جلدی سے ہاتھ اٹھا کر اسے وضاحت دی۔
"میں صرف یہ کہہ رہی ہوں اتنے سال سے اس ملک میں تم اتنے کامیاب ہو کر اکیلے ہو؟ کیا کبھی کوئی لڑکی پسند نہیں آئی یا شادی تمہارے فیوچر پلان میں شامل نہیں۔" جب کچھ دیر حارب خاموش رہا تو عروج کو احساس ہوا آج وہ کچھ زیادہ ہی پرسنل ہو گئی ہے۔ اس کی دل کی کیفیت اچانک بدلی ہے پر اگلے کے دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے وہ اس بات سے انجان تھی۔
"سوری حارب، میں شاید زیادہ ہی پرسنل ہو گئی ہوں۔" حارب نے چونک کر عروج کا شرمندہ انداز دیکھا۔
"نہیں میں تمہارے سوال پر سوچ میں پڑ گیا تھا۔ واقعی اتنے سالوں سے کسی چہرے نے مجھے اتنا متاثر نہیں کیا کہ میں اس سے شادی کے بارے میں سوچوں۔ میری بہت سی گرل فرینڈز رہی ہیں لیکن ان کے آنے یا جانے سے میری زندگی میں کوئی فرق نہیں پڑا اور نہ ان سے مل کر مجھے لگا کہ وہ اتنی ضروری ہیں کہ انہیں زندگی کا حصہ یا زندگی کا ساتھی بنا لینا چاہیے۔"
"اور کیا ابھی تک وہ تلاش جاری ہے؟" عروج نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔
"میں کسی تلاش میں نہیں۔" حارب نے مسکرا کر کہا۔
"تو شادی نہیں کرنی تمہیں۔" وہ بھی مسکرائی۔
"کرنی ہے لیکن ابھی سوچا نہیں۔"
"ویسے بھی ہماری فیملی میں شادی فیملی کے اندر ہی کرتے ہیں۔ مطلب کزن میرج اور مجھے یہ سلسلہ بالکل پسند نہیں۔ بچپن سے جن چہروں کو دیکھتے آرہے ہیں انہی کو اب ساری زندگی دیکھو۔" اس کے بےزار انداز پر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"کیوں کوئی کزن اتنا حسین چہرہ نہیں رکھتی جو تمہارے دل میں اتر جائے۔" اس کی بات پر حارب کے چہرے پر گہری مسکراہٹ آئی تھی۔
"ہمارا خاندان اپنی خوب صورتی کے لیے جانا جاتا ہے۔ سب ایک سے بڑھ کر ایک ہیں لیکن بات پھر وہی میری سوچ کی اور سب سے بڑھ کر ابھی تک دل میں کوئی نہیں اتری اور یہاں قیام کے دوران میں جتنی بار بھی پاکستان گیا ہوں، بہت کم کسی سے ملاقات ہوئی ہے۔ سو پتا نہیں کوئی قاتل حسینہ وہیں چھپی ہو۔" اب کہ وہ بات کو مذاق کا رخ دے گیا تھا "خیر میری چھوڑو تم اپنی بتاؤ جب سے ملاقات ہوئی ہے کبھی تم نے اپنی فیملی کا ذکر نہیں کیا۔" اس کی بات پر عروج نے گہرا سانس لیا۔
"میرا تمہاری طرح کوئی لمبا چوڑا اسٹرونگ فیملی بیک گراؤنڈ نہیں۔ کراچی کی ایک مڈل کلاس فیملی سے میرا تعلق ہے۔ ابو کی ڈیتھ کو بھی دس گیارہ سال ہو گئے ہیں امی ہاؤس وائف ہیں اور ہم پانچ بہنیں ہیں دو کی شادی ہو چکی ہے۔ میں تیسرے نمبر پر ہوں اور مجھ سے چھوٹی دو اور بہنیں ہیں۔ اور زندگی کے وہی مسائل ہیں جو ہر مڈل کلاس فیملی کے ہیں جن کے سر پر مرد کا سایہ نہ ہو، میں نے ایم ایس سی کرنے کے بعد وہیں ایک فارماسوٹیکل کمپنی

میں جاب کر لی لیکن مہنگائی اتنی تھی کہ گزارہ مشکل ہو رہا تھا میری چھوٹی بہن بھی ایک اسکول میں جاب کرتی ہے۔ شام میں ٹیوشن دیتی ہے۔

لیکن یہ کافی نہیں تھا پھر کسی کو تو ہمت کرنی تھی رمیز نے مجھے مشورہ دیا کہ یہاں اپلائی کروں پہلے تو ہمت نہیں ہوئی لیکن پھر حوصلہ کر کے اپلائی کر دیا۔ زیادہ امید نہیں تھی کہ مجھے جاب مل جائے گی۔ لیکن شاید قسمت میں یہاں آنا لکھا تھا۔"

بات کے آخر میں وہ تھکے ہوئے انداز میں مسکرائی تو غور سے سنتے حارب نے ابرو اچکائے۔

"پہلی ملاقات میں جیسی تم مجھے لگی تھیں۔ تم اس سے مختلف ہو۔" اس کی بات پر عروج نے چونک کر اسے دیکھا۔

"میں پہلی ملاقات میں کیسی لگی تھی۔ پلیز سچ بتانا۔"

"میں ہمیشہ سیدھی بات ہی کرتا ہوں اس لیے میرے دوست کم ہیں۔" حارب نے مسکرا کر کہا۔

"بتاؤ نا پہلی ملاقات میں کیسی لگی تھی تمہیں میں۔" عروج کے لہجے میں تجسس کے ساتھ بے چینی تھی۔

"بولڈ۔" اس نے ایک لفظ میں جیسے اس کی ذات کو ڈیفائن کیا۔

"بولڈ۔" عروج نے دہرایا "کیونکہ میں نے خود فون کر کے تمہاری طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا۔" اب کے وہ سنجیدہ تھی۔

"شاید۔" حارب اس کا پھولا منہ دیکھ کر زیر لب مسکرایا۔

"ہاں شاید غلط کیا اپنے دل کی آواز سن کر...... انسان جتنا بھی ماڈرن ہو جائے خود کو لبرل کہے لیکن لڑکی کی پہل کو مرد ہمیشہ بے باکی مانتا ہے۔" عروج اچھا خاصا برا مان گئی تھی حارب کتنی دیر ہونٹ بھینچے اس کا ناراض چہرہ دیکھتا رہا جو اب اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

آخر کار وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا عروج نے ناراضی سے اسے دیکھا۔

"یار، تم لڑکیاں جتنا مرضی کہو ہمیں سیلف اوئیرنیس ہے ہمیں فرق نہیں پڑتا۔ سامنے والا بندہ ہمارے بارے میں کیا سوچتا ہے پر اگر ذرا سا نگیٹو بول دو بس ایگو ہرٹ ہو جاتی ہے، سیلف اوئیرنیس گئی بھاڑ میں۔" وہ مسلسل مسکرا رہا تھا اور اس کی بات اور مسکراہٹ پر عروج شدید خفت کا شکار ہوئی تھی۔

"بے فکر رہو میں بالکل تمہیں جج نہیں کر رہا مجھے بھی تم اچھی لگی تھی اسی لیے دوستی کی تھی اب جلدی سے اپنا کھانا ختم کرو۔ مووی کا ٹائم ہونے والا ہے۔" اس کے کہنے پر عروج سر جھٹک کر اپنی پلیٹ پر جھک گئی۔

☆☆☆

"اب کیسی طبیعت ہے تمہاری۔"

"میں ٹھیک ہوں امی۔" اس نے کافی کا گھونٹ لیا جبکہ نظریں کمپیوٹر اسکرین پر تھیں۔

"ٹھیک ہو تو پھر کھانس کیوں رہے ہو؟ اور آواز بھی بھاری ہے مطلب زکام ابھی بھی ہے۔" اتنی لمبی پیش گوئی پر سمیر نے ابرو اچکائے۔

"آپ کو میری بات پر یقین کیوں نہیں آتا امی، میں اب ٹھیک ہوں۔ بس تھوڑی سی کھانسی ہے اس کی میڈیسن لے رہا ہوں۔"

"فکر کیسے نہ کروں ماں ہوں تمہاری نظروں کے سامنے ہوتے تو بھی کچھ تسلی رہتی اب تو سات سمندر پار ہو، ساری رات اور دن بس یہی خیال رہتا ہے، پتا نہیں تم نے ٹھیک سے کھانا کھایا ہوگا بھی یا نہیں، بیماری میں تو تم ویسے بھی اتنے چڑچڑے ہو جاتے ہو پتا نہیں کسی نے پرہیزی کھانا بنا کر دیا ہو گا بھی یا نہیں۔"

اب کے ان کی آواز بھرا گئی تو میل پڑھتے سمیر نے گہرا سانس لیا اور نظریں اسکرین سے ہٹالیں۔

''میں سمجھتا ہوں امی آپ کو فکر ہے۔ پر میں ٹھیک ہوں آنٹی میرا بہت خیال رکھتی ہیں انکل ماریہ علیزہ سب میرے ساتھ بہت اچھے ہیں۔''

''اچھا۔'' وہ مسکرائیں۔ ''جب تم گئے تھے مجھے بالکل امید نہیں تھی تم وہاں رہو گے تمہاری آدم بیزاریت کا مجھے اندازہ تھا۔'' ان کی بات پر وہ ہنس پڑا تھا۔

''امید تو مجھے بھی نہیں تھی کہ میں کسی کے گھر کمفرٹیبل محسوس کروں گا جن کو میں ٹھیک طرح سے جانتا بھی نہیں۔ پر ان کے ساتھ اتنا دل لگ گیا ہے کہ اب اکیلے جا کر رہنے کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔'' اس کی بات پر سلمٰی کی مسکراہٹ گہری ہوئی تھی۔

''سیدھی طرح کہو علیزہ کو چھوڑ کے جانے کے خیال سے گھبراہٹ ہوتی ہے۔''

ماں کے کہنے پر وہ مسکرایا لیکن بولا کچھ نہیں۔

''آپ نے آنٹی سے بات کی تھی۔''

''ہاں کی تھی لیکن اس نے کہا وہ مشتاق بھائی سے بات کر کے بتائے گی۔'' ان کی بات پر اس کی مسکراہٹ سکڑی۔

''آپ کو کیا لگتا ہے وہ انٹرسٹڈ نہیں۔''

''نہیں مجھے ایسا بالکل نہیں لگا، پر بیٹا وہ لڑکی والے ہیں یوں ایک دم جواب تو نہیں دے سکتے۔'' سمیر نے اپنی پشت کرسی سے لگائی۔

''امی، انکل آنٹی تو اچھے خاصے اسٹریٹ فارورڈ ہیں تو اس ٹال مٹول کا مطلب۔''

''کیا پتا علیزہ انٹرسٹڈ نہ ہو۔'' ان کی بات پر ایک پل کے لیے وہ چپ کا چپ رہ گیا پھر بولا۔

''نہیں امی، مجھے ایسے نہیں لگتا۔ بلکہ میری اور اس کی بڑی اچھی انڈرسٹینڈنگ ہے۔ اگر وہ مجھے پسند نہ کرتی تو میری اتنی پرواہ نہ کرتی جب میں بیمار تھا اس نے میرا بہت خیال رکھا بقول آنٹی اتنی خدمت تو اس نے اپنے ماں باپ کی نہیں کی۔'' اس کی بات پر سلمٰی ہنس پڑی۔

''ہاں یہ بات تو فرح نے بھی مجھے کہی تھی اپنے لیے ایک انڈہ نہ ابالنے والی لڑکی سمیر کے لیے ناشتا بنا رہی تھی۔ وہ بھی اس کی پسند کا۔'' ان کی بات پر سمیر کے چہرے پر بڑی خوب صورت مسکراہٹ آئی۔

''تو پھر آپ خود بتائیں۔ اس کے دل میں میرے لیے فیلنگز ہیں تو ہی اس نے میری پرواہ کی۔''

''ہاں بیٹا، میں کب کسی بات پر اعتراض کر رہی ہوں اب فرح کوئی جواب دے تو نا۔''

''امی اب آپ یہی انتظار نہ کرتی رہیں کہ وہ آپ کو فون کریں آپ خود دوبارہ کریں۔ مجھے علیزہ بہت پسند ہے اور میں اس کے علاوہ کسی اور سے شادی نہیں کروں گا۔'' وہ دوٹوک انداز میں بولا تو سلمٰی اب کچھ پریشان ہوئیں۔

''سمیر، یہ رشتے زور زبردستی کے تو نہیں بیٹا، ہم تو راضی ہیں بس ان کے اشارہ کرنے کی دیر ہے ہم اسی وقت منگنی کی بات کرلیں گے لیکن اس سے پہلے میں دوبارہ فرح سے بات کروں۔ تم علیزہ کی رائے لو اگر وہ راضی ہے تو مسئلہ ختم۔''

ابھی وہ مزید کچھ کہتا کہ پرفیوم کی جانی پہچانی خوشبو اس نے اپنے اردگرد محسوس کی اور ساتھ ہی ہیل کی ٹک ٹک اس کے کیبن کے قریب آ کر رکی اس نے نظریں اٹھائیں اور بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

اس کے یوں دیکھنے اور حیران ہونے پر ایک دلفریب مسکراہٹ علیزہ کے چہرے پر آئی۔

”مجھے پتا تھا تم یونہی حیران ہو گے کیسا لگا میرا سرپرائز۔“ وہ کہتی ہوئی اس کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گئی۔

”پلیزنٹ سرپرائز تھا۔“ وہ ابھی بھی فون کان سے لگائے ہوئے تھا۔

”میں کلب جا رہی تھی سوچا اگر تم فری ہو تو تم بھی ساتھ چلو۔ ویسے تمہارے آفس آورز ختم ہو گئے ہیں نا۔“ اس نے کلائی پر بندھی خوب صورت رسٹ واچ پر نظر ڈالی جہاں پانچ بج رہے تھے۔

”ہاں میرا کام ختم ہو گیا ہے بس، دو میلز سینڈ کرنی ہیں۔“ کہہ کر وہ تیزی سے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا جبکہ دوسری طرف خاموشی سے سنتی سلمٰی کو اب کچھ کچھ اندازہ ہو گیا تھا آنے والی کون ہے۔

”سمیر کون ہے؟“ کچھ بھی کہنے سے پہلے انہوں نے کنفرم کرنا ضروری سمجھا۔

”امی، علیزہ ہے۔“ اس نے کہتے ہوئے مسکرا کر علیزہ کو دیکھا۔

”اچھا میری بات تو کرواؤ۔“

”امی ہیں۔“ سمیر نے اپنا فون علیزہ کی طرف بڑھایا۔

”ہیلو آنٹی کیسی ہیں آپ۔“

”میں ٹھیک ہوں بیٹا تم کیسی ہو۔“

”میں بالکل ٹھیک ہوں۔“

”میں نے دو تین دفعہ گھر فون کیا۔ فرح سے بات ہوئی لیکن اتفاق ہی سمجھو جب بھی فون کیا تم سے بات نہیں ہو سکی۔“

”بس آنٹی، ٹائمنگ کی وجہ سے ایک تو پاکستان اور یہاں دن رات کا فرق ہے، دوسرا جس ٹائم آپ نے کال کی ہو گی میں آفس ہوں گی۔“

”ہاں فرح نے کہا تھا کہ تم آفس گئی ہو دراصل بیٹا میں نے تمہارا شکریہ ادا کرنا تھا۔ تم نے سمیر کا اتنا خیال رکھا، پردیس میں میلوں فاصلے کی وجہ سے انسان اتنا مجبور ہو جاتا ہے کہ اپنوں کی تکلیف یا خوشی میں شامل ہی نہیں ہو پاتا۔ جب سمیر گیا تھا میں بڑی پریشان تھی، اکیلا کیسے رہے گا کیونکہ اسے کام کرنے کی عادت ہی نہیں تھی میرا اور بہنوں کا لاڈلا تھا ساری چیزیں پہلے سے تیار ملتیں۔ ہم نے تو بڑی کوشش کی کہ یہیں جاب کر لے لیکن ضدی بھی بہت ہے اسے تو بس یہی تھا باہر کے ملک ہی جا کر جاب کرنی ہے اور پھر قسمت بھی اس کی اللہ نے رزق جہاں لکھا ہو اس نے دو تین جگہ انٹرویو دیا تھا پھر کینیڈا اسے کال آ گئی۔“

سمیر نے گہرا سانس لے کر پہلو بدلا اس کی امی لمبی کہانی لے کر بیٹھ گئی تھیں۔

”آنٹی، آپ کو سمیر کی طرف سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں وہ بالکل ہمارے فیملی ممبر کی طرح ہے۔“

”یہ تو تم لوگوں کی ذرہ نوازی ہے بیٹا۔“ ذرہ نوازی پر اس نے الجھ کر سمیر کو دیکھا جو اس کے چہرے کی الجھن دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

”تھینکس بول رہی ہیں۔“ سمیر قدرے آہستگی سے بولا۔

”آنٹی، ذرہ نوازی کی ضرورت نہیں۔“

”سمیر بہت ذکر کرتا ہے تمہارا بہت تعریف کرتا ہے تمہاری۔“ سلمٰی کے کہنے پر علیزہ نے شرارتی انداز میں ابرو اچکا کر سمیر کو دیکھا۔

”تمہیں سمیر کیسا لگتا ہے۔“ سلمٰی کی آواز میں شرارت اور مسکراہٹ کو صرف سمیر نے محسوس کیا علیزہ ان کے سوال میں چھپے معنی کو شاید سمجھ نہیں سکی اس لیے جب بولی تو لہجہ نارمل تھا۔

”آنٹی سمیر بھی بہت اچھا ہے۔ بس تھوڑا لیزی ہے۔“ آخر میں وہ شرارت سے بولی تو سلمٰی ہنس پڑیں۔

"مجھے پتا ہے سمیر اچھا ہے میں تو تمہاری رائے جاننا چاہتی تھی کہ تمہیں کیسا لگتا ہے۔"

"مجھے بھی اچھا لگتا ہے۔" علیزہ کا انداز سادہ تھا لیکن ان ماں بیٹے نے اسے اپنے انداز میں لیا تھا۔

"اوکے آنٹی، آپ سے پھر بات ہوگی، ابھی ہمیں ایک جگہ جانا ہے۔"

"ہاں ہاں بیٹا، ضرور جاؤ فرح اور مشتاق بھائی کو میرا اسلام دینا۔"

"شیور آنٹی۔"

"بائے۔" کہہ کر اس نے موبائل سمیر کو پکڑا دیا۔

"سوری امی زیادہ ہی بولتی ہیں۔"

"میرے خیال میں سب ممیاں اتنا ہی بولتی ہیں۔" اٹھتے ہوئے وہ اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈال رہی تھی سمیر نے بغور اس کے خوب صورت سراپے کو دیکھا جو لائٹ گرین شرٹ اور بلیک ٹراؤزر میں نمایاں ہو رہا تھا۔

"اب چلو گے بھی یا موڈ نہیں۔" اسے یونہی بیٹھا دیکھ کر اس نے ابرو اچکائے تو سمیر جلدی سے اپنی جیکٹ اور فون اٹھائے کھڑا ہوا اور اس کے ساتھ چلتا گاڑی کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

کلب کے مخصوص حصے میں پہنچ کر اس نے متلاشی نظروں سے اردگرد کا جائزہ لیا اور کچھ فاصلے پر اسے فرقان نظر آ ہی گیا۔ فرقان نے بھی اسے دیکھ لیا تھا اور ہاتھ ہلا کر اسے ٹیبل کی طرف آنے کا اشارہ کیا تو وہ مسکرا کر اس کی طرف بڑھی جبکہ فرقان نے کچھ الجھ کر سامنے گرم جوشی سے اشارہ کرتے اس لڑکے کو اور پھر مسکرا کر اسی طرف ہاتھ ہلاتی علیزہ کو دیکھا۔

علیزہ کو آگے بڑھتے دیکھ کر وہ بھی اس کے پیچھے چلنے لگا۔ علیزہ کو آتا دیکھ کر فرقان کھڑا ہو گیا اور اس کے قریب پہنچ کر علیزہ اس کے گلے لگی۔

"کیسے ہو۔"

"میں تو ٹھیک ہوں تم اپنی بتاؤ۔ کہاں غائب ہو۔" فرقان نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا۔

"میں تو یہیں ہوں بس تھوڑا بزی تھی۔" اس سے پہلے فرقان مزید کوئی سوال کرتا اس کی نظر علیزہ کے قریب آ کر کھڑے سمیر پر پڑی تو اس نے سوالیہ نظروں سے علیزہ کو دیکھا۔

"یہ سمیر ہے۔"

"میرا کزن۔ اور سمیر یہ فرقان ہے۔ میرا بیسٹ فرینڈ۔"

"خوشی ہوئی تم سے مل کر سمیر۔" فرقان نے مصافحے کے لیے ہاتھ اس کی طرف بڑھایا۔

"مجھے بھی۔" جواباً سمیر نے بھی مسکرا کر اس کا ہاتھ تھاما ان کے بیٹھتے ہی ویٹر ڈرنک لے کر آ گیا فرقان شروع سے ہی باتونی اور ہنس مکھ طبیعت کا مالک تھا اسے کسی سے بھی دوستی کرنے میں چند لمحے لگتے تھے۔ ابھی بھی ڈرنک پینے کے دوران سمیر سے اچھا خاصا فرینک ہو چکا تھا، فون کی بیل پر وہ تینوں ایک ساتھ خاموش ہوئے تھے، فون سمیر کا آیا تھا اس نے جلدی سے فون جیب سے نکالا جہاں اس کی بہن کی کال آ رہی تھی وہ ایکسکیوز کر کے اٹھ گیا۔ تو فرقان نے ابرو اچکا کر علیزہ کو دیکھا۔

"کیا۔" جواباً اس نے بھی ابرو اچکائے۔

"یہ اچانک کہاں سے کزن ٹپک پڑا؟"

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

اُمِ ہانی

اور کوئی حل نہیں

گرمی میں شرابور ہوتی وہ سالن کے ساتھ ساتھ روٹیاں پکا کر کچن سے نکلی تو سامنے ہی امی کے کمرے کا پنکھا اور لائٹ آن دکھائی دیں اور خود امی لاؤنج میں بیٹھی مزے سے ٹی وی دیکھ رہی تھیں۔ فشار خون بلندی کی اعلیٰ ترین سطح پہ پہنچ گیا۔ اسے لگا کہ اب اس کا پیمانہ لبریز ہوا اور دماغ پھٹا ہی پھٹا۔ جلدی سے کمرے میں جا کر اس نے ٹھک ٹھک بٹن بند کیے اور دو تین گہرے سانس لیے۔ اب غصہ کہیں تو نکالنا ہی تھا۔ ابھی اسی حالت میں امی کے سامنے چلی جاتی اور منہ کھل جاتا تو بہت برا ہو جاتا اسی لیے موبائل اٹھایا اور عاصم کو میسج کر دیا۔

"پچھلے مہینے کا بل آپ کے سامنے ہی ہے نا اور امی جب سے آئی ہیں وہی وتیرہ کہ جس کمرے سے نکلتی ہیں، پنکھا آن، لائٹ آن چھوڑ دیتی ہیں۔ میں یہاں بچت کرتے کرتے سارا دن ایک کمرے میں بیٹھنے کے چکر میں ان کے پیچھے پیچھے پھرتی ہوں کہ ایکسٹرا پنکھا نہ چلانا پڑے۔ کچن کی کھڑکیاں کھول دیتی ہوں کہ باہر سے لائٹ آتی رہے۔ دن میں دو تین بار وقفے وقفے سے پانی کے ڈول خود پہ انڈیل لیتی ہوں کہ ٹھنڈک کا احساس رہے اور پنکھا نہ چلانا پڑے اور یہ ہیں کہ جس کمرے، باتھ روم سے نکلتی ہیں، لائٹ آن، پنکھا آن چھوڑ دیتی ہیں۔ اب میں سارے کام چھوڑ کر ان کی چوکیداری تو نہیں کر سکتی۔"

عاصم نے فوراً سے میسج دیکھا اور ساتھ ہی ریپلائی کیا۔

"میں آ کر بات کرتا ہوں۔" دل کی بھڑاس نکال کر اب کچھ سکون ملا تھا۔ موبائل رکھا اور گرمی بھگانے کے لیے شاور لینے چلی گئی۔

یہ پہلی بار نہیں ہوا تھا کہ جب وہ سو کر اٹھی تو کمرے کا پنکھا یا باتھ روم کی لائٹ آن ملی۔ جب کچن سے باہر آئی کوئی نہ کوئی فالتو لائٹ جلتی دکھائی دی۔ کتنی بار عاصم نے بھی یہ سب نوٹ کیا۔ طریقے سے امی کو سمجھایا بھی کہ بجلی کے بل اتنے زیادہ آ رہے ہیں کہ میری آدھی تنخواہ ان ہی کی ادائیگی میں صرف ہو جاتی ہے اس لیے احتیاط سے کام لیا کریں لیکن امی اس وقت تو ہاں ہاں بڑے زور شور سے کر دیتیں اور بعد میں بھول بھال جاتیں۔

مہینے بعد جو بجلی کا بل آیا تو اس نے دونوں میاں بیوی کے چاروں طبق روشن کر دیے۔ بچوں کی عید کے کپڑوں کے لیے جو ایک عرصے سے وہ پیسے جمع کر رہی تھی، سب بل کی نذر ہو گئے۔

شام کو جب عاصم گھر آیا تو فاطمہ بچوں کو پڑھانے، اپنے کمرے میں لے گئی کیونکہ — امی کا ٹی وی کبھی بند نہیں ہو سکتا تھا۔ اور ٹی وی چلنے کی صورت میں وہ کیسے بچوں کو اسی کمرے میں پڑھانے بٹھا سکتی تھی۔ مجبوراً الگ کمرے کی لائٹ اور پنکھا چل رہا تھا۔

"امی جی! میں آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ بجلی بہت مہنگی ہو چکی ہے۔ مقررہ یونٹ سے اوپر ایک یونٹ بھی جائے تو بل ڈبل سے زیادہ آ جاتا ہے۔ میری آدھی تنخواہ بجلی کا بل ادا کرنے میں جا رہی ہے اور باقی آدھی، مکان کے کرائے اور بچوں کی اسکول فیس میں نکل جاتی ہے۔ باقی سارے خرچ فاطمہ اپنی سلائی کی کمائی سے پورے کرتی ہے۔ ہم بہت

کھینچ تان کر گزارا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ نہ وہ محنت کر سکتی ہے نہ ہی میں۔ بجلی اسی طرح استعمال ہوتی رہی تو ایسے تو ہم بہت مشکل میں پڑ جائیں گے۔ سیونگز کے نام پہ کچھ نہیں ہے ہمارے پاس البتہ بجلی کا بل ادا کرنے کے لیے، قرض ضرور لینا پڑ جائے گا۔ تھوڑا دھیان سے بجلی استعمال کریں۔ غیر ضروری بجلی بند کر دیا کریں۔"

عاصم نے علیحدہ سے بٹھا کر امی کو سمجھایا لیکن بیٹے کا، پیار سے سمجھانا بھی اس قدر برا لگا کہ انھوں نے اسی رات چھوٹی بیٹی کو فون کیا جو اسی شہر

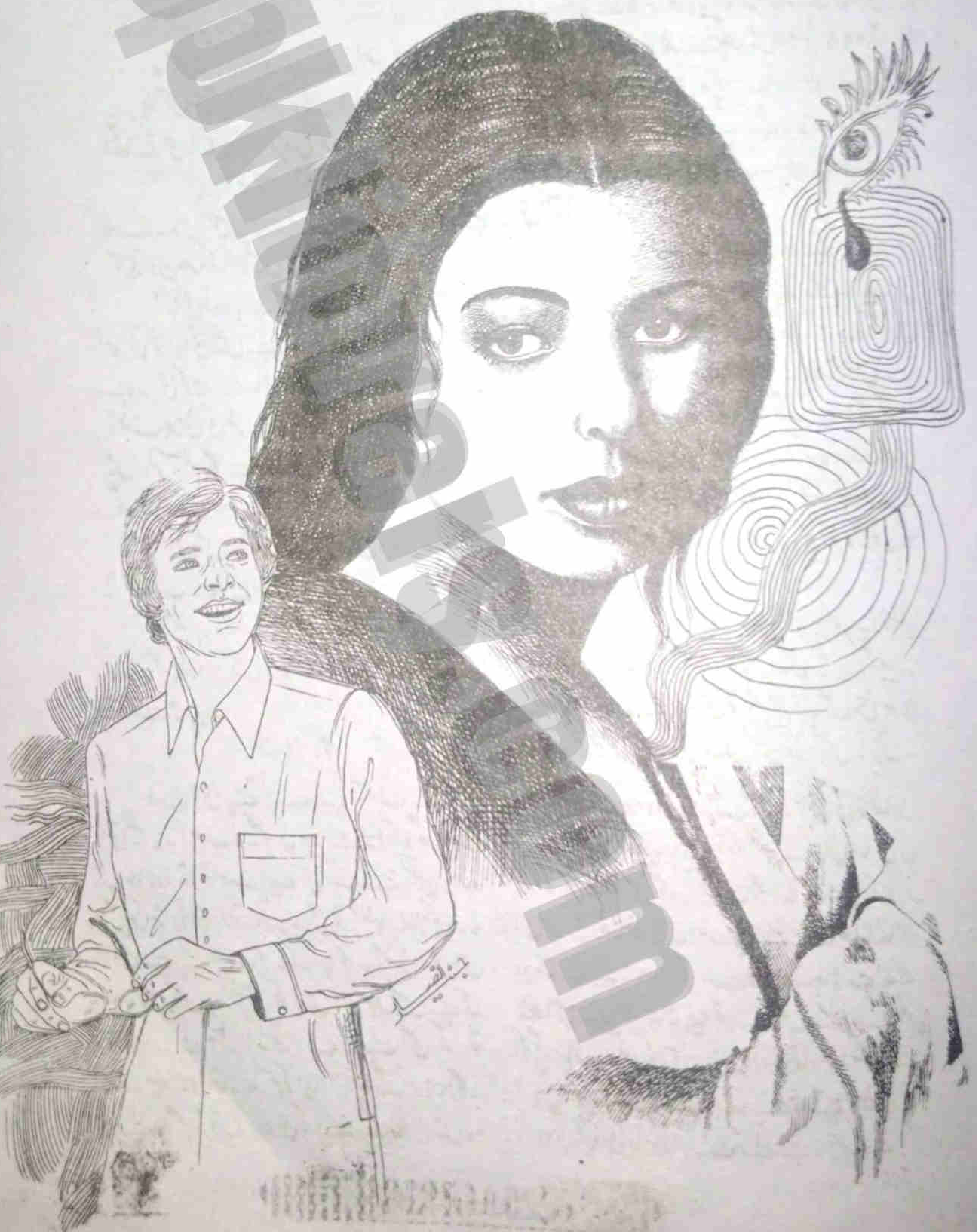

میں تھی کہ مجھے آ کر لے جاؤ۔

نجانے امی نے کیا کیا کہا تھا کہ اگلے ہی دن عذرا، اپنے شوہر کے ساتھ غصے سے بھری آئی اور کچھ کھائے پیے بنا ماں کو ساتھ لیا اور چلی گئی۔ فاطمہ نے بہت روکا کہ عاصم کے آنے کا انتظار تو کر لیں لیکن کسی نے نہ سنی اور یہ جا وہ جا۔

عاصم شام کو لوٹا تو امی کے اس طرح چلے جانے پہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ بہن کو کال ملائی تو اس نے کال اٹھاتے ہی باتیں سنانا شروع کر دیں۔

”تمہیں شرم نہیں آئی، امی کو یہ سب کہتے ہوئے۔ ماں تمہیں بہت بھاری محسوس ہونے لگی ہے کہ دو دن بٹھا کر کھلا نہیں سکتے۔“

”باجی! وہ بات نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میری تنخواہ اتنی نہیں ہے۔ گھر کا آدھا خرچا فاطمہ چلاتی ہے۔ امی کو میرے مالی حالات کو سمجھنا چاہیے۔ میں آصف بھائی کی طرح بہت نہیں کما رہا، نہ میرے گھر میں سولر سسٹم لگا ہے اور نہ ہی کمپنی کی طرف سے مفت گھر میں رہ رہا ہوں۔“

”بس بس عاصم۔ میں اپنی ماں کو خود رکھ لوں گی۔“ کھٹاک سے فون بند۔

عاصم اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ شاید وہ ہی غلط تھا جو ماں کو چند دن نہیں رکھ سکا۔ عجیب سے پچھتاوے نے اسے گھیر لیا۔

☆☆☆

خدیجہ امی پہلے بڑے بیٹے آصف کے پاس رہتی تھیں۔ آصف کو محکمے کی وجہ سے بڑا کھلا گھر مفت میں ملا ہوا تھا تو سب ایک ہی جگہ رہتے لیکن جب عاصم کی شادی کا وقت قریب آیا تو عظیمہ بھابی نے شادی سے پہلے ہی صاف کہہ دیا کہ عاصم کی فیملی اس مکان میں نہیں رہ سکتی۔ گھر میں اتنی جگہ نہیں ہے کہ دو بھائیوں کی فیملی اکٹھے رہے۔ ویسے بھی گھر تو آصف کو ملا ہوا تھا۔ عاصم کو اپنا سسٹم الگ کرنا ہوگا۔ اسی لیے عاصم شروع سے ہی کرائے کے مکان میں رہ رہا تھا۔

خدیجہ بیگم نے آصف کے ساتھ رہنے کو ہی ترجیح دی تھی کہ ان کو پوتوں کے ساتھ انسیت تھی، دل لگا رہتا تھا۔ سو فاطمہ اور عاصم شروع سے الگ رہے اور عاصم کی کم آمدنی کی وجہ سے دونوں میاں بیوی نے ایک دوسرے کا ساتھ دیا، تاکہ معاملات بہتری کے ساتھ چل سکیں۔ فاطمہ نے گھر میں سلائی کا کام شروع کر دیا تاکہ کچھ خرچے وہ پورے کر سکے۔ خدیجہ بیگم کبھی کبھار ایک آدھ دن کے لیے رہنے آ جاتیں اور بطور مہمان ہی ٹریٹ کی جاتیں۔ اسی لیے سب اچھا ہی لگتا تھا۔

وقت گزرتا رہا۔ عاصم کے دو بچے ہو گئے اور آصف کے بچے اب جوان ہو چلے تھے۔ ایک ہی کمرے میں سب کو رکھنا مشکل ہو گیا۔ بڑے دونوں لڑکوں کو اب الگ کمرہ دینا تھا تاکہ وہ بہنوں سے الگ رہ سکیں۔ اس سب کے لیے الگ کمرہ درکار تھا۔

خدیجہ بیگم کے زیر استعمال پورا کمرہ تھا۔ دونوں میاں بیوی کا خیال تھا کہ امی بچیوں کے ساتھ ان کے کمرے میں شفٹ ہو جائیں اور ان کا کمرہ لڑکوں کو دے دیا جائے۔

خدیجہ بیگم نے اتنا سن کر ہی آسمان سر پہ اٹھا لیا اور سامان باندھ کر عاصم کے ہاں چلی گئیں۔ آصف نے بہتیرا کہا کہ ماں، ابھی تو ہم صرف حل ہی سوچ رہے تھے۔ آپ واپس چلیں لیکن امی نہیں مانیں۔

تب سے وہ اسی گھر میں تھیں۔ لیکن تختی فاطمہ کی شروع ہو گئی۔ ایک دو دن آ کر ٹھہرنے والی ساس کی تو آؤ بھگت ہو سکتی تھی لیکن اب ہمیشہ آ کر رہنے والی کو اسی طرح رکھنا تھا جیسے وہ رہتے تھے، وہی کھانا تھا جو وہ کھاتے تھے۔ وہاں آصف بھائی کے حالات اچھے تھے اسی لیے کھلا کھانا پینا تھا۔ انہوں نے سولر سسٹم لگا کر سارے گھر کو اسی پہ ڈال رکھا تھا، سو نہ بجلی کے بل کی فکر نہ کہیں آنے جانے کا رونا۔ سہولت ہو تو آسودگی خود ہی راستہ دیکھ لیتی ہے۔

آصف کے گھر تو خدیجہ امی نے کھل کر کھایا پیا، بجلی گیس استعمال کی اور یہاں آ کر اب وہی عادت اپنانے پہ کبھی بیٹے کی طرف سے روک ٹوک کبھی بہو کا منہ اترا ہوا۔ ویسے تو عاصم بہت آرام سے سمجھاتا لیکن انہیں یہ بھی برا لگتا کہ بیٹے کو ماں کا خرچا اٹھانا، پہاڑ اٹھانے جیسا لگ رہا ہے۔ وہ چھوٹے بیٹے کے حالات نہیں سمجھ رہی تھیں جو کرائے کے گھر میں رہتا تھا، آمدن محدود تھی اور ذمہ داریاں بہت۔ وہ بس آصف سے اس کا موازنہ کرتیں کہ اس گھر میں وہ ایسے رہتی تھیں تو یہاں ایسے کیوں۔؟

☆☆☆

عذرا کے شوہر احمد کا ایک چھوٹا سا کاروبار تھا۔ گھر اپنا تھا اسی لیے ایک پورشن کرائے پہ چڑھا رکھا تھا۔ صرف ایک سسر ہی تھے جو اکلوتے پوتے کے کمرے میں ہی ہوتے تھے۔ گیسٹ روم فارغ ہی تھا اسی لیے خدیجہ بیگم کو وہاں ٹھہرایا گیا۔ ماں کی خدمت حتی المقدور کی۔ سسر نے بھی نہیں روکا ٹوکا کہ مہمان آئی ہوئی ہیں لیکن وہی مہمان جب مہینے سے زیادہ ٹھہرا رہا تو سسر کے بھی ماتھے پہ بل پڑنے لگے۔

خدیجہ امی نے یہاں بھی وہی طور طریقے رکھے جن کی وہ عادی تھیں۔ کبھی کمرے سے نکلتے ہوئے پنکھا چلتا چھوڑ دیا تو کبھی باتھ روم کی لائٹ۔ کبھی کچھ پکا کر چولہا آن چھوڑ دیا۔ کبھی باتھ روم تو کبھی کچن کا نلکا کھلا پڑا ہے اور ٹنکی خالی۔ اور سارا سارا دن ٹی وی تو آن رہتا ہی تھا۔

عذرا بیٹی تھی، ایسی باتوں پہ ماں کا پردہ رکھ لیتی لیکن اس کے سسر کیوں برداشت کرتے۔ جب بھی ایسی صورت حال دکھائی دیتی تو آواز بلند کرتے۔

''یہ لائٹ کیوں آن ہے۔ بجلی مفت کی ہے کیا۔۔؟'' ٹھک ٹھک بٹن بند کیے اور بڑبڑاتے ہوئے یہ جا وہ جا۔

''میرا بیٹا بہت محنت سے کماتا ہے۔ کچھ دھمیان سے بجلی خرچ کرو۔'' سناتے وہ عذرا کو تھے لیکن سنانا تو خدیجہ امی کو مقصود تھا۔

''چولہا کیوں جل رہا ہے۔ گیس پہلے ہی اتنی کم آتی ہے اور بل ٹربل آ جاتا ہے۔ احتیاط کیوں نہیں کرتے۔'' عذرا ایسے میں بڑا شرمندہ ہوتی۔

''امی! تھوڑا احتیاط کیا کریں۔'' ایک آدھ بار اس نے کہا تو خدیجہ امی اسے حیرت سے تکنے لگیں۔

اس دن جب مہینے کا بل آیا تو سسر صاحب نے بیٹے کے ساتھ بیٹھ کر الگ میٹنگ کی جس کا نتیجہ رات کمرے میں جا کر احمد نے عذرا کو صاف الفاظ میں کہہ دیا۔

''اپنی امی کو سمجھاؤ عذرا! وہ کسی محل میں رہنے نہیں آئیں۔ جس حساب سے وہ بجلی، گیس اور پانی استعمال کر رہی ہیں، یہ سہولیات کو ضائع کرنا ہے۔ بل ہماری حیثیت سے باہر جا چکا ہے۔ ایک تو یوں بھی ان کی وجہ سے خرچا بڑھ گیا ہے۔ اس پہ یہ کہ وہ احتیاط سے کام بھی نہیں لیتیں۔ تمہاری امی ہونے کی وجہ سے وہ قابل احترام ہیں لیکن میں ابا جی کو کیا جواب دوں۔؟ وہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ مانا کہ بوڑھا بندہ بھول جاتا ہے لیکن ابا جی بھی تو تمہارے سامنے کی مثال ہیں۔ کتنا احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی لاپروائی نہیں کی کیونکہ انہیں احساس ہے کہ بیٹا کس محنت سے کماتا ہے۔ کوئی کام نہیں کر سکتے تو سارا دن گھر کی چیزوں کو ہی چیک کرتے رہتے ہیں کہ کہیں کچھ ٹوٹ تو نہیں گیا، کچھ غیر ضروری تو نہیں ہو رہا۔ انہیں ہمارا احساس ہے۔ آنٹی کو احساس ہی نہیں کہ کسی پہ وہ کتنا بوجھ ڈال رہی ہیں۔ عاصم اور فاطمہ اپنی جگہ ٹھیک تھے نا پھر۔ تم یونہی انہیں برا بھلا کہتی رہیں۔''

عذرا کے پاس جواب میں کہنے کو کچھ نہیں تھا۔ احمد اپنی جگہ درست تھے ــــــ امی کی عمر کوئی ایسی نہیں تھی کہ وہ اتنی سی بات بھول جاتیں کہ کوئی شے

استعمال کے بعد بند بھی کرنا ہوتی ہے۔ بس مزاج میں لاپرواہی اور غیر ذمہ داری تھی۔ احساس کی کمی تھی۔

اگلے دن اس نے امی کو اپنے کمرے میں بٹھا کر طریقے سے سمجھایا۔

"امی! پلیز برا مت منایے گا۔ بیٹی ہوں اس لیے یہ سب کہنے جا رہی ہوں کہ بیٹی کی باتیں ماں کو ویسی بری نہیں لگتیں جیسی بہو کی لگتی ہیں۔ یہ آپ کی بیٹی کا گھر ہے، آپ جب تک چاہیں یہاں رہ سکتی ہیں لیکن ہمیشہ تو نہیں رہ سکتیں۔ میں نے عاصم کو برا بھلا کہا لیکن عاصم اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ ضرورت تھوڑا آپ کو سمجھنے کی ہے۔ جب بچے چھوٹے ہوتے ہیں تو والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ کاش بچے ان کی مجبوریاں، ان کے مسائل سمجھ سکیں لیکن اپنے بچپنے کی وجہ سے وہ ان مسائل کو نہیں سمجھ سکتے۔ جب بچے بڑے ہوتے ہیں تو وہ والدین کے لیے یہی چاہتے ہیں کہ وہ ان کے مسائل کو سمجھیں، تب والدین ویسے ہی نا سمجھی کا مظاہرہ کرنے لگتے ہیں جیسے بچے کرتے تھے۔ آپ بہت لاپرواہی سے بجلی پانی کا استعمال کرتی ہیں اور یہ میں نے پچھلے ایک مہینے میں نوٹ کیا ہے۔ اس بے چارے کے حالات تو یوں بھی اتنے اچھے نہیں ہیں۔ آپ آصف بھائی سے اس کا موازنہ مت کریں۔ آصف بھائی بلوں اور مکان کے کرائے کی ادائیگی سے آزاد ہیں۔ پھر تنخواہ ان کی ٹھیک ہے۔

عاصم کے حالات تو مجھ سے بھی چھپے ہیں۔ آپ کے بیٹا بہو دل کے برے نہیں ہیں لیکن حالات کے مارے ہوئے ہیں اور جب انسان مالی لحاظ سے تنگ ہو تو اس کے رویے میں تھوڑی تنگی آ ہی جاتی ہے۔ اگر آپ اپنی عادات کو بدل نہیں پا رہی ہیں تو پھر سب سے بہتر یہی ہے کہ آپ آصف بھائی کے گھر واپس چلی جائیں اور بچیوں کے ساتھ مل کر رہیں۔ ان کی بھی مجبوری ہے کہ لڑکے اب بڑے ہو رہے ہیں، بہنوں کے ساتھ ان کے کمرے میں تو نہیں سوئیں گے۔ انھیں الگ کمرہ چاہیے تو ظاہر ہے وہ کمرہ آپ کا ہی ہوگا۔ ویسے بھی یمنیٰ، فرینہ آپ کی پوتیاں ہیں، ابھی چھوٹی ہیں تو اکیلے سوتے ہوئے ڈرتی بھی ہوں گی۔ اچھا ہے کہ آپ رات میں ان کے ساتھ ہوں۔ اس میں ناراض ہو کر گھر چھوڑنے والی تو بات نہیں تھی۔ آپ سمجھ رہی ہیں نا امی۔۔؟"

امی خاموشی سے سنتی رہیں اور آخر میں سر ہلا دیا۔ بیٹی کہہ رہی تھی تو برا نہیں لگ رہا تھا۔ ان ہی باتوں پہ بہو کا پھولا ہوا منہ ہی بہت برا لگتا تھا حالانکہ وہ کچھ کہتی نہیں تھی۔ پھر اپنا ہی بیٹا سمجھانے بیٹھا تو وہ بہو کی پڑھائی پٹی لگی تھی۔ یہ نہیں سوچا کہ ان کا غیر ذمہ دارانہ رویہ ان دونوں کے لیے کتنے مسائل کھڑے کر رہا ہے۔

"تم آصف کو فون کر دو کہ مجھے آ کر لے جائے۔" وہ اٹھنے لگیں۔

"امی پلیز، ناراض مت ہوں۔ جو کہا ہے آپ کی بہتری کے لیے کہا ہے۔" وہ جلدی سے ماں سے لپٹ گئی۔ اس کی مجبوری تھی۔ گھر کا ماحول خراب ہو رہا تھا۔

"بیٹی سے ماں ناراض نہیں ہوا کرتی۔ ناراض ہو کر نہیں جا رہی، بس یہ سیکھ کر جا رہی ہوں کہ اب بچوں کے ساتھ رہنا ہے تو ان کے مسائل سمجھتے ہوئے مجھے ہی خود میں تھوڑی تبدیلی لانا ہو گی۔ اور کوئی حل نہیں ہے۔"

عذرا کا ہاتھ نرمی سے تھپتھپا کر وہ باہر چلی گئیں۔ عذرا نے سکھ کا سانس لیا اور آصف بھائی کو فون کرنے لگی۔

حنا جاوید

معیار

عروج نے رسٹ واچ میں ٹائم دیکھا۔ ڈیڑھ بج گیا۔ آج اتنی دیر ہوگئی۔ ابھی تک کاشان نہیں آیا تھا۔ کیا کروں؟ پیدل جاؤں؟ گرمی کا عالم۔ عبایا کے اندر تمام کپڑے پسینے سے تر بتر تھے۔ اسکارف، حجاب سب کچھ

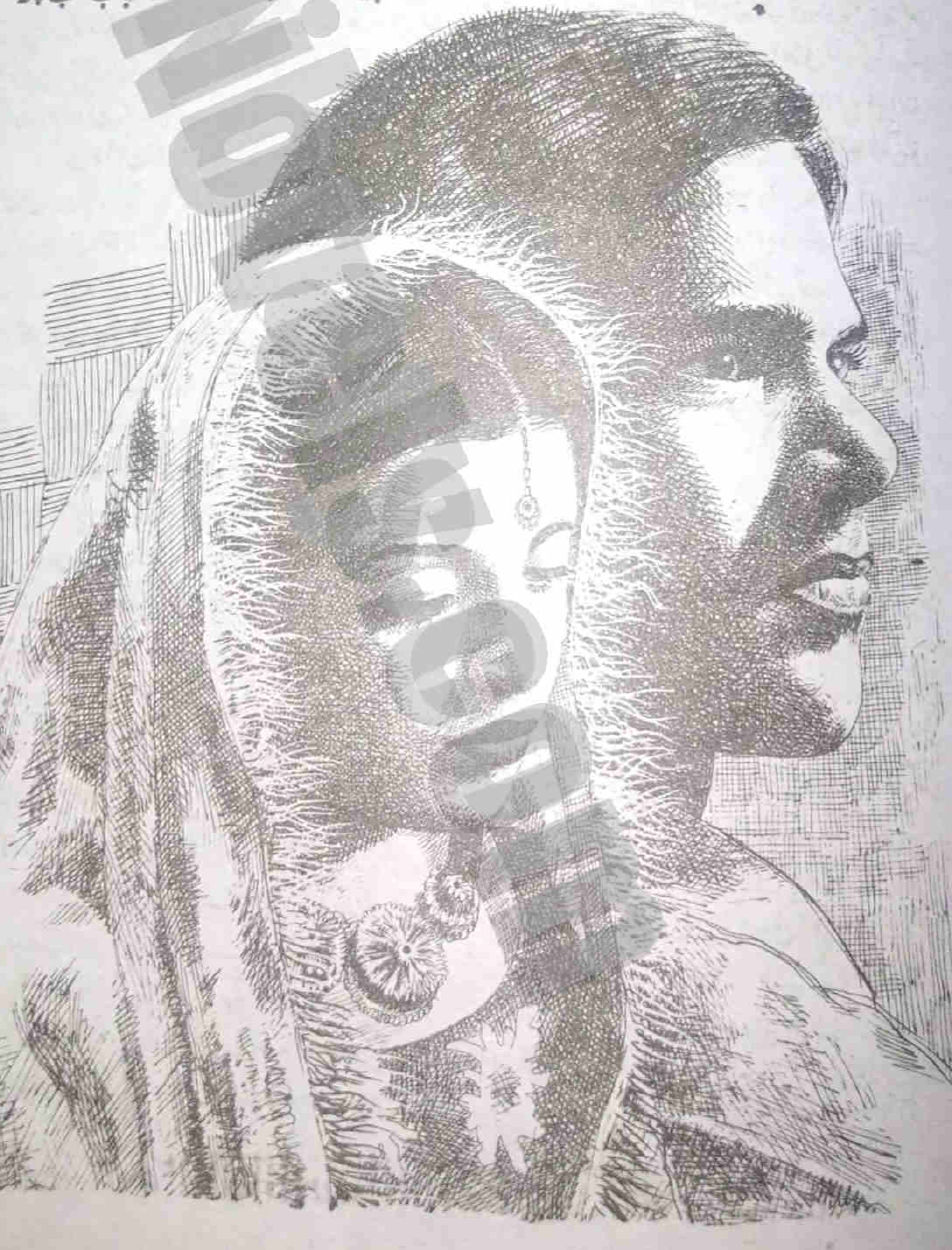

پسینے کی نذر ہورہا تھا۔ عروج نے بیگ سے موبائل نکالا کیا پتا کوئی میسج آیا ہوگا کاشان کا۔ وہ خود سے کال نہیں کرسکتی تھی اس کے پاس بیلنس ختم تھا۔ ابھی موبائل میں پاس ورڈ ڈال ہی رہی تھی کہ کاشان کی کال آگئی۔

”عروج...... یار سوری میں نہیں آسکوں گا میری بائیک پنکچر ہوگئی ہے۔ مجھے ٹائم لگ جائے گا۔ تم گھر چلی جاؤ۔ اور ہاں پلیز کسی شاپ سے کوئی جوس وغیرہ لے کر پی لو۔ بہت گرمی ہے۔“

اس نے ایک ہی سانس میں اپنے نہ آنے کی وجہ بتانے کے ساتھ ساتھ اسے نصیحت بھی کرڈالی۔ وہ بھی شاید گرمی میں ہی بائیک لے کر کھڑا ہوگا۔ مگر عروج کی فکر تو لازمی تھی۔ عروج کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔

”جی کاشان میں گھر جارہی ہوں اور پانی کی بوتل ہے میرے پاس۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کہاں ہیں ابھی؟“ عروج نے استفسار کیا تو کاشان نے وضاحت دی۔

”یار ابو نے بل جمع کروانے کے لیے دیا تھا۔ وہ لے کر نکلا تھا۔ بل تو جمع کروادیا مگر بائیک پنکچر ہوگئی۔ پنکچر والے کے پاس آل ریڈی دو بائیکس موجود ہیں پنکچر کے لیے۔ اپنی باری کا انتظار کررہا ہوں۔ تم گھر چلی جاؤ۔“

”اوکے...... چلیں ٹھیک ہے کاشان اور آپ بھی ٹھنڈا پانی یا جوس وغیرہ پی لیں۔ واقعی بہت گرمی ہے۔“

”جی بیگم صاحبہ ٹھیک ہے۔“ کاشان نے بھی مسکراتے ہوئے کال منقطع کردی۔

یہ دونوں ایک متوسط طبقے کے گھرانے کے دو نفوس تھے۔ انتہائی صلح جو، معاملہ فہم اور ذمہ دار میاں بیوی، شادی کو ایک سال ہونے والا تھا۔ دونوں کی پسند کی شادی تھی جو بڑے دھواں دھار عشق کے بعد سر انجام پائی تھی۔ عروج کاشان کی کزن کی سسرالی رشتہ دار تھی۔

کزن کی شادی پر دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور پسند کرلیا تھا۔ فون نمبرز کے تبادلے کے بعد عہد و پیماں کا سلسلہ یوں ہی جاری رہتا۔ مگر ایک تو عروج کے دھڑا دھڑ آنے والے رشتوں نے ان دونوں کو خبردار کردیا دوسرے عروج کی امی کو پتا چل گیا کہ عروج کسی کو پسند کرنے لگی ہے اور ہر وقت فون سے چپکی رہتی ہے۔ تو ان کے استفسار پر عروج نے کاشان کے بارے میں امی کو آگاہ کیا یوں ہی کاشان نے اپنی کزن کے توسط سے اپنے گھر والوں تک بات پہنچائی اور پھر ان دونوں کی بات پکی ہوگئی۔

عروج دو بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی۔ ابھی انٹر کے ایگزام دیے تھے اور گریجویشن کا ارادہ رکھتی تھی۔ جبکہ کاشان بی کام فائنل کا اسٹوڈنٹ تھا۔ وہ دو بھائی اور دو بہنیں تھے۔ کاشان — بڑا تھا۔ پھر عالیان اور پھر دو چھوٹی بہنیں۔ حمنہ اور یمنہ جو اسکول میں پڑھتی تھیں۔ کاشان کے والدین ابھی اس کے رشتے کے حق میں نہ تھے اور چاہتے تھے کہ ابھی وہ اپنی پڑھائی پر توجہ دے۔ سکون سے تعلیم حاصل کرے پھر جب اس کی اچھی جاب ہوجائے تب وہ لڑکی دیکھیں گے۔ مگر کاشان کی ضد نے ان کی سوچوں پر پانی پھیر دیا اس کا خیال تھا کہ ان کا اچھا خاصا کپڑے کا کاروبار ہے اسی کو آگے بڑھایا جائے سو نوکری کرنے کا اس کا کوئی ذہن ہی نہیں تھا۔

اسی بات کو بنیاد بنا کر اس نے عروج سے منگنی کرا کر ہی دم لیا۔ تقریباً سب ہی اس بات پر معترض تھے کہ وہ تعلیم تو مکمل کرے مگر دونوں کی ضد کے آگے دونوں کے والدین نے ہار مان لی۔ عروج کی امی کا کہنا تھا کہ ان کا نکاح کردیتے ہیں لیکن باقی لوگوں کی رائے مختلف ہونے کی وجہ سے یہ بات نہ بن سکی۔

پہلے عروج چوری چھپے کاشان سے باتیں کیا کرتی تھی۔ منگنی کے بعد وہ ذرا سی جھجکی مگر امی کے لاکھ منع کرنے، سمجھانے اور پابندی لگانے کے باوجود اس کی روش نہ بدلی۔ ادھر کاشان کا بھی یہی حال تھا۔ کیا کھایا جارہا ہے۔ آج کس کلر کا سوٹ پہنا ہے۔ کون آرہا ہے۔ کہاں جارہے ہیں۔ امی نے کیوں ڈانٹا۔ ابو نے کیا کہا۔ کون سے بھائی سے لڑائی ہوگئی۔ غرض یہ ہے کہ سب کچھ سیکنڈ میں یہاں سے وہاں اپ ڈیٹ ہوتا رہتا۔

عروج کی امی اپنے شوہر سے اس حوالے سے بات کرنا چاہتی تھیں۔ مگر ایک تو وہ پہلے ہی اس رشتے پر جز بز سے تھے اور اس طرح کی بات کرنے کا مطلب تھا خود

عروج کی امی کا عدالتی ریمانڈ۔ بے چاری روز ہی ہمت مجتمع کرتیں، عروج کو دھمکی دیتیں۔ وہ کچھ گھنٹوں کے لیے باز آتی مگر پھر وہی نتیجہ ڈھاک کے تین پات رہتا۔

☆☆☆

خوب صورت سی ٹرے میں پلیٹ سے سجے شاہی ٹکڑے دیکھ کر کاشان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اس نے رال ٹپکاتا ایموجی سینڈ کیا۔ دوسرے ہی پل ایک کلر فل میکرونی کی دوسری پک اسے موصول ہوئی۔ کاشان کی بھوک چمک اٹھی۔ اس نے عروج کو وائس میسج کیا۔

"یار کیا کر رہی ہو پہلے ہی بھوک لگ رہی ہے اور تم یہ مزے مزے کے کھانے بھیج رہی ہو جو میں کھا بھی نہیں سکتا۔" عروج نے جوابی میسج کیا۔

"بے فکر رہیں۔ شادی کے بعد آپ کو بھی میرے ہاتھ کے یہ مزیدار کھانے کھانے کو ملیں گے جناب۔ جب تک آپ تصاویر سے ہی کام چلایے۔ اچھا آپ نے کیا کھایا؟" عروج نے کاشان سے پوچھا۔

"چنے کی دال کر لیے۔" کاشان نے منہ بسورتے ایموجی کے ساتھ جواب سینڈ کیا۔ عروج نے بھی منہ چڑاتے اور رنجیدہ ایموجیز سینڈ کیے۔ یوں اسی طرح روز کی باتیں ان کے درمیان ہوتی رہتیں۔

آج میں بازار گئی۔ آج ماموں آئے۔ آج میں نے یہ پکایا۔ اور اب تو دونوں اپنی اپنی تصویر بھی روز شیئر کرنے لگے تھے۔ کاشان کالج جانے کے لیے تیار ہوتا تو تصویر۔ عروج بال سلجھا رہی ہوتی تو تصویر۔ ٹیوشن کے لیے بچے بیٹھے رہتے اور یہ موصوفہ ریپلائی میں مصروف رہتیں۔ ایک دن کسی بچے نے اپنی مما کو بتایا کہ باجی ٹیوشن ٹائمنگ میں موبائل یوز کرتی رہتی ہیں۔ تو وہ شکایت لے کر آ گئیں عروج کو غصہ تو بہت آیا مگر ضبط کر کے تحمل سے بولی۔

"میں موبائل استعمال کرتی بھی ہوں تو کسی بچے کے رزلٹ پر تو کوئی فرق نہیں پڑ رہا ناں۔ میرے اپنے بھی سو کام ہوتے ہیں۔"

پھر یوں ہوا کہ عروج نے حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے دوران ٹیوشن موبائل استعمال کرنا ترک کر دیا۔ مگر جوں ہی بچے جاتے وہ موبائل میں لگ جاتی۔ یہ نہیں تھا کہ وہ ہر وقت کاشان سے باتیں کرتی رہتی تھی مگر کاشان کو پل پل کی خبر دینا اس کے لیے اہم کام تھا۔ اب تو کاشان کبھی کبھی ویڈیو کال کرنے پر بھی زور دیتا تھا۔ عروج نے پہلے پہل تو منع کیا مگر کاشان نے سمجھایا کہ بھئی تم اپنی تصویر بھی تو شیئر کرتی ہو ناں۔ کیا ہی اچھا ہو یہ تصویر بول بھی پڑے۔ اور عروج شرما جاتی۔ دونوں ٹائم سیٹ کر لیتے جوں ہی امی نماز کے لیے کھڑی ہوتیں۔ عروج کال ملا لیتی۔ کاشان موقع دیکھ کر کال اٹینڈ کر لیتا۔ زیادہ بات تو نہ ہو پاتی مگر شیطان کامیاب ہو جاتا۔ دو نامحرم ایک دوسرے سے بات کرنے کے علاوہ ایک دوسرے کا دیدار بھی کر لیتے۔

ان کی باتیں یوں ہی چلتی رہیں اور دن گزرتے رہے۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی ہو جاتیں۔ پھر صلح کر لیتے۔ ابھی دونوں خاندان ایک نہ ہوئے تھے مگر یہ دونوں ایک دوسرے کے خاندان کے ہر فرد کو بمع اس کی خامیوں اور خوبیوں سمیت جان چکے تھے۔ کاشان بتاتا کہ فلاں کزن کا رجحان میری طرف تھا

ان کی امی بھی مجھے اپنی فرزندی میں لینا چاہتی تھیں۔

عروج کو برا لگ جاتا۔ وہ سلگ کر رہ جاتی پھر وہ کیوں پیچھے رہتی وہ بھی اپنے لیے آنے والے رشتوں کی بابت بتا کر اپنی اہمیت ظاہر کرتی۔

اب یوں ہونے لگا کہ ایک دوسرے پر پابندی لگا دیتے۔ فلاں کے ساتھ زیادہ فری نہ ہونا۔ فلاں کو منہ نہ لگانا۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس طرح کسی سے بنا ملے بنا ملاقات کیے بغیر جانچے پرکھے دونوں نے اپنے اپنے خاندان والوں کی طرف سے ایک دوسرے کو بدگمان بھی کر دیا اور بلاوجہ کی عداوت بھی قائم ہو گئی۔ عروج بھی کبھار اپنی امی سے بھی کاشان کی کچھ باتیں شیئر کر لیتی تھی۔ اس پر عروج کی والدہ پریشان ہو جاتیں۔

"بیٹا آگے چل کر تم دونوں کو بہت پریشانی اٹھانی پڑے گی۔ کیا ضرورت ہے تم لوگوں کو فالتو باتیں کرنے کی۔ بیٹا اپنا وقار قائم رکھو۔ خود کو بے وقعت مت کرو۔"

عروج جھنجلا جاتی۔ امی کی تسلی کے لیے ظاہر کر دیتی کہ اب ایسا نہیں ہوگا۔ مگر پھر وہی مستقل مزاجی کے ساتھ دونوں کی باتیں ہوتی رہتیں۔ عروج کی امی عروج کے جہیز کے لیے کیا لا کر رکھ رہی ہیں۔ کہاں سے خریداری ہو رہی ہے۔ گھر میں بڑے بھائی کی سسرال سے متعلق جو باتیں ہوتیں وہ تک من وعن بیان ہوتیں۔ اسی طرح کاشان آگاہ کرتا رہتا۔ آج ممانی آئی تھیں آج پھپھو آئی تھیں۔ فلاں تمہارے بارے میں امی سے پوچھ رہی تھیں عروج گھرداری سے میں کیسی ہے۔ اخلاق کیسا ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھر عروج کا تجسس بڑھتا۔ اچھا آنٹی نے ان سے کیا کہا۔ پھر جو امی کا جواب ہوتا۔ کاشان وہ ذکر کرتا۔ پھر بتاتا کہ ہمارے گھر میں عالیان اور میری ایک ساتھ شادی کی باتیں ہو رہی ہیں عروج نئے سرے سے سوچوں میں مشغول ہو جاتی اور اپنی سوچوں کو الفاظ کا روپ دے کر کاشان کے گوش گزار کرتی رہتی۔ غرض یہ ہے کہ باتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ وقت کے ضیاع کے ساتھ چلتا رہا۔ ابو اور بھائی باہر ہوتے۔ امی کو ظاہر نہ ہو۔ اکثر عروج کانوں میں ایئر بڈز لگا کر رکھتی۔ کتنی بار امی آوازیں دیتی رہتیں مگر بے سود۔ پھر امی غصہ کرتیں ابو سے شکایت کی دھمکی دیتیں تو وہ باز آ جاتی۔ مگر صرف کچھ وقت کے لیے۔ اس کا موبائل ہر وقت چارج رہتا۔

دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ بجلی کی لوڈشیڈنگ کی وجہ سے زمانے کے کام تتر بتر ہو جائیں بھونچال آ جائے سب کام اوندھے ہو جائیں مگر عروج کا موبائل، ایئربڈز ایئرپوڈز اور پاور بینک اپنے وقت پر چارج ملتے۔ وہ موسیقی سنتے سنتے گھر میں اپنا کام نبٹاتی رہتی۔ آرام کے لیے کمر سیدھی کرنے لیٹتی تو ریلز میں سر کھپا رہی ہوتی۔ فیس بک، انسٹاگرام، ٹک ٹاک اور واٹس ایپ کی دنیا میں گم وقت کس تیزی سے گزرتا۔ بھولی بن کر حیران ہو جاتی۔ یوٹیوب سے دیکھ دیکھ کر بیوٹی ٹپس آزماتی رہتی۔ نت نئے کھانوں کی لاتعداد ویڈیوز دیکھتی رہتی۔ سانس لینا بھول جائے مگر اسنیپ چیٹ پر اسٹریک کرنا یاد رہتی۔ دونوں کو ایک دوسرے کے اکاؤنٹس کے پاس ورڈز معلوم ہوتے۔ کوئی پرائیویسی نہ تھی۔ امی سوچتیں۔ میں صحیح کہہ رہی تھی ان کا نکاح ہو جاتا تو مجھے گلٹ نہ رہتا۔ گناہ گار نہ ہو رہی ہوتی۔

عروج کوئی ٹین ایج اور لاابالی لڑکی نہیں تھی۔ وہ احسن طریقے سے گھر کو بھی سنبھالتی۔ مہمان داری بھی نبھاتی۔ بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھایا کرتی۔ ملنساری، خوش اخلاقی، سلیقہ مندی جیسے اور بھی اوصاف میں موجود تھے۔ بس نفس کے بہکاوے میں آتی رہتی۔

اسے کاشان پر اندھا اعتماد تھا۔

"کاشان ایسے نہیں ہیں۔" اس جملے کو وہ متعدد بار امی کے سامنے دہرا چکی تھی اور کبھی خود بھی اسے خدشات لاحق ہوتے تو وہ اسی ایک جملے سے خود کو بہلا کر قائل کر لیتی۔ دل کو سمجھاتی کہ کچھ نہیں ہوتا بلکہ ہماری انڈراسٹینڈنگ اور مضبوط ہوگی۔ وہ شاید ان لوگوں میں سے تھی جو نصیحت کو کسی حادثے کے بعد ہی قبول کرتے ہیں۔

☆☆☆

ناشتے سے فراغت کے بعد اس نے حسب معمول گھر کی صفائی شروع کی۔ آج امی نے صبح سے مشین

لگائی ہوئی تھی۔ اس لیے عروج نے سوچا کہ جلدی جلدی صفائی کر کے لنچ کی تیاری کر لے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ کاشان کی کال آگئی۔ وہ حیران ہوئی کہ کاشان تو اس وقت کالج میں ہوتا تھا۔ پتا چلا کہ موصوف کی طبیعت ناز ساز تھی تو آج کالج سے آف تھا۔ دونوں کی باتیں شروع ہو چکی تھیں اور اب دو گھنٹے کہیں نہیں گئے تھے۔ حسب معمول کانوں میں ایئر بڈز ٹھونس کر مگن سے انداز میں باتوں کے ساتھ ساتھ ڈسٹنگ جاری تھی کہ برابر والی آنٹی صفیہ کی کال آنے لگی۔

"یا اللہ خیر۔" ان کی ساس کافی عرصے سے بیمار تھیں۔ عروج کو ایک خیال آیا۔ کہیں وہ...... اس نے کال ریسیو کی۔ صفیہ آنٹی حواس باختہ تھیں۔

"عروج ...... کہاں ہو تم؟" "میں گھر میں خیریت آنٹی۔" وہ بھی گھبرا گئی۔ اسے لگا صفیہ آنٹی اس کے خدشے کی تصدیق کریں گی مگر وہ چیخنے کے انداز میں بولیں۔

"دروازہ کھولو، جلدی۔"...... عروج باہر کی جانب بھاگی اور پھر صحن میں پہنچ کر اس کی چیخ نکل گئی۔

"امی......" امی گیلے صحن میں نیم بے ہوش، سکڑی سی گری ہوئی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنے سر کے پچھلے حصے کو پکڑا ہوا تھا۔ اور خون سے ان کی آسمانی شرٹ کندھوں کے پچھلے سائیڈ سے بھیگ رہی تھی۔ تھوڑا خون فرش پر بھی پڑا ہوا تھا۔ عروج لپک کر ان کے پاس آئی اور انہیں اٹھانے لگی۔ دھڑ ادھڑ کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا۔ عروج نے دروازہ کھولا تو صفیہ آنٹی اور ان کے سسر کھڑے تھے۔

جلدی سے امی کو ان کی گاڑی میں ڈال کر اسپتال پہنچے۔ پتا چلا کہ گیلے فرش پر پھسل جانے کے باعث وہ توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے کمر کے بل گر گئی تھیں اور ان کے بالوں میں لگا میٹل کا کیچر ٹوٹ کر اتنی شدت سے ان کے سر میں لگا کہ اچھا خاصا خون نکل آیا۔ بے چاری کب سے عروج کو آوازیں دے رہی تھیں۔

صفیہ آنٹی نے بتایا کہ وہ اپنے بیٹے کو آفس کے لیے سی آف کرنے گیٹ پر آئیں تو گیلری میں آتے ہی انہیں برابر والے گھر کے صحن سے "عروج عروج جلدی آؤ۔ عروج جلدی آؤ" کی آوازیں آتی رہیں وہ پریشان ہو کر باہر نکلیں اور عروج کا دروازہ بجایا مگر عروج کو کاشان کے علاوہ کب کسی کی آواز آرہی تھی۔ سو آنٹی نے پھر عروج کو فون کیا۔ چونکہ آپس میں دونوں گھر کے اچھے مراسم تھے۔ تو اکثر فون پر بھی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ اسی لیے آج بروقت مزید کسی سنگین صورت حال تک پہنچنے سے بچ گئے تھے۔

سارا ماجرا سن کر عروج کو رنج نے آلیا۔ امی نے کتنی تکلیف اٹھائی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ صفیہ آنٹی نے تسلی دی۔ خیر۔ ٹریٹمنٹ کے بعد امی کو گھر لے آئے۔ انہیں بے حد چکر آرہے تھے ابو اور بھائی نے عروج کے خوب لتے لیے۔

"امی اکیلے کپڑے کیوں دھو رہی تھیں۔ تم کہاں تھیں۔" عروج کی امی نے عروج کی درگت بنتے دیکھی۔ ہاں تھیں ناں۔ بات بنا ڈالی۔

"عروج سو رہی تھی اور اس کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔" پھر ابو عروج کو ڈانٹنے لگے۔

"ایسی بھی کیا مدہوشی والی نیند۔ انسان کو تھوڑا چوکنا رہنا چاہیے۔" اور عروج پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔

وہ کتنے ہی دن امی سے شرمندہ رہی۔ معافیاں مانگتی رہی۔ امی اسے نئے سرے سے سمجھانے لگیں۔ اور وہ واقعی سمجھ گئی کہ ہر وقت موبائل کا اس طرح استعمال بعض اوقات کتنا سنگین ثابت ہو سکتا ہے۔ ہاں البتہ کاشان سے باتوں کے لیے اس نے ایک ٹائم فکس کر لیا تھا۔ اب وہ ایک کان میں ہینڈ فری لگاتی تھی۔ عادتیں پکی ہو جائیں تو کہاں چھوٹتی ہیں۔ کاشان کو بھی اس حادثے کی خبر ہو چکی تھی اور اب وہ بھی تھوڑی احتیاط کرنے لگا تھا۔ باتیں کرنا ترک تو نہیں البتہ مختصر کر دیا تھا یہ الگ بات تھی کہ یہ مختصری بات دن میں کئی بار ہوتی تھی۔

☆☆☆

بی کام کے بعد ایم کام مکمل ہوتے ہی کاشان کو شادی کا شوق چڑھ گیا۔ والدین نے دونوں بھائیوں کی ایک ساتھ شادی کا ارادہ کر لیا۔ حفصہ ان کے چچا کی بڑی بیٹی تھی۔ ان کے گھر کا ماحول مذہبی تھا وہ شرعی پردہ کیا

کرتی تھی اور ایک مدرسے میں بطور معلمہ اپنے فرائض سرانجام دے رہی تھی۔ کسی کو اس رشتے پر اعتراض نہ ہوا اور بڑے ارمانوں اور محبت وخلوص کے ساتھ یہ لوگ عروج اور حفصہ کو اپنے گھر کی عزت بنا کر لے آئے۔

کاشان تو عروج کے ساتھ خوش تھا ہی۔ عالیان بھی حفصہ کو پا کر نہال ہو گیا کچھ دن گھما گھمی کے رہے اور پھر دن روٹین کے مطابق بسر ہونے لگے۔ ان کا گھر خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ عروج کو کاشان سے جو خدشات تھے وہ کبھی اس کے سامنے نہ آئے۔ یہ بات تو ماننے والی تھی کہ کاشان عروج سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ گھر میں سب سے بڑا ہونے کے ناتے اس میں کئی مربیانہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ اپنی سمجھ داری سے وہ نہ صرف عروج کو خوش رکھتا بلکہ گھر کے ہر فرد کے ساتھ اس کا رویہ دوستانہ اور مشفقانہ ہوتا تھا۔ البتہ حفصہ اس سے بھی پردہ کرتی تھی اور شرعی قیود کا خیال رکھتے ہوئے ہی اس سے ضرورتاً بات کرتی تھی۔

عروج ہنس مکھ کھلنڈری تھی۔ مگر کسی کو اس سے کسی بھی قسم کی شکایت نہیں تھی۔ عروج اپنی امی کو جتاتی۔

”دیکھیں امی، آپ کتنا ڈرتی تھیں مجھے کتنا کہتی تھیں کہ شادی کے بعد کوئی بدمزگی نہ ہو۔ احتیاط کیا کرو۔ دیکھا آپ نے وہاں سب کتنے اچھے ہیں۔ اور کاشان...... وہ تو مجھ سے بے حد خوش رہتے ہیں۔“

عروج کی امی یہ سب سن کر خوش ہوتیں۔ دعائیں دیتیں۔ نظر بد سے بچنے کے لیے دعائیں پڑھ کر اس پر دم کرتیں۔ واقعتاً عروج کے سسرال والے بہت سلجھے ہوئے لوگ تھے۔ اس کی دونوں نندیں بھی بھابھی بھابھی کہہ کر عروج اور حفصہ کے گرد منڈلاتی رہتیں۔

خاندان بھر میں ان کی فیملی کا تذکرہ تھا۔ کاشان عروج کی توقعات سے بڑھ کر اچھا ثابت ہوا تھا۔ اس کی محبت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی بلکہ اس کی محبت اور وارفتگیاں بڑھتی ہی جا رہی تھیں اول روز کی طرح دونوں ایک دوسرے کے شیدائی تھے۔ آج بھی کاشان اپنی عروج کی ساری باتیں اسی دلچسپی سے سنتا۔ اپنی بے قراریوں کا اظہار کرتا۔ اس کا بے حد خیال رکھتا۔ الغرض یہ کہ دونوں اپنی زندگی سے بہت مطمئن اور خوش تھے۔

زندگی اسی طرح خوشیوں کے ساتھ گزرتی رہتی اگر کاشان کی والدہ کی طبیعت خراب نہ ہو جاتی۔ آئے دن ایک نہ ایک بیماری نے انہیں گھیر لیا۔ دواؤں کے باوجود جب افاقہ نہ ہوا تو مختلف ٹیسٹوں کے بعد ایک موذی مرض کی تشخیص نے گھر بھر کے اوسان خطا کر دیے۔ ٹینشن گھر کے ہر فرد کی ذہنی اذیت کا سبب بننے لگی۔ امی کی بیماری، ان کا علاج، کیموتھراپی اور پہاڑ جیسے اخراجات نے سب کو بوکھلا کر رکھ دیا ان کے علاج پر پانی کی طرح پیسہ بہایا جا رہا تھا۔

ابھی کچھ ماہ پہلے ہی یہ لوگ دو دو شادیاں کر کے بیٹھے تھے اور اب یہ آزمائش آن پڑی تھی۔ کاروبار بھی مندا جا رہا تھا۔ غرض چاروں طرف سے پریشانی کا سامنا تھا۔ گھر کے مالی حالات تنگ ہونے لگے مگر مکینوں کے دل کشادہ تھے۔ سب کے منع کرنے کے باوجود حفصہ نے دوبارہ اپنا مدرسہ جوائن کر لیا۔ آن لائن ٹیشوز بھی پڑھانے لگی۔

عروج نے بھی اپنا فرض سمجھتے ہوئے ایک قریبی اسکول میں ٹیچنگ کا بیڑا اٹھا لیا۔ کاشان نے ایک دو جگہ جاب کے لیے اپلائی کر دیا۔ زندگی کی گاڑی گھسٹ گھسٹ کر چلنے لگی۔ والدہ کی طبیعت میں بہتری کے آثار نہ تھے مگر امید پر دنیا قائم ہے۔ تدبیر بہرحال جاری رکھنی چاہیے کہ مصداق سب ہی ایک دوسرے کی ڈھال بنے ہوئے تھے۔

عروج صبح خود ہی اسکول چلی جاتی مگر واپسی میں گرمی کے باعث کاشان اسے پک کر لیتا۔ نندیں زیادہ بڑی نہیں تھیں انہیں گھر کے کام کا خاص تجربہ تھا نہ شوق، وہ اپنی پڑھائی میں لگی رہتیں۔ عروج اسکول سے آتی تو حفصہ اپنے مدرسے چلی جاتی۔ دونوں نے اس طرح کی ٹائمنگز سیٹ کر لی تھیں۔ گھر کے کام اور ساس کی دیکھ بھال بھی اپنی اپنی سہولت کے مطابق تقسیم کر لی تھی۔ گھر کا ماحول منظم اور مثبت ہو تو بڑی سے بڑی آزمائش میں بھی انسان نہیں گھبراتا۔ دعا کرتا رہے۔ سعی کرتا رہے، اللہ پر

توکل اور خود پر اعتماد و بھروسہ ہو تو پھر مشکل، مشکل نہیں رہتی۔ آسان ہو جاتی ہے۔

آج اتنی گرمی میں کاشان کی بائیک کے پنکچر ہونے کے باعث عروج کو پہلی بار اکیلے گھر آنا پڑا۔ وہ گھر آئی تو پتا چلا کہ امی کی طبیعت بگڑ گئی تھی۔ انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہیں۔ کاشان بھی سیدھا اسپتال پہنچ گیا۔ ہونی کو کوئی نہیں ٹال سکتا۔ حفصہ کی روتے ہوئے کال آئی۔

"تائی جان کی ڈیتھ ہو گئی ہے۔" گھر والوں پر قیامت سی ٹوٹ گئی۔ ماں کا کوئی نعم البدل نہیں۔ جانے والے کا خلا پر نہیں ہو سکتا۔ لیکن کچھ بھی ہو جینا تو پڑتا ہی ہے ناں۔ رفتہ رفتہ سب نے ایک دوسرے کو سنبھال لیا۔

دو ماہ گزر چکے تھے۔ زندگی معمول پر آنے لگی تھی۔ ان کے والد بھی بہت سمجھ دار شخص تھے۔ انہوں نے گھر کے ماحول پر چھائی سوگواریت دور کرنے کے لیے ساحل سمندر پکنک کا پروگرام بنا ڈالا۔ کافی عرصے سے ماں کی بیماری اور پھر وفات، گھر کے حالات اور تنگ دستی کی وجہ سے بچوں کے چہرے اترے اترے سے تھے۔ سوان کو یہ خیال آیا کہ سب مل کر سمندر پر چلتے ہیں۔

فطرت انسان کے ذہن کو فریش کرتی ہے۔ جمود ٹوٹتا ہے۔ نئی امنگیں پیدا ہوتی ہیں۔ بچوں نے منع کیا۔ نندیں رونے لگیں کہ امی کے بغیر کیا کریں گے لیکن والد بزرگوار زبردستی سب کو لے کر چل پڑے اور واقعی کچھ گھنٹوں کے لیے سب کا دل بہل گیا۔ تھوڑا فریش ہو گئے۔

☆☆☆

اگلے دن کا سورج کچھ نئی سوچوں کے ساتھ طلوع ہوا۔ گھر کی ذمہ داریاں بڑھنے کی وجہ سے عروج نے ٹیچنگ کو خیرآباد کہہ دیا تھا۔ البتہ حفصہ مدرسے جاتی تھی۔ عروج کچن میں گلاس لینے آئی تو کھڑکی سے آتی کاشان کی آواز نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ مدرسہ جاتی حفصہ سے کہہ رہا تھا۔

"حفصہ گڑیا۔ آپ مدرسے سے ریزائن کر دو۔ اب امی تو ہیں نہیں اور آپ جانتی ہو آج کل کیا ماحول چل رہا ہے۔ حمنہ اور یمنہ چھوٹی ہیں ناں۔ اور لڑکیوں کی عزت کانچ سے زیادہ نازک ہوتی ہے۔ ان آبگینوں کی حفاظت آپ نے کرنی ہے۔ بالکل جیسی چچی جان نے آپ کی تربیت کی۔ آپ ان کو اپنی طرح بنانا۔ مجھے آپ کی تربیت پر پورا بھروسا ہے۔ ٹھیک ہے بیٹا؟"

اور عروج نے دیکھا کہ عبایا میں کھڑی حفصہ نے سر ہلایا اور کاشان نے مشفقانہ انداز میں مسکراتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا۔ عروج کے اندر بہت کچھ ٹوٹ گیا۔

یہ حقیقت تھی کہ کاشان اب بھی اس کا محبوب شوہر تھا اس سے سچی محبت اور والہانہ عشق کرتا تھا لیکن اس کے ان چند جملوں نے آج عروج کو گویا آسمان سے زمین پر لا پٹخا تھا۔ آنکھوں کی نمی نے کب آنسوؤں کا روپ دھارا اسے پتا ہی نہ چلا۔ خود کی بہنوں کی عزت کانچ کی طرح نازک، حفصہ کی تربیت بہترین خود حفصہ بھی اچھی مربیہ اور میں؟ پچھلے سال کسی فلم کی طرح اس کے تخیل کا حصہ بننے لگی۔

امی کی باتیں ان کی نصیحتیں اپنی بے وقوفیاں اور نوا اور اکی کے ساتھ ہونے والا حادثہ بھی یاد آیا تو وہ ہچکیوں سے رونے لگی۔ اس حادثے کی یاد بھی اتنی ہی تکلیف دہ تھی جتنی کہ آج کے حادثے کی تکلیف اور آج کا حادثہ تو اس کے دل کے ساتھ ہوا تھا۔ کاشان اسے ڈھونڈتے ہوئے کچن میں آیا تو اسے روتا دیکھ کر پریشان ہو گیا۔

"عروج کیا ہوا؟ کیوں رو رہی ہو؟" جواباً عروج نے سچ کہہ دیا۔ امی کی یاد آ گئی تھی۔ وہ نہ جانے کیا سمجھا۔ اسے اپنے ساتھ لگاتے ہوئے بولا۔

"جانے والا کب لوٹ کر آتے ہیں۔ ان کے لیے دعا کرو۔ بس اب صبر ہی کرنا ہے۔" عروج اپنی آنکھیں صاف کرتے ہوئے اس کی بات دہرائی۔

"جی......اب صبر ہی کرنا ہے۔"

☆☆

دعا گر

آدھے چاند کی کشتی سینے پر سجائے، تاروں کی ابرک اوڑھے خود پر نازاں تاحدِ نگاہ پھیلا آسمان، زمین پر جھکا یوں مسکرا رہا تھا جیسے زمین پر موجود ہر ذی نفس کے دل کی خبر اس کے پاس ہو۔

وہیں دور زمین پہ بے حد گھنی گھنگریالی لٹوں والی جیا، رات کے پچھلے پہر اپنی بہنوں اور اپنے چھوٹے سے کمرے میں فرشی گدے پر براجمان تھی۔ آسمانی ململ کا آنچل گود میں پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ میں موبائل لیے وہ دنیا و مافیہا سے بے خبر مطمئن سی کوئی آرٹیکل لکھ رہی تھی۔ اسے یہ آرٹیکل اپنے کلائنٹ کو کل تک بھیجنا تھا۔

اسے لکھنے کا شوق تھا وہ بچپن سے ہی مختلف بچوں کے جرائد میں لکھا کرتی۔ اس کا یہ شوق بہت زیادہ نہیں تو کچھ مالی فائدہ بھی پہنچاتا۔ وہ اسی راہ پر چلتی نئے زمانے کی اصطلاح ”فری لانسنگ“ سے روشناس ہوئی تھی۔ شوق شوق میں آرٹیکل لکھ کر وہ چار اضافی پیسے کمانے لگی تھی۔ ان اضافی پیسوں سے وہ پس پشت ڈالی ”لگژری“ کے زمرے میں آنے والی غیر ضروری مگر دل لبھانے والی، من پسند اشیاء اپنے لیے یا اپنی بہنوں کے لیے خریدنے لگی، ایسا کر کے اسے بہت سی خوشی اور تھوڑا سا اعتماد ملتا۔

ان ہی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کے بل پر وہ بڑے بڑے خواب دیکھنے لگی۔ یہ خواب محض شوق کی پیداوار نہ تھے بلکہ وقت کی ضرورت بھی محسوس ہوتے۔ وہ امی ابو کا بوجھ بانٹنا چاہتی تھی۔ ان کی زندگی بہتر کرنا چاہتی تھی۔ اس کا تعلق اس طبقے سے تھا جہاں خوابوں کے مقابلے میں حقیقت کو اہمیت دی جاتی تھی سو امی نے اس کے کسی بھی خواب کو خاطر میں لائے بغیر جاننے والوں اور محلے والوں سے رشتے کے لیے کہہ رکھا تھا۔

پھر بھی جیا اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹی تھی اور اپنی اماں سے کہہ دیا تھا کہ پہلے چھوٹی کی شادی کر دیں، جب تک میں اپنے خوابوں کی تعبیر ڈھونڈنے کی کوشش ضرور کروں گی۔ پھر بھی اگر میں کامیاب نہ ہو سکی تو آپ بے شک مجھے بھی بھیج دینا اگلے گھر، میں اف نہیں کروں گی۔ امی کے مقابلے ابو اس کے خوابوں کے لیے دل میں نرم گوشہ رکھتے تھے کہ زندگی کی کٹھنائیوں، ذمہ داریوں نے انہیں خواب دیکھنے کی اجازت ہی نہ دی تھی۔ اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ جیا ضرور اپنے خواب پورے کرے، اسی لیے انہیں اس کے لیے ایسا کھلے دل و ذہن کا لڑکا چاہیے تھا جو اس کے خوابوں کو پورا کرنے میں اس کا ساتھ دے نہ دے، راستے کی رکاوٹ نہ بنے۔

لیکن ابو کی اس بات پر امی کو خوب تاؤ آیا اور انہوں نے صاف کہہ دیا ”مجھے جب بھی کوئی رشتہ سمجھ لیں آیا میں طے کر دوں گی، ان فضول کے سوال جواب اور چونچلوں میں نہیں پڑوں گی، دماغ خراب ہو گیا ہے باپ بیٹی کا۔ بھلا بھی شادی بیاہ کے موقع پر کوئی لڑکوں سے سوال کرتا ہے کہ ”بھیا لڑکی کے خواب پورے کرو گے یا نہیں؟“ یہاں انسانوں کو اہمیت مل جائے بڑی بات ہے ان باپ بیٹی کو ہری ہری سوجھی ہے، حد ہے۔“ کہنے کے بعد دیر تک بڑبڑاتی رہیں۔

جیا بھی ڈھیٹ تھی، اماں کی حقیقت پسندانہ بلکہ اس کی نظر میں ظالمانہ، بڑبڑاہٹیں، اس کے لیے معمول کا حصہ بن چکی تھیں۔ دنیا میں کوئی چیز بے

فائدہ نہیں ہوتی، اسے اپنا متوسط طبقے کا ہونا بھی کبھی بھلا لگتا کہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کو ترستے ہوئے ہی اس نے بڑے بڑے خواب سجانا سیکھے تھے۔ اسے تو پورے گھر کی دیواروں کا اکھڑا پلستر اور بڑے سے برآمدے پلس مہمان خانے میں رکھا ہوا اپنا رنگ کھو چکا صوفہ سیٹ بھی بے حد عزیز ہو چکے تھے، کیونکہ اس کے آنے والے رشتوں میں سب سے بڑی رکاوٹ انہوں نے ہی ڈالی ہوئی تھی۔

لکھتے لکھتے تھک چکی جیا نے اپنا موبائل سائیڈ پر رکھا تھا۔ بستر پر لیٹنے سے پہلے ایک لمبی جمائی لی اور دوپٹہ گود سے اٹھا کر سرہانے رکھ کر اپنے بالوں سے کیچر نکالا تھا۔ لیٹتے ہوئے سامنے گھڑی پر نظر پڑی، صبح کے چار بج رہے تھے اسے یاد آیا آج تو امی نے کہا تھا کہ یونی سے جلدی آنا۔ اسے دیکھنے کچھ خواتین آنے والی تھیں۔ امی نے تو چھٹی کا کہا تھا کہ کرلو تو زیادہ بہتر ہو گا مگر ایک اہم لیکچر کی وجہ سے اس

نے چھٹی کا تو منع ہی کر دیا تھا۔ اور لکھتے لکھتے اتنی اہم بات اس کے ذہن سے نکل گئی تھی۔ اب تین چار گھنٹے کی نیند کے بعد یونی پھر وہاں سے واپسی پر مغرب تک سونے کی عیاشی آج ملنے والی نہیں تھی۔ جیا نے کوفت سے سوچا تھا۔

☆☆☆

''ناشتے میں کیا ہے زینت خاتون؟'' اظہار صاحب منہ ہاتھ دھو کر دوبارہ پوری شان و کروفر سے اپنے تخت پر براجمان ہو چکے تھے۔ انہیں اب بغیر کسی تاخیر کے ناشتا چاہیے تھا۔ ان کے لیے صبح کا ناشتا ہی کیا دن بھر کا ہر طعام نہایت اہتمام سے چنا جاتا تھا۔ زینت خاتون نے بتائے بغیر کچھ کہے ناشتا کی ٹرے ان کے سامنے تخت پر دھری تھی۔

رات کا بچا ہوا آلو کی گوشت اور دو انڈوں کا باریک پیاز، ہری مرچ، ہرا دھنیا ڈلا اشتہا انگیز خوشبو بکھیرتا خاگینہ اور چار دیسی گھی میں تر بتر پراٹھے۔ اظہار صاحب ناشتا سامنے آتے ہی پوری توجہ سے تناول کرنے میں مصروف ہو چکے تھے۔

''کچھ دیر تو اب خاموش رہیں گے۔'' زینب منہ میں کہتیں دوبارہ باورچی خانے میں گئی اپنے لیے چائے اور پاپے لینے۔

''کہاں ہیں شہزادہ عالم، دن چڑھ گیا ابھی تک صبح نہیں ہوئی صاحب بہادر کی؟'' اظہار صاحب کے پیٹ میں رزق جاتے ہی زبان فراٹے بھرنے لگی۔

زینب نے جواباً انہیں گھور کر دیکھا تھا۔

''ابھی تو دن چڑھے اس لیے سویا ہے کہ رات بھر کا جاگا صبح نو بجے گھر آیا تھا۔ کچھ دیر میں نیند پوری ہو گی تو خود ہی اٹھ جائے گا۔ ایسا بے فکرا لاپرواہ نہیں ہے بچہ جو بے خبر سوتا رہے۔'' زینب پراٹھا پاپا چائے میں ڈبوتے ہوئے وہ بولی تو لہجے میں پیار ہی پیار تھا۔

''ہاں تو کس نے کہا ہے رات رات بھر گھر سے غائب رہنے کو؟ آتا ہی صبح ہے غضب خدا کا۔ باپ کی بات کو مجال ہے خاطر میں لے آئے، کتنا سمجھایا ہے طوطے کی طرح کہ اتنی خواری کرنے کی کیا ضرورت ہے جب قدرت اتنا اچھا موقع دے رہی ہے مستقبل سنوارنے کا۔'' اظہار صاحب کہاں چپ ہونے والے تھے۔ انہوں نے وہی بات دہرائی تھی جس کی وجہ سے آج کل، ان کی اور روحان کی روز بحث ہو رہی تھی۔

وہ ناشتا کر چکے تھے، انہوں نے ناشتے کی ٹرے ایک طرف کھسکا کر وہیں پیر پسارے تھے، چکنے ہاتھ پاس پڑے رومال سے پونچھے تھے۔

زینت ان کی بات کا جواب دیئے بغیر ناشتے کے برتن لیے کھڑی ہوئیں۔ روحان مندی آنکھوں کے ساتھ وہاں داخل ہوا تھا۔

''کب آئے تھے صبح؟'' روحان کو کرسی پر بیٹھتے دیکھ اظہار صاحب نے رعب سے پوچھا تھا۔

''جی تقریباً صبح آٹھ ساڑھے آٹھ ہوئے ہوں گے، گھر نو بجے آیا تھا۔'' نرم خو روحان نے اپنے باپ کے برعکس آرام سے جواب دیا تھا۔

''صبح ائیر پورٹ کی ایک رائیڈ ملی تھی اچھے چارجز مل رہے تھے، اسی میں دیر ہو گئی۔'' روحان نے تفصیل سے بتایا تھا۔

''خوار ہوتے رہو ہزار ہزار روپے کے لیے مگر باپ کا کہا نہ مانو، چھوٹے ہو جاؤ گے، ناک نیچی ہو جائے گی تمہاری۔'' اظہار صاحب کو اس سے اچھا موقع کہاں ملتا کہ ناشتا کرتے ہی روحان کو نکل جانا تھا اور پھر دوسری صبح ہی ملتا وہ انہیں۔ اسی لیے موقع غنیمت جانتے ہوئے وہ جتنے طعنے دے سکتے دے رہے تھے۔

''امی! ناشتا دیں مجھے نکلنا ہے، آج ایوننگ کلاس بھی ہے میری، مجھے ساری رائیڈز کلاس سے پہلے پوری کرنی ہے'' روحان نے باپ کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے ماں کو آواز لگائی تھی۔

''جلاؤ جلاؤ دل میرا، جلا کر خاکستر کر دو، پائی پائی جوڑ کر یہ کھٹارا خریدی، اب اس کو جہاز سمجھ کر اڑاتے

پھرو شہر بھر میں، جو من میں آئے کرو، باپ تو گھر میں پڑا کاٹھ کباڑ ہے، پڑا رہنے دو ایک طرف۔"

اور ضبط سے کام لیتا روحان گاڑی کے نام پر سلگ کر رہ گیا تھا کہ یہ اس کا نقطۂ ابال تھا۔

"ابا، میں خدانخواستہ ہمیشہ کے لیے نہیں جا رہا واپس بھی آؤں گا۔ کچھ طعنے سنبھال کر رکھیں۔" روحان نے نہایت سکون سے کہا تھا۔ اور وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ماں کے پاس باورچی خانے میں چلا گیا تھا۔

☆☆☆

"جتنا جلدی گھر پہنچنا تھا اتنی ہی دیر ہو گئی آج تو۔" جیا نے کلائی پر بندھی گھڑی میں وقت دیکھتے ہوئے خود کلامی کی تھی۔

"اب کیا کریں" جیا نے اپنی تینوں سہیلیوں کو دیکھا۔ وہ بھی تھکاوٹ اور دیر ہونے کے سبب منہ لٹکائے کھڑی تھی۔

"چلو اب رائیڈ بک کرواؤ، میں رکشے میں نہیں جاؤں گی۔" نازک مزاج انیلا نے جمائی لیتے ہوئے جیا اور یاسرہ کو گھورا تھا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں، گھر جا کر بھی آرام نہیں ملے گا اس لیے تم میں سے کوئی۔ یہ کام کرے۔"

جیا کہتے ہوئے ایک سائیڈ ہو کر بیٹھ گئی تھی۔

یاسرہ نے اچھے بچوں کی طرح موبائل نکالا اور رائیڈ بک کروائی تھی۔ "چلو پانچ منٹ میں آ رہی ہے رائیڈ۔" تینوں اپنے بیگ سنبھالتی یونی ورسٹی کے مین گیٹ کی طرف بڑھی تھیں۔

پانچ منٹ میں مطلوبہ گاڑی ان کے سامنے تھی۔ دھوپ سے بچنے کے لیے فائل آنکھوں پر رکھے جیا نے گاڑی دیکھ کر پورا منہ کھولا تھا۔

"یہ...... یہ اتنی کھٹارا گاڑی منگوائی ہے تم نے؟ جیا نے باآواز بلند یاسرہ کو لتاڑا تھا۔

"اتنے پیسے خرچ کر کے بھی اس کھٹارا میں جانا پڑے گا تو کیا فائدہ اس سے اچھا رکشہ منگوا لیتیں، کبھی تو کوئی کام ڈھنگ سے کیا کرو۔" جیا کو

اے سی والی گاڑی نہ آنے کا شدید افسوس ہوا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ گاڑی لاوارث یا آٹو پائلٹ نہیں بلکہ اس کا ایک عدد "ڈرائیور" بھی ہے جو اس وقت گاڑی میں موجود تھا۔ کھلے شیشوں کے باعث جیا کی آواز بمعہ تاثرات کے ساتھ اس تک پہنچ چکی تھی۔ اس نے بھی بنا تاخیر، بے اختیار گردن موڑ کر اس منہ پھٹ لڑکی کو دیکھا تھا۔ ہلکے گلابی لان کے سوٹ میں ملبوس دوپٹہ شانے پر پھیلائے وہ ایک تیکھے نقوش والی پیاری سی لڑکی تھی، سر پر بندھا جوڑا اس لڑکی کے منہ سے بھی بڑا لگ رہا تھا۔ چھوٹی چھوٹی گھنگھریالی لٹیں چہرے کے اطراف میں پڑی ہوئی تھیں۔

ناگواری کے اظہار کے باوجود وہ گاڑی میں آ کر بیٹھ چکی تھی۔ جیا ڈرائیونگ سیٹ کے عین پیچھے بیٹھی تھی۔ ڈرائیور نے بے ساختہ بلکہ باقاعدہ اسے بیک مرر میں گھورا تھا۔

اس کی نظروں میں واضح خفت تھی۔ جسے کچھ ہی دیر میں جیا نے اس کی بار بار خود پر پڑتی نگاہوں سے محسوس کر لیا تھا۔ صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ بیک ویو مرر میں ضرورتاً نہیں بلکہ ارادتاً بلکہ انتقاماً دیکھ رہا تھا۔

گوگل میپ کو فالو کرتے ہوئے اس نے یاسرہ، انیلا اور سب سے آخر میں جیا کو اتارا تھا۔ گاڑی کا کرایہ جیا نے ایزی پیسہ موبائل سروس کے ذریعے پے کیا تھا۔

"معاف کردیں آپ کی مرسڈیز کو "کھٹارا" کہہ دیا۔" جیا گاڑی سے اترتے ہوئے کہے بغیر نہیں رہ سکی تھی۔ پتا نہیں کیسا شخص تھا جو اتنی سی بات پر پورا راستہ اسے کینہ توز نظروں سے گھورتا آیا تھا، دل میں رکھ کر اسے کیا کیا نہ بددعائیں دیتا رہے گا۔ وہ تو ویسے ہی حالات کی ماری تھی۔ اور روحان کو اس لڑکی سے ہرگز اس مزید جلتی پر تیل چھڑکنے والی معذرت کی توقع نہیں تھی وہ بس منہ کھول کر دیکھتا رہا۔

"بات سنیں۔" وہ گاڑی سے اتر چکی تھی جب روحان نے اسے پکارا تھا۔

جیا کی آنکھیں سوالیہ انداز میں اس پر مرکوز ہوئی تھیں۔

"معذرت کے لیے شکریہ۔" چبا چبا کر کہتا وہ گاڑی کو بھگا لے گیا تھا۔

"سنبھل کر کہیں یہ عظیم الشان سواری کسی ہلکی سی شے سے ٹکرا کر چکرا ہی نہ جائے۔" جیا کو بھی غصہ آیا تھا، کیا ہوا جو اس نے نہ سنا تھا پر جیا نے کہہ تو دیا تھا نہیں تو کتنی دیر خود پر یوں کسی کی بات سننے کا غصہ نکالتی رہتی۔ دوبارہ کون سی ملاقات ہونی تھی جو وہ چار باتیں سنا کر دل ہلکا کر لیتی۔ مگر یہ اس کی خام خیالی تھی۔ اس کی اس شخص سے بہت سی ملاقاتیں ہونے والی تھیں۔

اور روحان جواب تو دے آیا تھا اس لڑکی کو، مگر اس کے ذہن میں مسلسل لفظ "کھٹارا" کی گردان چل رہی تھی۔ ساتھ میں اس کا پرکشش چہرہ، جس پر چہرے سے بھی بڑا یاد رہ جانے والا جوڑا موجود تھا۔ سوچتے سوچتے اس نے سر جھٹکا تھا۔

پتا نہیں آج کے دن کی شروعات ہی ایسی ہوئی تھی، پہلے صبح ابا سے سامنا، اپنی گاڑی کے بارے میں وہ کتنا حساس تھا اور آج اسے دوسری تیسری بار اپنی گاڑی کے بارے میں یہ ناگوار لفظ سننے کو ملا تھا۔ اس کے بعد وہ آفس گیا، ایوننگ کلاس لی مگر سر جھٹکنے کے باوجود وہ لڑکی اور اس کے کہے الفاظ مسلسل اس کے ذہن میں گردش کرتے رہے۔

☆☆☆

گاڑی تو کھٹارا تھی پر منزل پر بروقت پہنچا دیا تھا۔ جیا نے وقت پر پہنچنے پر شکر ادا کیا تھا نہیں تو امی سے اچھی خاصی ڈانٹ یقینی تھی۔

وہ گھر پہنچی تو انعم اور فائزہ بھی کالج سے آ چکی تھیں۔ ابو بیزار سے برآمدے میں بیٹھے انعم اور فائزہ کو آپس میں باتیں کرتا دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر تک امی نے بھی آ جانا تھا۔

دن کے دو پاٹوں میں چکی کی طرح گھومتی امی اسکول ٹیچر تھیں، وہ نہایت باہمت، مضبوط خاتون تھیں، انہیں زندگی سے اگر کوئی امید نہیں تھی تو شکوہ بھی نہیں تھا وہ اپنی مشقت بھری زندگی سے بھی مطمئن تھیں کہ اس قابل تھیں کہ تگ و دو کر سکیں۔ دن بدن بڑھتی مہنگائی اور محدود ذریعہ آمدنی سے کچھ بعید نہیں تھا کہ وہ لوگ متوسط طبقے سے نکل کر نچلے طبقے میں شامل ہو جاتے!

نانا نانی کے انتقال کے بعد میکے میں ایک بھائی رہ گئے تھے۔ آہ بڑی بہن اقرا کی شادی کے موقع پر رقم کی ضرورت پڑی تو امی نے، ان سے وراثت میں اپنا حصہ طلب کر لیا تھا جو نانا ابو اپنی وفات سے پہلے ہی ان کے نام کر چکے تھے، لیکن ماموں نے وہ حصہ امی تک منتقل نہ کیا تھا۔ امی نے خود ان سے کبھی مطالبہ نہ کیا کہ انہیں جب ٹھیک لگے گا وہ دے دیں گے۔ لیکن اقرا کی شادی پر اخراجات کا اس قدر بوجھ پڑا تھا کہ امی کو زبان کھولنی پڑی اور یہی وجہ بنی کہ ماموں اور امی کا تعلق بس نام کا رہ گیا۔ ماموں نے اپنے تئیں اخذ کر رکھا تھا کہ بہن نے وراثت معاف کر دی ہے۔ انہوں نے مانگنے پر حصہ تو دے دیا لیکن دل میں گانٹھ باندھ لی، اور اسی گانٹھ نے ملنے جلنے کے تمام دروازے بند کر دیے تھے۔

جیا یعنی اشجیہ چار بہنوں میں دوسرے نمبر پر تھی۔ اقرا پیا دیس سدھار چکی تھی اور اپنے گھر میں خوش

تھی۔ قاعدے کے رو سے اب شادی کی باری جیا کی تھی۔ پر جیا اتنی سادہ اور آسان نہ تھی پھر اسے ماں باپ کی جدوجہد، تنگ دستی اور جاب ختم ہونے کے بعد ابو کی بے بسی کا پورا احساس تھا۔ اس وقت انہیں جیا کی ضرورت تھی۔ وہ جوان اور توانا تھی۔ وہ ان کا ہاتھ بٹانا چاہتی تھی۔ مشکل کی اس گھڑی میں ان کا ساتھ دینا چاہتی تھی۔ زمانے بھر کے لوگ جب ترس کھاتے کہ ان کا کوئی بیٹا نہیں تو جیا کو قطعاً اچھا نہ لگتا، وہ انہیں بیٹا بن کر دکھانا چاہتی تھی۔ اسی لگن میں اسے پیسہ کمانے کا جنون ہو چکا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے بہت سے مسائل کا حل صرف پیسے کے حصول سے ممکن تھا۔

مگر اس کی ماں کو کون سمجھاتا جن پر بس دھن سوار تھی کہ وقت پر بیٹیوں کے ہاتھ پیلے ہو جائیں۔ بے شک وہ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھی جنہیں قسمت سے اچھے ماں باپ ملے تھے جو خود غرض نہ تھے۔ اپنے اکیلے رہ جانے کی وجہ سے انہیں بیٹیاں بیاہنے میں ذرا تامل نہ تھا۔

اپنے خیالوں میں الجھی، جیا کھانا کھا رہی تھی جب امی اسکول سے گھر پہنچی تھیں، انہوں نے آتے ہی جھٹ پٹ ناصرف تمام پھیلاوا سمیٹا تھا بلکہ مہمان خانے کی صفائی اور ان کے سامنے رکھے جانے والے تمام لوازمات بھی سلیقے سے پلیٹوں میں نکال کر باورچی خانے میں رکھ دیئے تھے تاکہ مہمانوں کی آمد پر جلد بازی اور افراتفری نہ ہو۔ جیا ان کا جوش اور پھرتی دیکھ رہی تھی، مائیں بھی بوڑھی نہیں ہو سکتیں۔

امی کی دوست اور کولیگ روبینہ آنٹی بہت ہی زیرک اور سوشل تھیں، اکثر ہی ان کے پاس کوئی اچھا رشتہ موجود ہوتا۔ اب جب سے ابو نے کہا تھا کہ جیا کے لیے کھلے ذہن کے لوگ چاہیئے تو عجیب و غریب لوگ ہی برآمد ہو رہے تھے۔

آج بھی ایسا ہی ہوا تھا آنے والی خواتین چار عورتیں تھی لڑکی کی اماں اور بہن۔ خالہ اور پھپھو۔

''کیا کرتی ہو؟'' لڑکے کی اماں نے آنکھوں سے جیا کو اسکین کرتے ہوئے پہلا سوال کیا تھا۔ آمد کے ساتھ ہی بغیر جھجکے وہ مدعے پر آئی تھیں۔

''فورتھ ائیر میں ہوں اردو لٹریچر۔'' جیا نے نارمل انداز میں بتایا تھا۔ اسے پتا تھا آج کل کے ڈیجیٹل دور میں اس کی یہ اردو سے محبت، پذیرائی حاصل نہیں کرے گی اور وہی ہوا تھا۔

''اچھا اردو میں کر رہی ہو۔'' ان کے انداز میں شدید مایوسی تھی۔

''اردو لٹریچر، اس کا کہاں اتنا اسکوپ کیا کر لو گی زیادہ سے زیادہ ٹیچنگ اس میں تو اتنی کمائی نہیں، وہی لگی بندھی نوکری اور تنخواہ۔'' پھپھو نے رشتے کا حق ادا کرتے ہوئے صاف گوئی سے کام لیا تھا۔

''کوئی بات نہیں آج کل دنیا محدود نہیں رہی، سبجیکٹ کوئی بھی ہو، لڑکیاں آن لائن بہت کام کرتی ہیں اور اچھے خاصے پیسے کما رہی ہیں۔'' لڑکے کی بہن بولی تھی جو خود بھی ینگ تھی کافی زمانہ شناس لگ رہی تھی۔

''میں کرتی ہوں لیکن فی الحال اس سے اتنی ارننگ نہیں ہوتی'' جیا نے اپنے کانٹینٹ رائٹر ہونے کی بات گول کر دی تھی۔ آن لائن کام کا سن کر خالہ کی آنکھیں چمکی تھیں۔ انہوں نے کئی کہانیوں میں راتوں رات امیر ہوتے آن لائن کام کرنے والے ہیرو ہیروئن دیکھے تھے۔

''کیا کرتی ہو؟ کون سے پلیٹ فارم پر کام کرتی ہو؟ آن لائن تو اچھی خاصی کمائی ہوگی؟''

جیا کو ان کا یہ سوال بالکل پسند نہیں آیا تھا، وہ اپنی کمائی کی ذاتی نوعیت کی باتیں کسی سے ڈسکس کرنا پسند نہیں کرتی تھی۔ اس لیے ان کے لاکھ کریدنے پر بھی خاموش رہی۔ ان لوگوں نے بھی اکتا کر موضوع بدل دیا تھا۔

موضوع بدلا تو بات جیا کی قابلیت سے ہوتی ہوئی گھریلو امور خانہ داری پر آ گئی، انہیں لڑکی نہیں مکمل پیکج چاہیے تھا۔

''کیا انٹرویو ختم ہو گیا ہے میں جاؤں؟'' جیا نے تھوڑی دیر کی گفتگو سے بھانپ لیا تھا کہ اس کے حساب سے یہ بیل منڈھے چڑھنے والی نہیں، اسی لیے

وہ اب کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنے والی تھی۔اس نے جمائی روکتے ہوئے پوچھا تو امی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔

''اصل میں صبح کی اٹھی ہوئی ہے یونی ورسٹی سے ابھی آئی ہے تو تھکی ہوئی ہے'' امی کو بھی اندازہ ہو گیا تھا پھر بھی گھر آئے مہمانوں سے بدتمیزی و بد اخلاقی انہیں گوارا نہ تھی۔

''ہاں جاؤ۔'' انہوں نے جیا کی صاف گوئی کا بہت برا منایا تھا۔

جیا اجازت ملتے ہی فوراً اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔امی کی تیز نگاہوں نے دور تک اس کا پیچھا کیا تھا۔کچھ ہی دیر میں امی اندر آئیں تھی چہرے پر پھیلا جلال لفظوں کا محتاج کہاں تھا۔

''کیا ہوا چلے گئے، کیسے لوگ تھے۔'' ابو نے سوال کیا تھا۔

''ابھی تک گوش گزار نہیں کیا آپ کی بیٹی نے کہ کیسے لوگ تھے؟ اچھے خاصے لوگ لگ رہے تھے لڑکا بھی سول انجینئر تھا، کھلے ذہن کے بھی تھے انہیں جیا کی نوکری پر قطعی اعتراض نہ ہوتا۔''

ابو اور جیا نے بے ساختہ ایک دوسرے کی طرف دیکھا تھا۔

''امی اچھے لوگ تھے؟ صاف دکھائی دے رہا تھا ان لوگوں کا لالچ انہیں کماؤ ہی نہیں، ایک اشارے پر تمام ہاؤس چوکس کرنے والی ''روبوٹک'' بہو چاہئے تھی۔دیکھا نہیں آپ نے کیسے کیسے سوال کیے۔سلائی آتی ہے؟ کھانا پکانا آتا ہے؟ کپڑے دھو لیتی ہو۔پڑھائی میں کیسی ہو۔اگر جاب کرنی پڑ گئی تو کر لوگی، جاب کے ساتھ گھر کے کام کر لوگی۔'' جیا نے باپ کو تفصیل بتائی تھی۔

''ہاں تو اچھا ہی ہوا جو ٹل گئے۔'' ابو نے ہلکے سے لہجے میں جیا کی تائید کی تھی۔

''ٹل کیا گئے ابو اتنا وقت، انرجی جو ضائع ہوئی وہ الگ۔کل رمشا آپی کی منگنی ہے، مجھے نیناں نے کہا تھا شام سے آ جانا، اب میں اتنا تھک گئی ہوں اور وہاں بھی جانا ہے۔'' جیا نے نڈھال ہو کر باپ کو بتایا تھا۔

''ہو لیے رشتے آپ یونہی شہہ دیتے رہیں گے نا تو بیاہ لیا میں نے اسے۔'' امی صلواتیں سناتے ہوئی وہاں سے چلی گئی تھیں۔

ابو دوا کے زیر اثر آنکھیں موندے بیٹھے تھے، وہ کئی برس سے شوگر اور بلڈ پریشر کے عارضے میں مبتلا تھے۔کمزور لاغر ابو کو دیکھ کر دل میں ایک ہوک سی اٹھتی، اگر میری شادی ہو گئی تو ابو کا خیال کون رکھے گا۔وہ سوچتی اور پریشان ہوتی اس کا حل جیا کے پاس یہی تھا کہ وہ شادی نہیں کرے گی۔امی ابو کے ساتھ رہے گی ان کا خیال رکھے گی۔اور بہت سا پیسہ کمائے گی۔ایک دن امی بھی ضرور یہ بات سمجھ جائیں گی۔یہ بات سوچتے ہی وہ مطمئن ہو جاتی۔یہ اطمینان قطرہ قطرہ اس نے اپنے اندر اتارا تھا۔یہ اعتماد اسے اس کے خوابوں نے دیا تھا۔

☆☆☆

''کیا ہوا جیا! اس خوشی کے موقع پر منہ کیوں لٹکایا ہوا ہے؟'' نیناں نے جیا کو دیکھ کر پوچھا تھا۔نیناں جیا کی پڑوسن اور اچھی دوست تھی۔خوشی کا موقع یہ تھا کہ نیناں کی بڑی بہن کی کل منگنی تھی۔منگنی کیا تھی ایک چھوٹی سی گھریلو تقریب تھی جس میں لڑکے والے رمشا کو انگوٹھی پہنانے آنے والے تھے۔

''منہ نہیں لٹکایا ہوا، میں تھکی ہوئی ہوں شدید، رمشا آپی سے ملنے آئی تھی، انہیں مہندی بھی تو لگانی ہے۔'' جیا مہندی لگانے میں ماہر تھی۔

''مہندی لگانے آئی تھی مطلب؟ آج یہاں نہیں رکو گی؟'' نیناں نے اس کا ارادہ بھانپتے ہوئے خفگی سے کہا تھا۔نیناں نے کئی مہینے پہلے بہن کی بات پکی ہونے پر کہہ دیا تھا کہ منگنی والے دن وہ یہیں رکے گی۔

''اگر ایسا ہے تو سوچنا بھی مت، نہیں تو اچھا نہیں ہوگا، رمشا آپی تو اب کوئی کام نہیں کر سکتیں تمہیں ہی میری مدد کروانی ہے۔'' نیناں نے پیار بھری دھونس جماتے ہوئے جیا کو گھورا تھا۔

''یار، ہاں میں کب انکار کر رہی ہوں بس تھکی ہوئی ہوں، آج کا آدھا دن بہت ہی تھکا دینے والا!

گزرا ہے۔" جیا نے جمائی لیتے ہوئے کہا تھا۔

"ابھی تو تمہیں پوری رات جاگنا ہے اور تمہیں ابھی سے نیند آ رہی ہے، اور ہاں آج تو تمہیں دیکھنے لڑکے والوں نے آنا تھا ناں کیا ہوا آئے تھے وہ لوگ کوئی بات بنی؟" نیناں کو جیسے یاد آیا تھا۔

"ان کا مت پوچھو ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھ سے پریڈ بھی کروا لیں میں نے بھی انہیں آئینہ دکھا کر ہی چلتا کیا۔" جیا نے پاس پڑی پلیٹ میں سے نمکو منہ میں ڈالتے ہوئے نیناں کو بتایا تھا۔

"تم بھی ناں پتا ہے آنٹی کتنی حساس ہیں تمہارے رشتے کے لیے، رشتہ طے ہونا نہ ہونا الگ، کم سے کم تم تو چپ رہا کرو۔" نیناں نے پوری تفصیل سن کر بردباری سے کہا تھا۔

"میں بلاوجہ پنگے نہیں لیتی، کوئی خوشی سے لے تو اسے چھوڑتی نہیں۔ یہی میرا اصول ہے وہ ایسے سوال جواب کر رہی تھیں ان کا بس نہیں چل رہا تھا مجھے کہہ دیتی کہ "یہ کر کے دکھاؤ، چلو وہ کر کے دکھاؤ۔" جیا بات کو گانے کی صورت مزید واضح کر کے ہنسی تھی۔

"ویسے بھی مجھے ابھی شادی نہیں کرنی، مجھے بہت کام کرنا ہے، بہت سا پیسہ کمانا ہے، دنیا گھومنا ہے، اگر میں نے شادی کی بھی تو کسی ایسے لڑکے سے کروں گی جو پیسے والا بھی ہو اور دل والا بھی جو میرے امی ابو کو اپنا سمجھے۔" جیا نے جوش سے کہا تھا۔

"کیا کرو گی جیا اتنا پیسہ کما کر۔" نیناں سب جانتی تھی پھر بھی اسے چھیڑا تھا۔

"سب سے پہلے اپنے یہ جھاڑ جیسے بال سیدھے کرواؤں گی۔" جیا کو اس گرمی میں اپنے بالوں سے سخت الجھن ہوتی تھی کہ بے حد گھنگریالے اور گھنے تھے۔

"کروا لو سیدھے اتنے مہنگے تو نہیں اب تو ہر کوئی کروا رہا ہے۔" نیناں نے اسے بہت آسان حل بتایا تھا۔

"ہاں مہنگا نہیں ہے چارجز مناسب ہیں، مجھے اسی لینتھ پر کروانے ہیں سیدھے۔" جیا نے اپنے لمبے بالوں کی طرف اشارہ کیا تھا۔

نیناں، رمشا اور جیا نیچے فرش پر بیٹھ کر منگنی میں دیئے جانے والے تحائف پیک کر رہی تھیں، ساتھ ساتھ گفتگو بھی جاری تھی۔ جیا چونکی جب برآمدے سے ملحق اندر بنے چھوٹے سے اسٹور روم میں کھٹکا ہوا تھا۔ ساتھ ہی کسی نے الٹے قدم باہر پاؤں نکالا تھا ایک ہاتھ میں لمبی سی تار موجود تھی۔

"الیکٹریشن ہے اندر؟" کب سے قینچی کی طرح چلتی جیا کی زبان رکی تھی۔

"ذیشان بھائی اور ان کے دوست ہیں، منگنی کی لائٹنگ کے لیے چھت پر کنکشن دے رہے ہیں۔"

"الیکٹریشن" لفظ پر وہاں کھڑے شخص نے پیچھے مڑ کر دیکھا تھا۔ پسینے کے ننھے ننھے قطرے پیشانی پر چمک رہے تھے۔ جیا کی نظر بھی اس کی سمت اٹھی تھی۔ جیا کا منہ ایک بار پھر کھلا رہ گیا تھا واقعی دنیا گول تھی۔ وہ تو وہی ڈرائیور تھا۔

روحان بھی اسے دیکھ کر چونکا تھا، صبح کھٹارا، کھڑ مسیڈیز اور کھٹارا کہہ کر گویا زخم پر نمک چھڑکتی ہوئی معذرت اور اب الیکٹریشن، یہ لڑکی بغیر سوچے سمجھے بولنے کی عادی لگتی تھی۔ دوپہر کو اسے برابر والے گھر میں چھوڑ کر وہ ایوننگ کلاس لینے کے بعد یہاں آیا تھا کہ اس نے ذیشان سے کہا تھا کہ وہ اسٹیج ڈیکوریشن اور لائٹنگ کا کام کر لے گا بلاوجہ الیکٹریشن کو بلا کر پیسے ضائع نہ کرے۔ یہ پیشکش ذیشان نے بخوشی قبول کرتے ہوئے اسے رات رکنے کی دعوت دی تھی۔ روحان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس لڑکی سے دوبارہ یہاں ملاقات ہوگی۔

"چائے ملے گی" اسٹور سے ذیشان بھائی نے نکل کر چائے کی فرمائش کی تھی۔

"جی بھائی ابھی لیں۔" نیناں کہتے ہوئے کھڑی ہوئی تو یہاں سے کیسے کہاں غائب ہو، سوچتی ہوئی جیا بھی نیناں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

روحان اور ذیشان چھت کی طرف گئے تھے۔

☆☆☆

کہنے کو چھوٹا سا فنکشن تھا، پھر بھی گھر میں ہزار کام بکھرے پڑے تھے۔ نیناں کی کزن مہندی لگوانے جمع ہوئی تھیں۔ جیا پوری جانفشانی سے انہیں مہندی لگا رہی تھی۔ روحان اور ذیشان کا کام مکمل ہو چکا تھا۔ روحان اوپر والے کمرے کی بالکنی میں اس زاویے سے بیٹھا تھا کہ اسے نیچے صحن کے بیچوں بیچ بیٹھی مصروف سی جیا مہندی لگاتی نظر آ رہی تھی۔

دوبارہ اس کا جیا سے سامنا نہیں ہوا تھا کہ وہ نیناں کے ساتھ تیاریوں میں مشغول تھی۔ اور اب وہ کتنی دیر سے بیٹھی مہندی لگا رہی تھی۔ یہ لڑکی صبح سے اس کے حواسوں پر سوار تھی۔ سر پر بندھے بڑے سے جوڑے کا راز کھل چکا تھا کہ وہ مہندی لگاتے ہوئے بار بار اکتا کر اپنی لمبی اور موٹی چوٹی کو ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے پر منتقل کر رہی تھی۔

وہ منہ پھٹ ٹائپ لڑکی تھی، اس کے خیالات بھی روحان سن چکا تھا۔ مادہ پرست، خوابوں میں رہنے والی۔ روحان کو اس قسم کی سوچ رکھنے والے لوگ کبھی پسند نہیں آ سکتے تھے۔ مگر یہاں معاملہ الٹ ہوا تھا۔ وہ نٹ کھٹ ادھار نہ رکھنے والی منہ پھٹ لڑکی روحان کو پسند پہلے آ گئی تھی۔ خیالات بعد میں معلوم ہوئے تھے۔ اور روحان کافی دیر سے دیکھ رہا تھا وہ اپنے کہے لفظوں کے برعکس نرم دل پر خلوص لگ رہی تھی۔

"دل والا، پیسے والا، گھر والوں کو اپنا سمجھنے والا......" روحان کے خیال میں اس کے لفظ گونجے تھے۔ ایک ساتھ اتنی خوبیاں، دوسروں سے شکوہ کرنے والی کو خود بھی تو مکمل پیکج چاہیے تھا۔

"وہ جیسی بھی ہے، اس کی جو بھی سوچ ہے، ٹھیک ہے مجھے اچھی لگی ہے مگر اس سے زیادہ کیا کرنا ہے؟" "میں کیوں اتنا سوچ رہا ہوں اس کے بارے میں؟ روحان نے خود کو سرزنش کرتے ہوئے آنکھیں موندی تھیں۔

☆☆☆

رات دیر گئے مہندی لگا کر فارغ ہوئی جیا وہاں رکی نہیں تھی، آج چھٹی کا دن تھا، وہ اپنے حصے کے کام نمٹا کر نیناں کی طرف آ گئی تھی۔ رمشا آپی بھرے ہوئے کام والے ہلکے سبز و گلابی جوڑے میں بہت ہی پیاری لگ رہی تھیں۔ جیا بھی سادہ سا آف وائٹ گولڈن نفیس کام سے مزین سوٹ پہنے ہوئے بہت پیاری لگ رہی تھی۔ موٹے گھنگریالے بال وزنی سی چوٹی میں مقید کاندھے سے ہوتے شانے پر پڑے تھے۔

اسے بھی نیناں اور رمشا آپی کے ساتھ پارلر جانا تھا۔ لوگ سچ کہتے تھے جس چیز سے جتنا بھاگو وہ اتنا ہی پلٹ پلٹ کر ملتی ہے۔ شومئی قسمت کہ وہ جس گاڑی میں ایک بار مشکل سے بیٹھی تھی، اسے اس میں دوبارہ بیٹھنا پڑا تھا۔

"معلوم نہیں تھا دوبارہ بھی یہ شرف ملے گا زندگی میں۔" منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہ گاڑی میں بیٹھی تھی۔

وہی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے روحان نے بھی کہاں سوچا تھا کہ وہ دوبارہ ملے گی اس طرح۔

جیا کو اس کی نظریں اب بھی معنی خیز اور خفا محسوس ہو رہی تھیں۔ پھر بھی وہ کل کی نسبت پرسکون لگ رہا تھا۔ ایک دو بار سرسری نظر ڈالنے کے بعد اس نے جیا کی طرف نہیں دیکھا تھا۔

روحان نے انہیں اتار کر واپسی کا وقت پوچھا تھا۔ رمشا آپی سے وقت پوچھ کر وہ پلٹ گیا تھا۔ شام سات کے قریب وہ واپس آیا تو موسم کی خوش گواری انتہاؤں پر تھی۔

جیا اور نیناں اندر رمشا کا فوٹو شوٹ اپنے موبائل میں کر چکی تھیں۔ وہ دونوں بھی وہیں سے تیار ہوئی تھی۔ انہیں اپنی بھی سیلفیاں لینی تھیں۔ پارلر کے احاطے میں باغیچہ تھا وہ باہر نکل کر اپنی سیلفیاں لے رہی تھی جب ہلکی پھوار شروع ہوئی۔ جیا پوری طرح

مگن اپنی سیلفیاں لے رہی تھی۔

روحان وہاں پہنچا تو نیناں رمشا کو لیے جیا کو آواز دیتے ہوئے جلدی سے گاڑی میں بیٹھی تھی۔

"کیا انہیں نہیں آنا؟" روحان نے رمشا سے پوچھا تھا۔

ہلکی پھوار یکدم ہی تیز ہو گئی تھی۔ جس نے جیا کے بالوں کو اچھا خاصہ نم کر دیا تھا۔ وہ انہیں جھٹک رہی تھی۔

"آ رہی ہوں،" جیا نے چوٹی جھٹکتے ہوئے نیناں کو اشارہ کیا ساتھ ہی تیزی سے آگے بڑھی تھی۔ تیزی سے آگے بڑھتی جیا کے ہاتھ میں مقید اس کا موبائل پوری طاقت سے زمین پر آن گرا تھا۔ گرتے ہی فون کی اسکرین چکنا چور ہو گئی تھی۔ اسے افسوس ہوا تھا مگر وہ باقی ماندہ فون اٹھائے گاڑی میں آ کر بیٹھی تھی۔

"کیا ہوا جیا، فون ٹوٹا ہے؟" نیناں نے دیکھا تھا فون گرتے اور اسکرین ٹوٹتے اسی لیے پوچھا تھا۔

"ہاں اسکرین ٹوٹی ہے، خیر ہے کی پیڈ فون تھا۔" جیا نے عام سے لہجے میں کہا تھا جیسے اسے فون ٹوٹنے کا قطعی افسوس نہ ہوا ہو۔ اور یہی بات ایسی تھی کہ روحان خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔

"کی پیڈ فون کیا مفت میں آتا ہے؟" روحان نے اسے گھورتے ہوئے آرام سے طنزیہ لہجے میں سوال کیا تھا۔

"ایکسکیوز می!" جیا کو اس کی بات اور لہجہ برا لگا تھا۔

"سوری لیکن چیزیں خراب کرنے کے بعد یہ لاپروائی کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" روحان نے کہتے ہوئے گاڑی کا گیئر بدلا لیا تھا۔

"پیسے ضائع ہوئے ہیں تو میرے ہوئے ہیں ویسے بھی تھوڑے سے پیسے تھے۔ میرے پاس دوسرا فون بھی ہے۔" جیا کو اس بلاوجہ کی جواب دہی پر خوب غصہ آیا تھا۔

"پیسے چاہے تھوڑے ہوں یا زیادہ، تمہارے ہوں یا میرے ضائع نہیں ہونے چاہئے۔ محنت سے کمائے جاتے ہیں۔" روحان کہنا نہیں چاہتا تھا لیکن پیسوں کی بے وقعتی کوئی بھی کرتا اس سے ہضم نہیں ہوتی تھی۔ روحان نے دھیرے سے کہہ کر گاڑی آگے بڑھائی تھی۔

"کوئی بات نہیں روحان بھائی! جیا بہت پیسے والی ہے۔" نیناں نے مذاق میں بات کو مزاح کا رخ دیا تھا۔ وہ روحان کو اچھی طرح جانتی تھی کیونکہ روحان ذیشان کے بچپن کا دوست تھا۔ سو اسے روحان کا جیا کو ٹوکنا عجیب نہیں لگا تھا۔ اسے پتا تھا روحان کس قدر ذمہ دار اور فرض شناس لڑکا تھا۔ جیا اب گاڑی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ روحان کو اس کی خفگی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کی نظریں پلٹ پلٹ کر بیک ویو مرر میں جھکی جیا کو تک رہی تھیں، وہ دیکھنا نہیں چاہتا تھا مگر...... دل پر زور کہاں چل رہا تھا۔

"ہنہ۔ کنجوس نہ ہو تو......" جیا کے پاس روحان کی کمیوں کی ایک لمبی فہرست تیار ہو چکی تھی۔

"وہ غریب، کنجوس، کینہ پرور اور اور اور۔" یہ شخص کبھی جیا کی گڈ بکس میں نہیں آنے والا تھا۔

☆☆☆

فائنل سمسٹر کے بعد جیا فارغ تھی، امی کی رشتہ مہم زوروں پر جاری تھی، اب امی اقصیٰ اور فائزہ کے لیے بھی رشتے دیکھ رہی تھیں، جس کا بھی پہلے طے ہو جاتا انہوں نے کر دینا تھا۔ ابو بلڈ پریشر اور شوگر سے نبرد آزما رہتے۔ جیا پہلے پڑھائی کی وجہ سے صرف مخصوص آرٹیکل لکھنے کا کام کیا کرتی تھی مگر اب تو اس نے باقاعدہ ہر پلیٹ فارم پر لکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مارکیٹنگ، برینڈنگ، تعلیمی پراجیکٹس، فلمی تبصرے غرض سوشل میڈیا پر ملنے والے تمام کام ریسرچ کی مدد سے کر رہی تھی۔ کچھ پلیٹ فارمز پر ڈالر کی صورت معاوضہ ملتا جو کم ہوتا لیکن ڈالر کی وجہ سے اچھی لوکل کرنسی میں تبدیل ہو جاتا۔ وہ رینگ رینگ کر چل رہی تھی۔ ابھی تک کوئی بڑا پروجیکٹ نہیں ملا تھا۔ فری لانسر ہونا پرکشش تھا مگر اس کام میں اپنی نوعیت کی

مشکلات تھیں۔ کئی بار اسے اچھے معاوضے کی پیشکش ہوتی پر کام میں بہت تنوع دماغ گھما دینے والے موضوعات کلائنٹ کی طرف سے ملا کرتے۔ جس سے الجھن بڑھتی اور وقت ضائع ہوتا۔

کچھ کلائنٹ معاوضہ بھی کم کرتے اور ادائیگی بہت تاخیر سے کرتے۔ کئی بار کلائنٹ کام کروا کر پراجیکٹ میں بار بار بلا معاوضہ تبدیلی کرواتے رہتے۔ یہ بات پریشان کن ہوتی وہ اپنا کام ایمان داری سے کیا کرتی تھی۔ جیا نے بہت جلد یہ جان لیا تھا کہ یہ "ہوائی روزی" اور غیر مستحکم کام ہے۔ وہ مستقل مزاجی سے کام کرنے کے باوجود خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کر پائی تھی۔ پھر بھی مسلسل لگاتار کام کرنے سے اس کی پروفائل بتدریج بہتر ہو رہی تھی۔ اسے کام کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہ تھا۔

کام کام اور کام پر عمل پیرا جیا نہیں جان پائی تھی کہ کوئی ایسا بھی تھا جس کے لیے جیا بہت اہم ہو چکی تھی۔

"دل والا، پیسے والا۔۔۔ کیا آپ کی ڈیمانڈز کچھ کم نہیں ہو سکتیں؟" جیا کو اپنے سیل پر میسج موصول ہوا تھا۔

اور میسج پڑھ کر بے ساختہ ہونٹوں پر دل نشین سی مسکراہٹ در آئی تھی۔ اس کی تمام باتیں سن چکا یہ شخص کون ہو سکتا تھا اسے ابھی ادراک ہوا تھا۔

"نہیں ایک بھی نہیں۔" جیا کو اس میں ذرا دلچسپی نہ تھی پھر بھی جواب دے دیا تھا۔

"کیا یہ کھلا تضاد نہیں، کوئی اور ڈیمانڈ کرے تو وہ لالچی اسے مکمل پیکج چاہیے اور آپ کریں تو جائز۔" ایک اور میسج ملا تھا۔ صاف ظاہر تھا بندہ دل کے ہاتھوں مجبور سہی پھر بھی صاف بات کرنے کا عادی تھا۔

اب کی بار مبہم سا مسکراتی جیا کوئی جواب دیے بغیر دوبارہ اپنے کام میں لگ گئی تھی۔

☆☆☆

فائزہ کا کالج، اندرون سندھ ٹھٹہ کلری جھیل مکلی قبرستان ٹرپ پر جا رہا تھا۔ وہ کالج سے آتے ہی پر جوش سی جیا کو بتا رہی تھی۔ وہ اس ٹرپ پر جانے کا کب سے انتظار کر رہی تھی۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے کہیں جانے کی میں اکیلی لڑکیوں کو کہیں بھیجنے کی قائل نہیں ہوں۔" امی نے سختی سے کہہ کر منع کیا تھا۔

"امی! کوئی بات نہیں اس کی ساری سہیلیاں جا رہی ہیں اسے بھی جانے دیں۔ ایک دن کی بات ہے۔" جیا بیچ میں بولی تھی اسے یاد تھا امی نے ہمیشہ اسکول کالج میں کہیں بھی پکنک پر جانے کو اسے منع کیا تھا۔

"چند ہزار ہی تو دینے ہیں میں دے دوں گی۔" جیا آج کل بہت سارے پراجیکٹس کر رہی تھی جس کی وجہ سے اس کے پاس کچھ رقم جمع ہو چکی تھی۔ اسے کبھی بھی پیسوں کی وجہ سے اپنا اور بہنوں کا دل مارنا اچھا نہیں لگتا تھا۔

جیا کی اس بات پر امی نے سختی سے اسے ڈانٹ دیا تھا۔

"ہر بات میں پیسے کہاں سے آ جاتے ہیں جیا؟ میں دوسرے شہر نہیں بھیج سکتی اسے اکیلا۔"

"امی اکیلی کہاں ہے پورا کالج ہے سہیلیاں ہیں ٹیچرز ہیں۔" فائزہ نے امی کو قائل کرنے کی آخری کوشش کی تھی۔

"ہرگز نہیں۔" امی کہہ کر وہاں سے چلی گئی تھیں۔

اور جیا انہی باتوں پر تو کڑھتی آئی تھی وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ امی نے یہ کہہ کر بات بنائی تھی حقیقت میں تو اتنی بڑی رقم کسی "فالتو سی تفریح" کی مد میں دینا انہیں قطعی قابل قبول نہ تھا۔ وہ اتنی فضول خرچی افورڈ نہیں کر سکتی تھیں۔ جیا نے جو رقم جمع کی تھی اس کے بارے میں بھی انہوں نے تاکید کی تھی کہ یہ سنبھال کر رکھو کام آئیں گے۔ جہیز پر یا کسی اور موقع پر۔

جیا کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اپنی فیملی کے

ساتھ کبھی کوئی پکنک پلان کی تھی؟ یا کبھی وہ لوگ مل کر ڈنر یا لنچ پر باہر گئے تھے، یا کبھی اس نے ایسی شاپنگ کی تھی جو خرچ کا حساب کتاب رکھے بغیر کی جاتی ہے۔ بلکہ وہ تو چیز بعد میں پسند کرتی تھی پہلے پرائس ٹیگ دیکھا کرتی۔ اسی محرومی نے تو دل میں یہ خواہش ڈالی تھی کہ وہ بغیر ٹیگ دیکھے چیزیں خرید لی جائے بلا ضرورت، بے حساب، جب دل چاہے ڈنر پر جائے، ساحل دیکھنے کا من کرے تو گاڑی لے کر نکل جائے۔ کیا کبھی ایسا ہو سکتا تھا؟

☆☆☆

اسے یقین تھا ایک دن ضرور ایسا آئے گا وہ اپنے بل بوتے پر اپنی تمام خواہشیں پوری کرے گی۔ وہ دن رات کام کر رہی تھی۔ ابھی تک کوئی خاطر خواہ کامیابی ملی نہیں تھی۔ پھر ایک دن غیر متوقع طور پر اسے ایک ای میل موصول ہوئی تھی۔

اس میں لکھا تھا کہ انہوں نے جیا کی پروفائل دیکھی ہے اور انہیں اس کا لکھا پسند ہے انہیں کوئی خاص موضوع پر سیریز لکھوانی ہے پر کشش معاوضہ کی آفر بھی درج تھی۔ یہ میل پڑھ کر جیا کا دوران خون سمٹ کر دل تک آیا تھا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ پرجوش جیا ایک پل کو ٹھہری تھی، "اتنا سارا معاوضہ بغیر کسی نیمپل کی ڈیمانڈ کے، کہیں کوئی دھوکا نہ ہو۔ جوش یکدم ماند پڑا تھا۔ سرخ جھنڈا صاف دکھائی دے رہا تھا۔ پھر بھی ایسی پر کشش پیشکش ٹھکرانے پر جیا کا دل نہ مانا۔ اسے کوشش ضرور کرلی چاہیے۔ اگر جھوٹے لوگ ہیں تو گھر تک ضرور پہنچانا چاہیے۔

اس نے جوابی میل بھیجی تھی۔

وہاں سے ترنت جواب آیا تھا۔ انہوں نے اسے فون نمبر دیا تھا کہ تفصیل سے بات کرے۔

فون پر جو اسے تفصیل بتائی گئی وہ ہوش ربا تھی۔ دھوکا نہ تھا مگر پر کشش معاوضے کے بدلے انہیں "شیڈی (پر شبہ، حساس، پراسرار) کانٹینٹ چاہیے تھا۔ یہی نہیں وہ جب بھی ان سے پوچھتی وہ بار بار تفصیلات میں تبدیلی پیدا کر رہے تھے۔

وہ سن کر شدید بے چین ہو گئی تھی کرے نہ کرے؟ وہ نہیں کرے گی تو کوئی اور کر لے گا۔ ایسے موقع بار بار کہاں ملتے ہیں۔ وہ سوچ میں پڑی تھی۔ نام خراب ہو گا۔۔ تو کیا ہوا پیسے تو ملیں گے جب انسان وسیع پیمانے پر کمانے کی کوشش کرتا ہے تو مشکل کام بھی کرنے پڑتے ہیں۔ کام مشکل نہیں غلط ہے اندر سے کسی نے سرزنش کی تھی کام غلط یا صحیح نہیں ہوتا کام ہوتا ہے۔ رائٹر کی سوچ خیال وسیع ہونا چاہیے۔ وہ کئی دن تذبذب میں رہی، وہ ہزار تاویلیں دینے کے بعد بھی اندر سے مطمئن نہیں ہو پا رہی تھی۔ کسی فیصلے پر پہنچنا بہت مشکل ہو رہا تھا۔

"سچ ہے سوشل میڈیا دو دھاری تلوار ہے جہاں ایک کلک پر پوری دنیا آپ کی دسترس میں ہے وہیں آپ کی عزت بھی آپ کے ایک غلط فیصلے کی صورت داؤ پر لگی ہوئی ہے۔"

☆☆☆

ماں نے اس دن کہا تھا پیسے سنبھال کر رکھو کام آئیں گے۔ جیا کو ان پیسوں سے اپنے بال سیدھے کروانے تھے۔ اور بھی بہت سے کام جو وہ کب سے پس پشت ڈال رہی تھی لیکن دل کا ارمان دل میں رہ گیا تھا۔ قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ بہت زیادہ وقت نہیں ہوا تھا، وہ لوگ جلدی سونے کے عادی تھے۔ رات آہستہ آہستہ معمول کے مطابق سرک رہی تھی۔ اس کی انگلیاں اپنے لیپ ٹاپ پر تیزی سے چل رہی تھیں جب اس نے صحن میں پانی پینے اٹھے ابو کو زمین پر گرتے دیکھا تھا۔ اس کا کمرہ سامنے ہی تو تھا۔ وہ ابو کو دیکھ کر بھاگ کر چلاتی ہوئی ان کے پاس آئی تھی۔ اس نے بے قراری سے انعم فائزہ اور امی کو بھی پکارا تھا۔ سب ہی اس کی پکار سن کر ہڑبڑا کر اٹھے تھے۔ ابو سینہ پکڑے نیچے گرتے چلے گئے تھے۔

"پانی پانی لاؤ۔" امی کی آواز گھبرائی ہوئی تھی۔

"میں ذیشان بھائی کو بلاتی ہوں۔" جیا کے ذہن میں خیال بجلی کی طرح کوندا تھا۔ ان کے گھر میں کوئی مرد نہیں تھا۔ وہ مل کر بھی ابو کو سہارا نہیں دے

پارہی تھیں۔ وہ باہر نکلی تو ذیشان باہر ہی چبوترے پر بیٹھا ہوا تھا ساتھ روحان بھی تھا وہ شاید ملنے آیا ہوا تھا۔ اسے یوں دیکھ وہ بھی پریشان ہوا تھا۔

''کیا ہوا جیا؟'' ذیشان نے اسے بدحواس دیکھ کر پوچھا تھا۔

''ذیشان بھائی وہ ابو۔۔۔ وہ'' بول نہیں پا رہی تھی ذیشان اس کی بات پوری سنے بغیر اندر کی طرف بھاگا تھا۔ روحان نے بھی اس کی تقلید کی تھی۔

اندر پہنچ کر ذیشان نے وقاص صاحب کو سنبھالا ان کی گردن ایک طرف لڑھکی ہوئی تھی۔ وہ ہوش میں تھے مگر بول نہیں پا رہے تھے۔ انہیں انجائنا کا شدید اٹیک آیا تھا۔ روحان اور ذیشان انہیں گاڑی تک لے کر گئے تھے جیا اور سعدیہ بھی ان کے ساتھ گئی تھیں۔ نینان اور رمشا انعم اور فائزہ کے پاس رک گئی تھیں۔

اسپتال تک کا مختصر راستہ بہت طویل ہو گیا تھا۔ جیا ڈبڈبائی آنکھوں سے ورد کرتی جا رہی تھی۔

انہیں فوراً داخل کر لیا گیا تھا۔ ابتدائی رپورٹ کے بعد ڈاکٹرز نے مزید ٹیسٹ کروانے دے دیے تھے۔

''جیا! بل پوچھو بیٹا، میں جلد بازی میں کارڈ پیسے کچھ نہیں لائی. میں گھر جا کر لاتی ہوں پھر۔'' سعدیہ نے فکرمندی سے کہا تھا۔

''امی! آپ پریشان نہ ہوں میں دیکھتی ہوں۔'' جیا نے کاؤنٹر پر جا کر بل کی ادائیگی کے بارے میں پوچھا تو اسے معلوم ہوا کہ بل ادا ہو چکا ہے ''مگر کب اور کس نے؟ ذیشان بھائی نے؟'' اس نے سوچا تھا۔

وہ ماں کو ادائیگی کا بتا کر باہر آئی تھی روحان ایک طرف بنی بنچیز پر ہاتھ باندھے بیٹھا ہوا تھا۔

''ذیشان بھائی کہاں ہیں؟'' جیا نے روحان سے پوچھا تھا۔

''ذیشان چلا گیا ہے اسے آفس جانا تھا۔'' ذیشان کال سینٹر پر کام کرتا تھا آج کل اس کی نائیٹ ڈیوٹی ہوتی تھی روحان اسے آفس پہنچانے کے لیے ہی آیا ہوا تھا۔

''اوہ وہ مجھے پوچھنا تھا کہ بل کس نے ادا کیا ہے۔'' جیا اتنا کہہ کر خاموش ہوئی تھی۔

''ہسپتال میں ایڈمٹ ہوتے ہی فارم بھرنا تھا اور بل کی ادائیگی کرنی تھی۔ آپ دونوں بہت پریشان تھیں تو بل میں نے ادا کر دیا تھا۔'' روحان نے جھجکتے ہوئے بتایا تھا۔

اس بات پر جیا کی آنکھیں تحیر سے پھیلی تھیں۔ آنکھوں میں دھواں بھر گیا تھا۔ اس بھری دنیا میں ماں باپ کے علاوہ کوئی اپنا نہ تھا۔ زندگی میں پہلی بار اپنائیت کا احساس ملا تھا وہ بھی ایک اجنبی سے۔ وہ ڈھنگ سے اس کا شکریہ بھی ادا نہ کر سکی۔

''میں آپ کو ابھی ٹرانسفر کرتی ہوں۔'' جیا کا روم روم شکرگزار تھا وہ اسے کنجوس سمجھتی تھی وہ کنجوس نہیں وقت پر کام آنے والوں میں سے تھا۔

''کوئی بات نہیں آپ ایزی رہیں، صبح دیکھ لیں گے۔'' روحان نے بہت آرام سے کہا تھا۔

''آپ چلے جائیں میں اور امی ہیں ابو کے پاس۔ اب ابو بہتر ہیں۔'' جیا جانتی تھی کہ وہ روز وشب ایک سخت روٹین پر عمل پیرا رہتا ہے۔

''یہاں اسپتال میں دو لوگوں کا رکنا آلاوڈ نہیں ہے۔ آپ کو گھر چلنا ہے تو میں چھوڑ سکتا ہوں۔''

وہیں سعدیہ بھی آئی تھیں۔

''روحان بیٹا! تمہارا بہت شکریہ، ایسے وقت میں تو اپنے بھی کام نہیں آتے۔'' وہ جان گئی تھیں وہ ذیشان کا دوست تھا۔ ذیشان ان کی بات پر چپ رہا۔

''جیا! تمہارے ابو کے پاس میں ہوں تم چلی جاؤ روحان کے ساتھ۔'' امی اب پرسکون ہو چکی تھیں۔ انہوں نے جیا کو روحان کے ساتھ جانے کو کہا تو جیا خاموشی سے روحان کے ساتھ چل دی تھی۔

آج وہ پیچھے نہیں بلکہ روحان کے ساتھ والی

سیٹ پر بیٹھی تھی۔ وہ منہ پھٹ، ذہین و شوخ آنکھوں والی، لڑکی اداس دل گرفتہ، مایوس نظر آرہی تھی۔ روحان کو اس کا اداس ہونا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

روحان نے ایک اسٹور پر گاڑی روکی تھی۔

"یہ لو پانی پیو۔" روحان نے پانی اس کے آگے بڑھایا تھا۔ جیا نے بغیر کچھ کہے بوتل لے کر منہ سے لگائی تھی وہ کب سے پیاسی تھی اسے اب احساس ہوا تھا۔

"انکل اب ٹھیک ہیں تم پریشان مت ہو۔" روحان نے اسے تسلی دی تھی۔

جیا نے ممنون نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"میں جانتا ہوں ماں باپ اولاد کے لیے کیا معنی رکھتے ہیں، ان کی کمزوری و بیماری اولاد کو توڑ کر رکھ دیتی ہے مگر تمہیں حوصلہ رکھنا ہوگا تا کہ تم اپنی بہنوں اور ماں کو سنبھال سکو، اور پیسوں کے لیے پریشان نہ ہونا، کچھ نہ کچھ بندوبست ہو جائے گا۔" وہ شاید جیا کو بلواسطہ طور پر اپنے ہونے کی یقین دہانی کروا رہا تھا پر جیا نہ سمجھی تھی۔

بھلا ایسا یقین کب کسی نے دلایا تھا جو وہ سمجھ پاتی۔ اور روحان اس سے بھی کہاں اتنی شناسائی تھی، پھر جیا خود دار بھی تھی وہ یونہی کسی کی مدد کیسے لے سکتی تھی۔

پھر بھی اس نے آنکھیں پونچھ کر سر ہلایا تھا۔ روحان کی باتوں سے اسے بہت تسلی ملی تھی۔

وہ دونوں گھر پہنچے تو جیا نے ایک بار پھر اس کا شکریہ ادا کیا تھا۔ جیا نے گھر پہنچتے ہی اپنی جمع شدہ رقم ٹرانسفر کی تھی۔ اور کتنے مہینوں سے کتنی اہم ضرورتیں پس پشت کر کے جمع کی ہوئی رقم چٹکیوں میں اڑ گئی تھی۔ پھر بھی اسے افسوس نہیں ہوا تھا کہ یہ رقم اس کی زندگی کے سب سے اہم انسان اس کے باپ کے کام آئی تھی۔

امی ٹھیک کہتی تھیں اگر وہ پہلے ہی اپنی چھوٹی چھوٹی خواہشوں میں پیسے اڑا دیتی تو آج خالی ہاتھ ہوتی۔ کم از کم اس کا بھرم تو برقرار رہا تھا۔

☆☆☆

"آج پھر دال بنالی؟" کب سے کھانے کا انتظار کرتے اظہار صاحب نے، ماش کی دال دیکھتے ہی منہ بنایا تھا ساتھ ہی کھانے کی ٹرے پرے کھسکائی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف ہی کریں، کتنی بری بات ہے یوں کھانے کو پرے ہٹانا؟ بھول گئے وہ وقت جب یہ دال بھی مشکل سے نصیب ہوتی تھی۔" زینت کو میاں کے یہ بچوں جیسے انداز ایک آنکھ نہ بھاتے تھے۔

"بس برے وقت یاد کرنا، وہ بھول جاتی ہو جب روز کھانا کھلانے ہوٹل لے جایا کرتا تھا۔" اظہار صاحب نے چمک کر جواب دیا تھا۔

"اچھی طرح یاد ہے بھولی نہیں ہوں کہ کیسے سال میں دو ماہ روزانہ بلاناغہ ہم باہر سے کھانا کھاتے تھے اور باقی دس ماہ بھی یاد ہیں اچھی طرح جب ایک وقت کا کھانا کھا کر دوسرے وقت کا پتا نہیں ہوتا تھا کہ کھانا ملے گا بھی کہ نہیں۔" زینت نے افسردہ انداز میں تاسف سے اپنے مجازی خدا کو دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

"بری باتیں ہی یاد رکھنا جو عیش و عشرت کروائے وہ بھول گئیں ناشکری عورت۔ اب تو تمہارا بیٹا کماتا ہے اب مجھے باتیں سنانا بند کرو۔" اظہار صاحب بھوک اور پر سے بیوی کی چخ چخ سے بیزار ہو کر بولے تھے۔

"بیٹا کماتا ہے اسی لیے اللہ کا شکر ہے کہ جو بھی دال دلیہ ہے چل رہا ہے اچھی طرح اس کے لیے ناشکری نہ کرو۔" انہوں نے کہا تھا جبکہ جانتی تھیں سب بے سود ہے۔ بھینس کے آگے بین ہی بجا رہی ہیں۔

"اچھا اب فون کرو روحان کو میری پسند کی نلی و مغز نہاری لیتا آئے ساتھ تندوری نان آٹھ اور میٹھے کا بھی کہہ دو، رس ملائی اور دودھ دلاری۔" انہوں نے دل کی بات بتا کر بات لپیٹی تھی۔

زینت انہیں خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔ یہی اللے تللے ان کی زندگی بھر کی ناکامیوں کا سبب تھے۔

"کچھ دن اعتدال سے کھالو، پھر آرہی ہے بقر عید، کرنا چھ ماہ عیاشی۔" انہوں نے ان کی فرمائش پر جھنجھلا کر کہا تھا۔

"رہنے دو تم ماں بیٹے کہاں رکھنے دیتے ہو گوشت قربانی کا، پچھلی بار پندرہ دن سب شہد تب پتا۔" اظہار صاحب کے دل میں شکوے ہی شکوے تھے ماں بیٹے کے خلاف۔

"اس بار کچھ چلے گا، بڑا جانور کرنے کا ارادہ ہے روحان کا۔" زینت نے آرام سے کہا تھا جسے سن کر اظہار صاحب کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں۔

"کیا سچ میں ان کا بیٹا اس قابل ہو گیا تھا کہ اس مہنگائی میں بڑا جانور کرتا؟" وہ سوچ میں پڑ گئے تھے۔ کتنے گھنے ہیں دونوں ماں بیٹے مجال ہے مجھے خبر ہونے دیں کسی بات کی۔ اللہ جانے کتنا پیسہ دبائے بیٹھے ہیں۔

"میں خود کرتا ہوں اپنے بیٹے کو فون۔" ایسے موقعوں پر وہ روحان سے خوب لگاوٹ کا مظاہرہ کیا کرتے۔ وہ نفی میں سر ہلاتی وہاں سے چلی گئی تھیں کہ وہاں رہتیں تو کچھ اور منہ سے پھسل جاتا تھا۔

☆☆☆

وقاص ہسپتال میں ہی تھے، ان کی طبیعت کافی سنبھل گئی تھی لیکن ڈاکٹر نے کہا تھا کہ دل کے تین والوز بند ہیں انہیں لازمی اسی ہفتے اسٹنٹ ڈالنے ہوں گے اسٹنٹ ڈالنے کا مطلب تھا لاکھوں کا خرچا۔

امی اور جیا بہت پریشان تھیں۔ کچھ رقم امی کے پاس جمع تھی کچھ چاہیے تھی۔

وہ فیصلہ جو پہلے جیا شوق کے ہاتھوں بھی نہ کر پائی تھی وہ مجبوری کے ہاتھوں آسانی سے ہو گیا تھا۔ جیا نے اس آئی آفر کو ہاں کہہ دیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں آگاہ کر دیا تھا کہ اسے رقم فوراً چاہیے۔

انہیں انکار کیوں ہوتا اسے کہا گیا کہ یہاں اسکرپٹ ان کے حوالے وہاں رقم جیا کے اکاؤنٹ میں، جیا کو ایک ساتھ کئی قسطیں لکھ کر دینی تھیں۔ اسے کسی بھی حال میں جلدی لکھ کر مکمل کرنا تھا، وہ پوری طرح لکھنے میں منہمک ہو گئی، اسے کچھ ہوش نہ تھا ماسوائے اس کے کہ کسی بھی طرح جلدی سے کام مکمل کرلے تاکہ ابو کا آپریشن وقت پر ہو سکے۔ ابو اسپتال میں تھے، امی انعم فائزہ دن رات اسپتال میں اور گھر کے درمیان گھن چکر بنی ہوئی تھیں۔ وہ کام کے دباؤ کی وجہ سے اسپتال نہیں جا پا رہی تھی۔ اس نے اپنی ماں کو بتا دیا تھا کہ اسے یہ پروجیکٹ کسی بھی حال میں وقت پر مکمل کرنا ہے۔

"جیا بیٹا، تمہارے ابو تمہیں بہت یاد کر رہے ہیں، آج چلو میرے ساتھ، رات کئی بار انہوں نے پوچھا کہ تم اسپتال کیوں نہیں آرہیں۔" سعدیہ کو جیا کی مصروفیت کا علم تھا پھر بھی وہ چاہتی تھیں کہ آج جیا ان کے ساتھ اسپتال جا کر باپ سے مل لے۔

"امی، آج میرا کام ختم ہو جائے گا۔ میں کل صبح ہی اسپتال آجاؤں گی۔ کام کے بعد پےمنٹ ہو گی تو ان شاء اللہ ابو کا آپریشن بھی آج کل میں ہی ہو سکے گا۔" جیا بہت پرامید تھی اور مطمئن بھی کہ کل ضرور ابو سے مل لے گی۔ آخر وہ اتنی محنت بھی تو ان کے لیے ہی کر رہی تھی۔

اسکرپٹ دیتے ہی اسے پیسے بھی مل گئے تھے۔

اس نے فوراً پیسے اسپتال میں جمع بھی کروا دیئے تھے۔ ضروری کاغذی کارروائی سے فارغ ہوتے ہی وہ کچھ پرسکون ہوئی تھی کہ باپ کا سہارا بننے کے قابل تھی۔

مگر قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ وہ تمام اہم چیزوں سے فارغ ہو کر باپ سے ملنے پہنچی تو ان سے مل نہ سکی انہیں کچھ دیر پہلے ہی شدید اٹیک آیا تھا اور وہ ڈاکٹروں کی کوششوں کے باوجود جانبر نہ ہو سکے۔ وہ سکتے میں رہ گئی۔ اس کے لیے دنیا ختم ہو چکی تھی۔

وہ ماں بیٹیاں تنہا رہ گئی تھیں۔
کیا نہیں کرنا چاہتی تھی وہ ان کے لیے اور کیا نہیں کیا تھا اس نے۔ اس کی تمام کوششوں، دعاؤں رت جگوں اور ریاضت کے بعد بھی ابو چلے گئے تھے۔ ایسے کہ وہ باپ سے آخری بار مل بھی نہ سکی تھی۔ ابو اسے بار بار بلا رہے تھے شاید انہیں پتا چل گیا تھا کہ ان کے پاس وقت نہیں بچا۔ اور وہ یہ کہہ کر کہ بس کام ختم ہوتے ہی جائے گی۔ اسپتال جانے والوں سے ملاقات کو ٹالنا نہیں چاہیے۔
پیسے ہوتے ہوئے بھی وہ اپنے باپ کو نہیں بچا سکی تھی۔ پیسہ اہم تھا مگر پیسے سے ہر چیز نہیں خریدی جا سکتی، ثابت ہوا تھا۔ پیسوں سے علاج خریدا جاسکتا تھا زندگی نہیں۔
ابو گئے گھر تو سونا ہو گیا تھا، ذرا ہوش آیا تو دل ملامت کرتا رہا۔ کلائنٹ نے میل کی تھی مزید اقساط لکھ دیں وہ ہوش میں آئی یہ کس راہ پر چل پڑی تھی وہ اور لکھ کر دے گی۔ اور پیسہ ملے گا مگر یہ آسان پیسہ اسے راس آنے والا نہیں تھا۔ اس کے کسی کام کا نہیں تھا یہ پیسہ اس کے باپ کو نہیں بچا سکا تھا۔ وہ اب اس پیسے کو حاصل نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس کے دل میں احساس جرم نے گھر کر لیا تھا یہ اسی کے گناہوں کی سزا تھی جو ابو بچ نہ سکے۔
مجھے میرا اسکرپٹ واپس دیں مجھے یہ کام نہیں کرنا۔
اس نے عجلت میں مطلوبہ شخص کو میسج بھیجا تھا۔
''مس، آپ ہوش میں ہیں؟ پروفیشنلی ایسا ممکن نہیں آپ کام کے عوض پے منٹ لے چکی ہیں۔''
''مجھے نہیں پتا مجھے اپنا اسکرپٹ واپس چاہیے۔'' وہ بہت بری طرح پیش آرہی تھی۔
''اچھا اگر آپ کو اتنا ہی افسوس ہے تو رقم واپس کردیں میں اسکرپٹ دے دوں گا۔'' وہ جانتا تھا کہ جس لڑکی نے پیسوں کی ضرورت سے اسے اتنی جلدی اسکرپٹ لکھ کر دیا تھا وہ پیسے کہاں سے دیتی۔
اور واقعی جیا سوچ میں پڑ گئی تھی تین لاکھ کہاں سے دے گی؟

☆☆☆

''روحان میں کہہ رہا ہوں کہ میں تمہاری شادی کرنا چاہتا ہوں محسن کے گھر۔ اب تم ہاں کہو یا نہ۔'' اظہار صاحب نے روحان سے بات کرنے کی ٹھانی تھی۔
وہ اس کی شادی اپنے بھائی کی بیٹی سے کرنا چاہتے تھے کہ وہ بہت پیسے والے تھے۔
''ابو، آپ کو ایسا کیوں لگتا ہے کہ محسن چاچو مجھے بخوشی اپنا داماد بنانے کو تیار بیٹھے ہوئے ہیں۔ انہیں ایک سے بڑھ کر ایک لڑکا مل سکتا ہے اپنی بیٹی کے لیے۔'' روحان نے صاف گوئی سے کہا تھا۔
''دیکھا نہیں محسن تمہاری کتنی عزت کرتا ہے کیسی ستائش ہوتی ہے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے۔'' کہتے ہوئے اظہار صاحب کا سینہ چوڑا ہوا تھا جیسے روحان کی ترقی ان کا کمال تھی۔
''ہاں تو عزت تو کرے گا ناں ایسے خوددار اور محنتی بچے کہاں ملتے آج کل، ان کے اپنے بچے تو بس باپ کا پیسہ اڑانا جانتے ہیں دونوں ہاتھوں سے۔'' امی نے اصل بات بتائی تھی۔
''تب ہی تو کہہ رہا ہوں اتنا پیسہ ہے اس کے پاس غیروں میں کرے گا بیٹی کی شادی خوب جہیز دے گا کتنے تو گھر بنا رکھے ہیں اس نے بیٹی کو دینے کے لیے تو ہمارا روحان کیوں نہیں؟ زندگی گزر جاتی ہے گھر بنانے میں۔'' وہ تنک کر بولے تھے جیسے روحان قائل ہی ہو جائے گا۔
''ابو، آپ پیسے کی وجہ سے مجھے بیچنا چاہتے ہیں؟'' روحان کو معلوم تھا کہ باپ لالچی ہے مگر اس قدر؟ وہ سمجھا تھا کہ بھائی کی محبت میں ایسا سوچ رہے ہیں۔
''بیچنا کیسا؟ شادی کرنے کا کہہ رہا ہوں۔'' وہ اب تھوڑے سٹپٹائے تھے۔
''مجھے بتائیں ان کا پیسہ ہمارے کس کام کا؟

ان کا دیا جہیز یا پیسہ کتنے دن چل سکتا ہے ابو؟ کیا ساری زندگی وہ ہمیں بٹھا کر کھلائیں گے؟ اور ہم ہماری کوئی عزت نفس نہیں ہم بخوشی لیں گے سب؟ میں کسی کے پیسے پر نظر نہیں رکھ سکتا۔ آپ یہ خیال دل سے نکال دیں۔ اب اس موضوع پر آپ سے کوئی بات نہیں کروں گا۔" روحان تنگ آچکا تھا ان کی بے جا ضد سے۔

"نہ مانو میری بات پچھتاؤ گے، محنت کرتے رہو خوار ہوتے رہو، رات رات بھر گاڑی چلاؤ ہڈیاں گھس جائیں گی وقت سے پہلے۔ طاقت ور سسرال ہو تو زندگی کی اونچ نیچ میں سہارا رہتا ہے۔ مجھے دیکھو ناکام ہوا تو کوئی پیچھے نہ تھا جو تم ماں بیٹے کو آسرا دیتا۔"

"تم نے تو محنت نہیں کی تمہاری تو پھر بھی گھس گئی ہڈیاں۔" کمزور میکے کا طعنہ سن کر امی کے تو تن بدن میں آگ ہی لگ گئی تھی۔

اور بات کا رخ امی ابو کی لڑائی کی طرف جاتا دیکھ روحان نے سر پکڑا تھا۔

"چلیں آئیں منڈی چلیں گے میرے ساتھ جانور لینے؟" روحان نے ان دونوں کی تکرار سے گھبرا کر اچانک آفر کی تھی۔

"تم ہی جاؤ مجھے خوار ہونے کا کوئی شوق نہیں۔ لیکن سنو جانور ایسا لینا۔" انہوں نے اچھے جانور کی خوبیاں بیان کرنا شروع کی تھیں۔ روحان مسکراتے ہوئے محض سنتا رہا۔ وہ بخوبی بات کو پلٹ چکا تھا۔

☆☆☆

احساس ضمیر کے کچوکے کھاتی جیا نے کام کاج تقریباً چھوڑا ہوا تھا کسی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ کیا کرے کس سے کہے؟ اس نے جاگتی آنکھوں سے اپنی حیثیت سے بڑے خواب ضرور دیکھے تھے لیکن خوابوں کو کسی بھی قیمت پر پورا نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس سے جو بھی ہوا وہ سب اس نے اپنوں کی غم خواری میں کیا تھا۔ پھر بھی جو ہوا تھا وہ اب پچھتا رہی تھی۔ اس کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا تھا۔

☆☆☆

روحان کے والد اظہار صاحب ہمیشہ کے کام چور اور اونچے اونچے خواب دیکھنے والے انسان تھے۔ وہ کاروبار کے نام پر لون لیتے اور اس پیسے کو عیاشی میں اڑا دیا کرتے۔ کچھ دن تو بہت عیش کرتے پھر وہی ڈھاک کے تین پات فاقوں کی نوبت آ جاتی۔ ان کے اس غیر ذمہ دارانہ رویئے کی وجہ سے روحان کی تعلیم دو بار تعطل کا شکار ہوئی۔ محسن اظہار کے بھائی تھے مگر ان سے الٹ وہ محنتی اور کاروباری ذہن رکھنے والے انسان تھے، وہ اپنے بھائی کی خصلت پہچانتے تھے۔

وہ برے حالات میں اپنے بھائی کی مدد تو کرتے مگر اس طرح کے وہ پھیل ہی نہ جائیں اور ان پر ہی تکیہ کر کے نہ بیٹھ جائیں۔ روحان کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب وہ فرسٹ ائیر میں تھا اور اسے پیسوں کی ضرورت تھی پڑھائی کے لیے، وہ پہلی اور آخری بار اپنے لیے پیسے مانگنے گیا تھا چاچا کے پاس تو انہوں نے اسے پیسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ اب تم بڑے ہو گئے ہو اپنا خرچہ خود اٹھاؤ باپ جیسے نہ بنو اور وہ دن تھا اور آج کا دن روحان نے پلٹ کر ان سے کچھ نہیں مانگا تھا۔

وہ چپڑاسی بنا، اخبار بیچے، کئی ہوٹلوں پر چھوٹا بن کر رہا، رک رک کر سہی تعلیم حاصل کرتا رہا کہ اس پر گھر کے اخراجات اور واجبات کی ذمہ داری بھی تھی۔ پتا نہیں ایک گھر کیسے بچارہ گیا تھا۔ شاید امی کی دعائیں اور نیکی تھی۔

یونہی چھوٹے چھوٹے کام کرتے ہوئے وہ فری لانسنگ کی دنیا میں آیا تھا۔ اس نے بہت جلدی یہ سمجھ لیا تھا کہ اسے اچھی آمدنی کے لیے کوئی اور کام مستقل بنیادوں پر کرنا ہوگا کہ فری لانسنگ کا کام پرکشش مگر ہوائی کام تھا۔ وہ سمجھ داری سے چھوٹے چھوٹے کام کر کے پیسہ جمع کرتا رہا اور پھر اس نے آن لائن ہی اپنا بچوں کے گارمنٹس کا بزنس شروع کیا تھا۔ جو اس کی محنت اور نیت سے پھل پھول گیا تھا۔

لیکن اس نے اپنے انداز نہیں بدلے تھے۔اسے اپنی کھٹارا سے آج بھی اتنی ہی محبت تھی کیونکہ وہ کھٹارا اس کا پہلا خواب اس کی پہلی محبت تھی۔جو اس نے نہایت چھوٹے چھوٹے کیے کاموں سے جمع کر پیسوں سے خریدی تھی۔یہی وجہ تھی کوئی اس کی لاڈلی گاڑی کو کھٹارا کہتا تو اس کے دل پر لگتا تھا۔آج اتنا پیسہ کمانے کے بعد بھی اس کے قدم زمین پر تھے۔وہ اپنی دولت کی نمائش نہیں کرتا تھا باپ کی فضول خرچیوں و شاہانہ طبیعت سے واقف تھا۔

روحان کو ان سے شکایتیں تھیں لیکن وہ اس کے باپ تھے وہ ان سے الجھتا ضرور تھا مگر کبھی بدتمیز نہیں ہوا تھا۔کہ باپ کی ناراضی خدا کی ناراضی تھی ماں نے ہمیشہ یہی سکھایا تھا۔

☆☆☆

جب انسان سے کوئی غلطی ہوتی ہے تو اسے یہی لگتا ہے کہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔جیا کو بھی ایسا ہی لگتا تھا وہ مرجھا کر رہ گئی تھی۔وہی گھر تھا وہی لوگ تھے وہی سب کچھ تھا وہ پہلے بھی سکون سے نہیں تھی اپنی چھوٹی چھوٹی غیر آسودہ خواہشات اور خوابوں کی وجہ سے اور آج اسے احساس ہوا تھا کہ وہ چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی زندگی میں کتنی اہم تھیں۔ماں بہنوں کے ساتھ مل کر گھر کے کام کرنا۔اسکول کالج سے آکر دن بھر کی روداد ایک دوسرے کو سنانا۔رات کو بیٹھ کر ایک ساتھ چائے پینا۔بارش میں بھیگنا پکوڑے کھانا۔یہ اسے تب احساس ہوا جب یہ چھوٹی خوشیاں بھی اس سے چھن گئی احساس ندامت کے ہاتھوں۔اس نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔بہت دنوں بعد اسے ہوش آیا تو دیکھا اس کی جگہ اور لوگوں نے لے لی تھی یہ دنیا بہت تیز تھی وہ اداس ہو رہی تھی۔

اپنی ماں کے کہنے پر ذہن بٹانے کو اس نے گھر کے پاس ایک اکیڈمی میں پڑھانا شروع کر دیا تھا۔

کبھی کبھی روحان کی وہ خفا بھری آنکھیں جن میں اب نرمی اور مہربانی تھی، اسے یاد آتیں مگر وہ سر جھٹک دیتی۔پتا نہیں وہ اسے یاد کرتا ہوگا یا نہیں۔

اور بڑی لمبی عمر تھی روحان کی، اس نے یاد کیا اور اس کا میسج آیا تھا۔

"اشجیہ......" جیا نے دیکھ کر رسپانس نہیں دیا تھا۔

مجھے جواب دینا چاہیے یا نہیں؟ جیا کو لگتا تھا کہ وہ جانتی ہے اس کی آنکھوں میں اس کے لیے کیا پیغام چھپا ہوا تھا۔

"جیا!" پہلا میسج۔

"اشجیہ!" دوسرا میسج۔

جیا نے جواب نہیں دیا تھا۔

"اے میری رؤیا گر!" (خواب دیکھنے والی) روحان نے اب کی بار دکھتی رگ پر ہاتھ رکھا تھا۔

جیا کے لب مسکرائے تھے، انداز تخاطب ایسا تھا کہ وہ اب کی بار نظر انداز نہیں کر پائی تھی۔اس نے سادہ سا مسکراتا چہرہ بھیجا تھا۔

وہ اداس تھی روحان سمجھ گیا تھا۔

"فون کرنا چاہتا تھا کافی دنوں سے۔"

"بات سنو......ایک لڑکی کھو گئی ہے......اسے ڈھونڈ رہا تھا۔" پتا نہیں وہ کیا کہہ رہا تھا جیا پھیکا سا مسکرائی تھی۔

"وہ خوب صورت جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھنے والی لڑکی میرے خوابوں میں آتی تھی، اب کچھ دن سے وہ غائب ہے۔مجھے اس سے ملوا دو پلیز۔"

"میں نہیں جانتی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" جیا نے سنجیدگی سے جواب بھیجا تھا۔اداسی اس قدر گہری تھی کہ کوئی بات من میں ہلچل نہیں مچا رہی تھی۔

جیا کی سرد مہری پر روحان خاموش ہو گیا تھا اسے کچھ اور کرنا چاہیے۔اس نے سوچا تھا۔

☆☆☆

رمشا کی شادی تھی۔جیا اپنی پوری فیملی کے ساتھ گئی ہوئی تھی۔وہ رمشا کے پاس سے تصاویر لے کر آئی تو نظریں بے ساختہ یہاں وہاں گھومنے لگی۔وہ ابھی تک کہیں دکھا نہیں تھا۔ایسا تو نہیں ہو

سکتا تھا کہ وہ آیا نہ ہو، ہو سکتا ہے کوئی کام پڑ گیا ہو۔ جیا مختلف باتیں سوچ رہی تھی۔

"مجھے ڈھونڈ رہی ہو؟" وہ ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ کب سے اس کی نظروں کو یہاں وہاں کسی کی تلاش میں بھٹکتے دیکھ رہے روحان نے پاس آ کر پکارا تھا۔

"آپ......" جیا اس کی اچانک آمد پر گھبرائی تھی۔

"میں اس دن کچھ کہنا چاہتا تھا۔ ہماری بات نہ ہو سکی، آج کہوں گا۔ میں جانتا ہوں تمہارا معیار بہت بلند ہے، مگر مجھے دیکھو میں بھی کسی سے کم نہیں......" روحان نے جیا کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ "میں یہ نہیں کہتا کہ آسمان سے تارے توڑ کر لاؤں گا، زمین آسمان ایک کر دوں گا ہاں مگر زمین پر پورا پورا ساتھ دوں گا۔ ہمارے گھر کے سارے بل وقت پر ادا کروں گا، گھر کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤں گا، اور بھی وہ ہر بات جو میرے بس میں ہوئی کبھی پیچھے نہیں ہٹوں گا۔" روحان نے جذب سے بات مکمل کی تھی۔

"یہ کیا کہے گی ہمیں قبول ہے روحان بھائی۔" پتا نہیں کہاں سے اچانک نیناں اور انعم برآمد ہوئی تھیں۔

"یار وہ۔" روحان ان دونوں کی اچانک آمد پر خجل ہوا تھا۔ جیا مسکراہٹ چھپاتی وہاں سے غائب ہوئی تھی۔

"تمہارا جواب چاہیے میری رویا گر اجواب دیتی جاؤ۔" روحان نے پیچھے سے آواز لگائی تھی۔ اور جیا رک کر پلٹی تھی۔

"میرا جواب بہت قیمتی ہے، پروٹوکول فالو کے بغیر نہیں ملے گا۔" جیا کہتے ساتھ ہی پلٹ گئی تھی اور روحان اسے جاتا دیکھ کر مسکراتا رہا۔ اسے اس سر پھری لڑکی سے یہی امید تھی۔

☆☆☆

گولا کباب، چکن تکہ، بہاری بوٹی، مٹن کڑاہی، فرائی فش، ابا فون پر کیٹیرنگ والے سے روحان اور جیا کی منگنی کا مینیو طے کر رہے تھے۔

امی ابا کی فہرست سن کر بلند ہوتے فشار خون کو قابو کرتے ہوئے، تسبیح کے دانوں کو جلدی جلدی پھیر رہی تھیں کہ اسی پر دسترس حاصل تھی۔

اور روحان فون پر لگا حساب کتاب کرتا امی اور ابو دونوں کو دیکھ کر آسودگی سے مسکرا دیا تھا۔

☆☆☆

خوشبو رقص کرتی فضا میں بکھری ہوئی تھی۔ وہ سفید و گلابی موتیوں سے جڑے شاموز میں ملبوس تھی۔ جس کی جھلک روشنیوں میں آنکھیں خیراں کیے دے رہی تھی۔ کوئی خواب تھا جو حقیقت کا روپ دھارے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

اسٹیج پر اس کے برابر میں بیٹھا روحان، جس کی آنکھوں کی چمک سے ہال کی تمام روشنیاں گہنا رہی تھیں۔ روحان کی نظر صرف جیا پر جمی ہوئی تھی جیسے وہی اس کی سب سے بڑی کامیابی، سب سے بڑا اعزاز ہو۔ لمحہ تھم گیا تھا۔ پاس بیٹھے روحان اور وہ ایسے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے جیسے وہاں ان کے علاوہ کوئی موجود نہ ہو۔

"آپ تو چھپے رستم نکلے۔" جیا کہہ کر چپ ہوئی تھی۔

"وہ کیا؟" روحان کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"بزنس ٹائیکون کی چھوٹی سی فارم۔" جیا کہہ کر ادا سے مسکرائی تھی۔

"یعنی مکمل پیکج۔" روحان نے جیا کی بات مکمل کی تھی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا۔

اسٹیج کے پاس تصاویر لیتی نیناں اور انعم نے جلدی سے کیمرہ ان کی طرف موڑا تھا۔ روحان نے کیمرہ دیکھ کر ہاتھ سے آدھا دل بنا کر جیا کے آگے کیا تھا۔ جیا نے فوراً ہاتھ بڑھا کر مکمل کر کے پورا دل بنایا تھا۔ جسے کیمرے کے ایک کلک نے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔

☆☆

حمیرا شفیع

عید کے بعد

بقر عید کو گزرے اڑھائی ہفتے ہو چکے تھے مگر گھر میں موجود گوشت کے شیدائیوں کا جذبہ اور جنون ابھی تک روز اول کی مانند ترو تازہ تھا۔ بلاناغہ گوشت کی رنگ برنگی ڈشز بنائی اور کھائی جا رہی تھیں۔

اس وقت بھی اگر کچن میں جھانکا جائے تو چولہے پر دو پتیلیوں میں گوشت ابل رہا تھا۔ ایک میں کبابوں کے لیے اور دوسری میں یخنی پلاؤ بنانے کے لیے۔

"نا.....نا..... قارئین! آپ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ گھر والوں نے قربانی کا تمام گوشت فریزر میں گھسا لیا تھا۔

ایسا بالکل بھی نہیں ہوا۔ دادا جان نے سر پہ کھڑے ہو کر گوشت کے تین حصے بنوائے تھے اور صرف تیسرا حصہ ہی اسٹور کیا گیا تھا۔

دراصل اس بار گھر والوں کو ماشاءاللہ سے تین تین قربانیوں کی سعادت نصیب ہوئی تھی۔ ایک کٹا اور دو بکرے۔

اس حساب سے ضرورت مندوں اور رشتہ داروں کو بانٹ کر بھی اتنا وافر تھا کہ خاتون خانہ عید کے پہلے تین روز تک تو گوشت کو دھو دھلا کر اور پیکٹ بنا بنا کر فریزر کرتے کرتے نڈھال ہو چکی اور اب فرمائشی پروگرام پر پکا پکا کر ہلکان ہوئی جا رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ فریزر کا دروازہ کھولے بڑبڑا رہی تھی۔

"اب میں اس ڈھیر میں سے بھلا چانپوں کا پیکٹ کہاں تلاش کروں، گیس جانے میں پون گھنٹہ باقی ہے اور اب چانپوں کا سالن بھی بنانے کا آرڈر جاری کر دیا ہے۔ کہا بھی تھا کہ پیکٹوں کے اوپر چٹیں مضبوطی سے چپکانا۔ ساری اکھڑ گئی ہیں۔ اب نجانے چانپوں کا لفافہ کدھر ہے۔"

ادھر ادھر ہاتھ مار کر اس نے بالآخر چانپوں کا پیکٹ تلاش کر ہی لیا اور پھر نہایت احتیاط سے فریزر کا دروازہ بند کیا۔ پچھلی دفعہ کا تجربہ یاد تھا بے دھیانی میں ذرا زور سے دروازہ بند کرنے کی کوشش کی تھی تو ایک وزنی پیکٹ لڑھک کر پاؤں پر آ گرا تھا۔ پاؤں بری طرح سے سوج گیا تھا اور وہ کئی روز تک لنگڑا کر چلتی رہی تھی۔

☆☆☆

کھانا تقریباً تیار ہو چکا تھا۔ کچن میں ہر طرف گوشت کی سوندھی سوندھی سی خوشبو پھیلی تھی۔ دادا ابو پانی پینے ادھر آئے سدرہ چانپوں کا سالن ڈونگے میں نکال رہی تھی۔

"آج پھر گوشت بنا لیا؟"

"کیا کروں دادا ابو......؟ میرا تو اتنا دل تھا کہ دال چاول بناؤں مگر فرحان تو آج کل سوائے گوشت کے کچھ اور قطعاً نہیں کھا رہے۔

کہتے ہیں کہ سال بھر بعد تو اصلی اور خالص، صاف ستھرا گوشت نصیب ہوتا ہے۔ ورنہ سارا سال تو قصاب نجانے کس طرح کا مریل گوشت کھلاتے ہیں۔ حلال ہے یا حرام، یہ بھی پتا نہیں ہوتا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر صاف ستھری چیز بھی ایک حد تک فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ زیادتی تو ہر چیز کی نقصان دہ ہے۔"

"بس تم پودینے کی چٹنی اور لیموں پانی ضرور بنا لینا۔"

☆☆☆

کھانا بے حد لذیذ تھا۔ خاص طور پر چانپوں کا سالن بہت مزہ دے رہا تھا۔ فرحان میاں سر دھنتے ہوئے کھانے سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ عین اسی وقت پڑوس میں رہنے والی بھابھی صاحبہ چلی آئیں۔ ہاتھوں میں ایک ڈونگا تھام رکھا تھا۔

"آج کڑھی چاول بنائے تھے تو تم لوگوں کے لیے بھی لے آئی۔ مگر یہ کیا......؟" انہوں نے اپنے چشمے کے اوپر سے بغور ٹیبل کا جائزہ لیا۔

"بھئی تم لوگوں کے ہاں تو ابھی تک بقرعید کا گوشت چل رہا ہے۔ ہم نے تو سب بانٹ دیا تھا۔ صرف دو چار پیکٹ رکھے تھے۔ وہ تو کب کے ختم بھی ہو گئے۔"

سدرہ بیچاری اپنی جگہ چور سی بن گئی۔ دزدیدہ نظروں سے فرحان میاں کی طرف دیکھا جو بھابھی صاحبہ کے تبصرے سے بے نیاز اب یخنی پلاؤ سے انصاف کر رہے تھے۔

"بھابھی جان! آپ نے بہت اچھا کیا جو کڑھی چاول لے آئیں۔

میرا کتنا دل تھا کہ کڑھی بناؤں مگر پتا نہیں کیا بات ہے کہ آپ جیسی مزے دار اور چٹ پٹی کڑھی نہیں بن پاتی۔"

سدرہ اپنی خفت مٹانے کو بولی تو بھابھی صاحبہ اپنی تعریف پر پھول کر کپا ہی ہو گئیں۔

"تم تازہ دہی کی مت بنایا کرو۔ دہی کو دو تین دن رکھ کر کھٹا کر لیا کرو۔ اینڈ میں تھوڑی سی املی بھی ڈال دیا کرو۔"

وہ روانی سے چٹ پٹی کڑھی بنانے کی ٹپ بتا رہی تھیں۔ اس نے جلدی سے ان کے باؤل میں چانپوں کا سالن ڈال دیا۔ وہ رخصت ہوئیں تو فرحان میاں نے معنی خیزی سے ہنکارا بھرا۔

"اب بھابھی لوگوں نے چھوٹا سا دنبہ قربان کیا تھا۔ اس حساب سے ان کے پاس کا گوشت بھی کم تھا۔ وہ جلدی ختم ہو گیا اب ہمارے ہاں ماشاء اللہ سے زیادہ قربانی کی وجہ سے گوشت بھی وافر مقدار میں تھا۔ نا تم کیوں خوامخواہ شرمندہ ہوئی جا رہی تھیں۔ ہم سارا گوشت بانٹ کر اپنے حصے کا جائز ہی گوشت کھا رہے تھے۔"

فرحان میاں نے اپنی پلیٹ میں مزید پلاؤ نکالتے ہوئے تادیبی نظروں سے بیوی کو گھورا۔

"وہ یہ سب تھوڑی سمجھتی ہیں۔ اب جا کر سارے خاندان میں ڈھنڈورا پیٹیں گی کہ ہم ابھی تک قربانی کا گوشت کھا رہے ہیں۔"

"تو کیا اس بات پر ہماری تھانے میں طلبی ہو جائے گی۔" وہ چڑ کر بولے۔

"تھانے میں طلبی کا تو مجھے پتا نہیں مگر آج کل تمہارا جو حال ہے، کہیں اسپتال میں طلبی نہ ہو جائے۔ سدرہ بیٹا! اسے لیموں پانی پلاؤ۔"

دادا جان نے فرحان میاں کو سدرہ سے الجھتے دیکھ کر کڑے تیوروں سے گھورا۔

☆☆☆

دادا ابو کی پیش گوئی پوری ہوئی اور بڑے غلط وقت پر پوری ہوئی تھی۔

اس دن سدرہ نے کوفتہ بریانی بنائی تھی۔ بریانی میں مسالے کچھ تیز ہو گئے تھے۔ کوفتے بھی بیف کے تھے۔ بریانی کچھ ہیوی سی تھی۔ سب نے تھوڑی تھوڑی چکھی مگر فرحان میاں اپنا ہاتھ نہیں روک پائے۔ خوب ڈٹ کر کھائی۔ کھا کر سوئے۔

آدھی رات کے قریب پیٹ میں سونامی طوفان سا اٹھا۔ کراہ کر اٹھ بیٹھے۔ سارے دن کی تھکی ہاری سدرہ بے خبر سو رہی تھی۔ انہوں نے دبے پاؤں واش روم کے کئی چکر لگائے۔ پیٹ میں ناقابل برداشت درد کی لہریں سی اٹھ رہی تھیں۔

کراہتے ہوئے کچن کا رخ کیا۔ ارادہ تھا کہ خشک پودینے کا قہوہ بنا کر پئیں۔ ادھر ادھر بہتیرے ہاتھ مارے مگر خشک پودینے کا ڈبہ نہ ملا۔ کبھی کچن میں جھانکا ہوتا تو علم ہوتا کہ بیگم اس طرح کی اشیا کہاں رکھتی ہیں۔

پیٹ پکڑتے درد سے نڈھال اوپر والا کیبنٹ کھولا تو چائے کی پتی کا جار اڑتا ہوا ان کے سر پر ٹھک سے ٹکرا کر کھل گیا اور وہ سارے کے سارے چائے پتی سے نہا گئے۔

شور کی آواز سن کر جب سدرہ دوڑتی ہوئی کچن میں آئی تو سرتاج چائے پتی...... چائے پتی ہوئے پیٹ پکڑے فرش پر نڈھال گرے پڑے تھے۔

افتاں و خیزاں چھوٹے دیور کو جا کر اٹھایا۔

اس نے کھینچ کھانچ کر گاڑی میں ڈالا ور

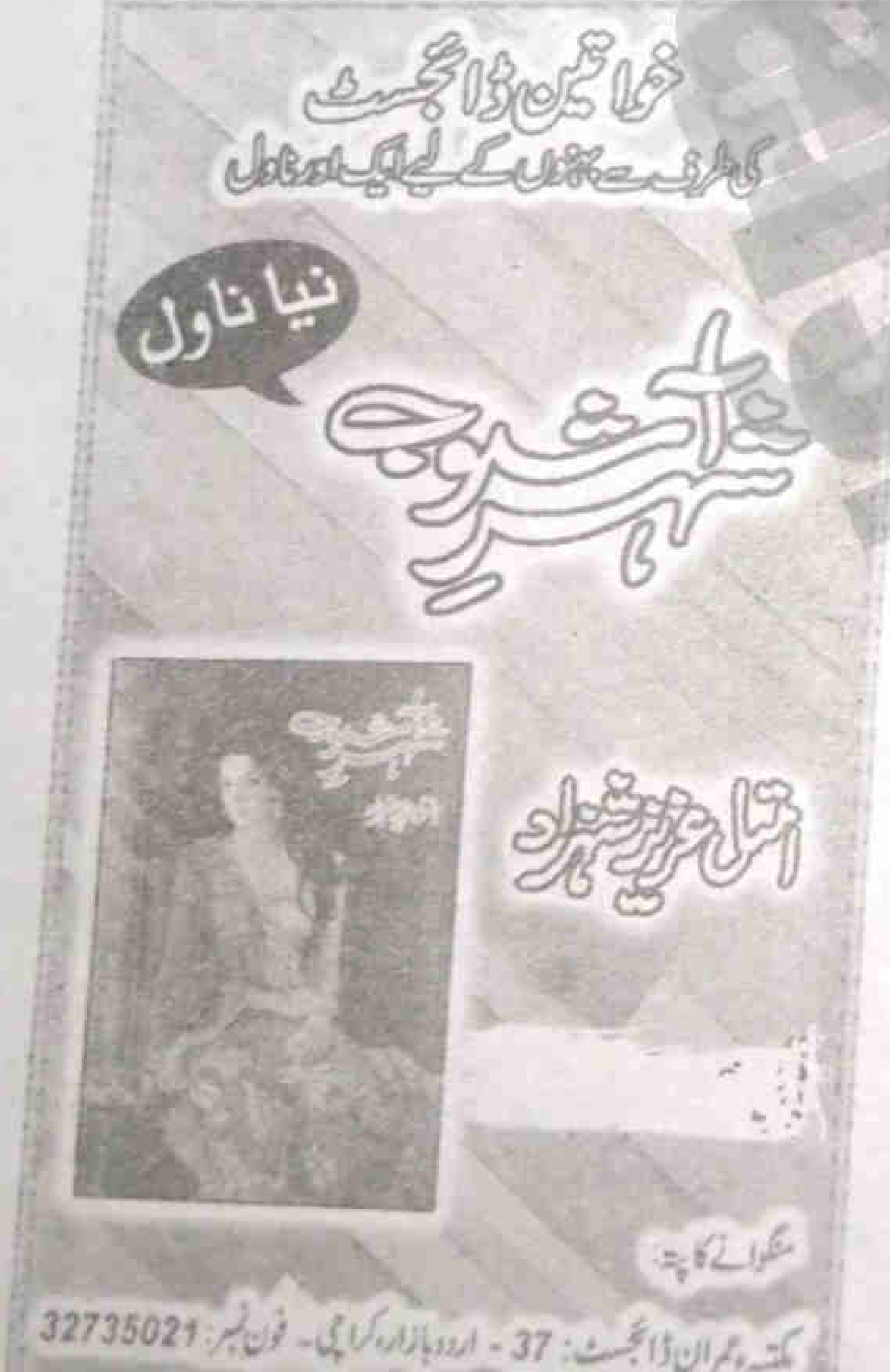

ابرجنسی لے آیا۔
سارا وارڈ اس طرح کے کیسز سے ہی بھرا تھا۔
"یہ بھی گوشت کی اوور ایٹنگ کا کیس ہے۔"
نے معائنے کے بعد ترنت انکشاف کیا۔ ان کو
ٹ کر کے ڈرپ چڑھا دی گئی۔
"آپ جیسے لوگوں کی وجہ سے ہمیں عید پر
ڈبل ڈیوٹیاں بھگتنی پڑ رہی ہیں۔" کرخت
والی نرس نے بے دردی سے انہیں انجکشن
ہوئے ناگواری سے کہا۔ وہ محض کراہ کر رہ

☆☆☆

بار شوہر کے سرہانے سدرہ بے چاری پریشان
تھی۔
ن کے بازو پر کنولا لگا تھا اور ڈرپ چڑھی تھی۔
ی موجود دیور نے اسی حال میں دونوں کی
س اپ کر دی۔ پھر کیا تھا، اسپتال میں رشتے
تانتا بندھ گیا۔ جو عیادت کم کر رہے تھے اور
زیادہ کر رہے تھے۔ رنگ برنگے تبصرے اور
پھبتیاں۔
قربانی کا گوشت سنبھل کر کھانا چاہیے۔ ہم تو
تقسیم کر دیتے ہیں۔ بس ایک آدھ پیکٹ ہی
لیے رکھتے ہیں۔"
ہم بھی سارا گوشت بانٹ کر اپنا حصہ ہی
تھے۔" وہ بیڈ پر لیٹے لیٹے کراہے۔
قربانی کا گوشت تو بہت بھاری ہوتا ہے۔
وہ ڈال کر پکانا چاہیے۔ ویسے بھی اسے اتنے
چلانا چاہیے۔"
بھائی صاحب! ــ اس بار ہم نے تین
کی قربانی کی تھی۔ گوشت کچھ زیادہ تھا ورنہ
ب کا ختم ہو چکا ہوتا تھا۔" انہوں نے پیٹ میں
ی لہر کو بمشکل دباتے ہوئے کہا۔
فرحان میاں! اب آئندہ احتیاط کرنا۔ یہ
فوڈ پوائزننگ بہت مہلک ہوتی ہے۔"

جب تک بھیڑ چھٹی، وہ روہانسے ہو چکے تھے۔
آخر میں دادا ابو لاٹھی ٹیکتے ہوئے عیادت کے لیے آئے تو وہ اپنا ضبط کھو بیٹھے۔
"اب اتنا بڑا جرم تو سرزد نہیں ہوا ہم سے۔ رشتے داروں نے تو عاجز کر کے رکھ دیا۔ اب آخر اپنا تیسرا حصہ ہی کھا رہے تھے۔"
ان کے مسلسل حصے، تیسرے حصے کی رٹ پر دادا ابو کا بھی غصے سے سر گھوم گیا۔
"ابے گھامڑ! کیا تیسرا حصہ، تیسرا حصہ کیے جا رہے ہو۔ جائز چیز کے استعمال میں بھی اعتدال اور میانہ روی ضروری ہوتی ہے۔ اس کا بھی اندھا دھند بے جا استعمال نقصان دہ ہے۔
اگر گوشت ضرورت سے زیادہ تھا تو اسے بھی تحفتاً بانٹا جا سکتا تھا۔ اپنی صحت کی حفاظت بھی انسان پر فرض ہے۔ ویسے بھی اسلام میں دوسرا، تیسرا حصہ کوئی لازمی شرط نہیں جتنا چاہیں گوشت گھر میں رکھیں اور اپنی خواہش کے مطابق کھائیں۔ البتہ رشتہ داروں اور غریبوں مسکینوں کا جو حق ہے۔ اس کا خیال رکھیں۔
اور بیٹی تم......" (انہوں نے سدرہ کے سر پر ہاتھ دھرتے ہوئے تسلی دی)
"زیادہ پریشان نہ ہو۔ میری ڈاکٹر سے بات ہوئی ہے۔ معدہ پر سوجن ہے۔ اور نظام ہضم تھوڑا بگڑ گیا ہے۔ اب اسے گھر جا کر دال دلیہ اور کھچڑی پر ہی رکھنا۔"
دادا ابو کی ہدایت پر سدرہ نے گھبرا کر میاں کی جانب دیکھا مگر وہ حیرت انگیز طور پر مسکین سی شکل بنائے رضامندی سے سر ہلا رہے تھے۔
بے اختیار اس کے ہونٹوں پر ایک موہوم سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ یقیناً آئندہ آنے والی عید اس کے لیے کچھ آسانیاں لے کر آنے والی تھی۔

☆☆

آفشین نعیم

زہر قاتل

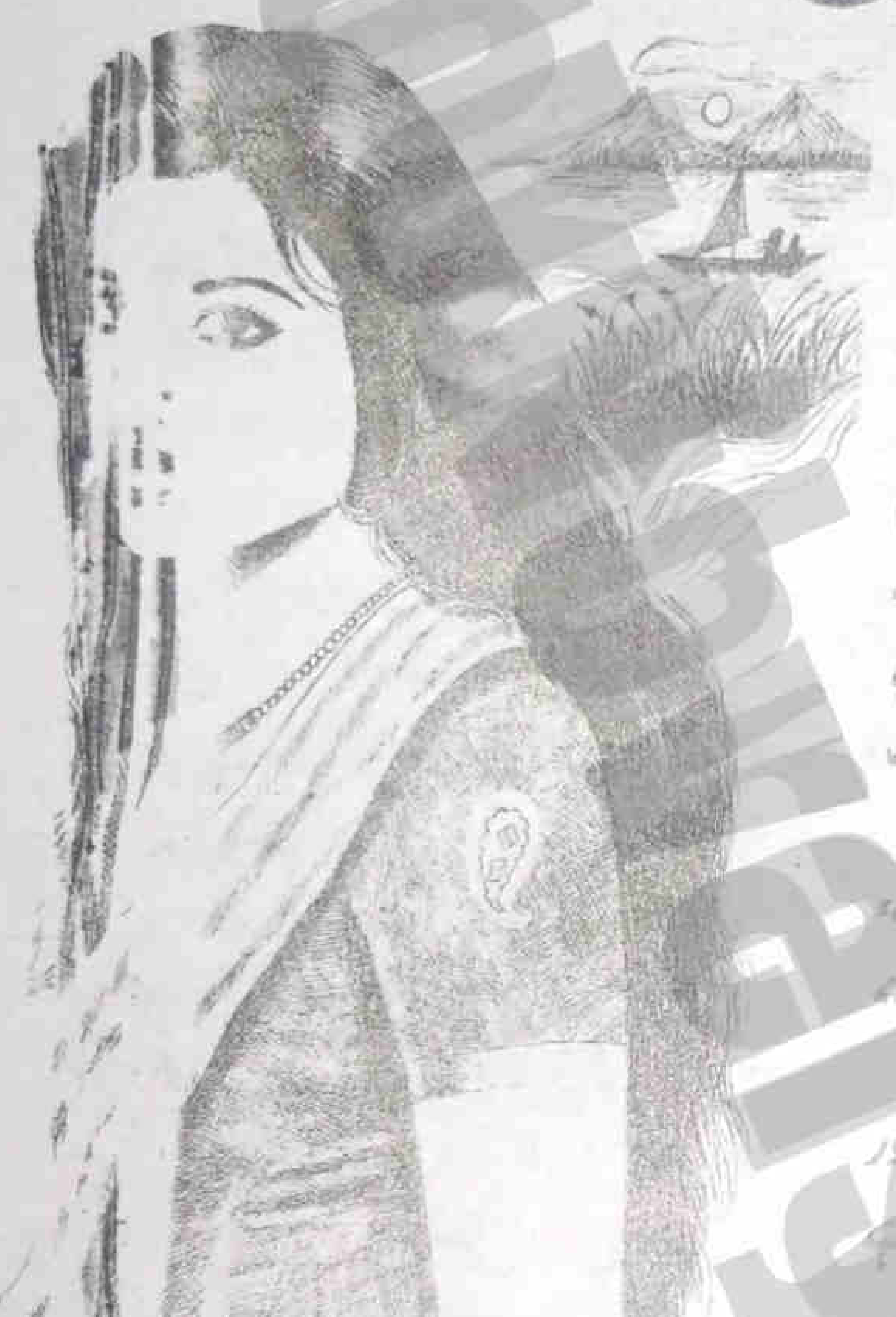

ثانیہ، ٹوکری میں پھل اور چھری لیے کمرے میں داخل ہوئیں اور دھپ سے بیڈ پر گرنے کے سے انداز میں بیٹھیں۔ لکڑی کے سالوں پرانے بیڈ نے چرر۔ چرر کی ہلکی سی آواز کے ساتھ صدائے احتجاج بلند کی......

"آرام سے بیگم، آرام سے...... اپنے جہیز کی اس آخری نشانی پر ترس کھائیے...... کہیں ایسا نہ ہو، کسی دن بیڈ ٹوٹتی فرش میں سوراخ کرتی نیچے والوں کے ہاں پائی جائیں آپ......" ہاشم صاحب نے موبائل سے، نگاہ ہٹا کر بیگم کو مخاطب کیا۔

ہارون کے تسمہ باندھتے ہاتھ ذرا دیر کو رکے، نگاہ اٹھا کر پہلے والد محترم اور پھر ناراض نظروں سے انھیں گھورتی والدہ محترمہ کو دیکھا۔

"احتیاط سے بابا جان! چھری انتہائی تیز اور ماما کے تیور اس سے کہیں خطرناک محسوس ہو رہے ہیں۔"

"ہوں......" ہاشم صاحب نے محض سر ہلانے پر اکتفا کیا......

"سنیے! ثانیہ سخت خفا لہجے میں ان سے مخاطب ہوئیں......

"حکم کیجیے!" ہاشم صاحب نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سر کو تھوڑا سا خم کیا۔

"یہ جو آپ بات بے بات میرے موٹاپے پر طنز کرتے ہیں ناں، اس سے ذرا باز آجائیے۔"

"جی بہتر۔" ہاشم صاحب فوراً مان گئے۔ ثانیہ سر جھٹک کر سیب کا چھلکا اتارنے لگیں۔

ہارون نے باہر کی جانب قدم بڑھائے،

"ارے بھئی۔ تم کہاں چل دیے؟" پوچھا

ہیلمٹ اٹھاتا دیکھ کر ثانیہ الرٹ ہوئیں

"جم جا رہا ہوں۔" رک کر آئینہ

بال ٹھیک کرتے ہوئے وہ بولا۔

"تمہارے لیے کاٹ رہی تھی،" کہنا

"واپس آکر کھاؤں گا۔" وہ باہر

بڑھتے ہوئے بولا۔

"اچھا، سنو...... واپسی میں ایک درجن

اور آدھا کلو لیموں لیتے آنا۔ میرا برگر

دوں......"

ثانیہ نے کہتے ہوئے ہارون کو الماری سے پرس نکال کر دینے کا اشارہ کیا۔

''شہد اور لیموں کا کیا کریں گی؟''

پرس ماں کو پکڑاتے اُس نے یونہی پوچھ لیا......

''نہار منہ پانی میں شہد اور لیموں ڈال کر پینے سے......ثانیہ نے کہنا شروع کیا ہی تھا کہ ہاشم صاحب نے درمیان سے جملہ اُچک لیا۔

''چار ماہ میں ایک کلو شہد اور دو کلو لیموں ختم ہو جاتے ہیں۔اور چربی کو پتا تک نہیں چلتا کہ اس نے گھلنا تھا......''

ثانیہ کے چہرے کے زاویے بگڑے......

''بابا جان! عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ایسی عالمانہ گفتگو فرماتے وقت آپ ماما سے ایک مناسب فاصلے کی دوری اختیار کرلیا کیجیے یا کم سے کم موقع محل ہی ایسا منتخب کیا کیجیے کہ جب آپ کی بیگم کے ہاتھ میں یہ ہتھیار نہ ہوں۔''

''ہوں......'' ہاشم صاحب نے ہنکارا ابھرا......

''ہیلو! کیا کر رہے ہیں آپ لوگ؟'' فروا نے ادھ کھلے دروازے کو پورا کھول کر اندر داخل ہوتے ہوئے پوچھا؟

''فٹ بال کھیل رہے ہیں......'' جواب ہارون کی طرف سے آیا۔

''بھائی! کیا ہے......'' فروا نے تنک کر ناک چڑھائی۔

''میں شام کو ماموں جان کے ہاں جاؤں گی۔'' بغیر کسی کو مخاطب کیے اس نے با آواز بلند اعلان کیا......''

ہاشم صاحب ایسے ہو گئے گویا انہوں نے کچھ سنا ہی نہیں۔ہارون ایک سیکنڈ میں وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔بس ایک ثانیہ تھیں جو اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھیں۔

''کیا ہے، ایسے کیوں دیکھ رہی ہیں؟''

''ختم ہو گئے نا امتحان، اب تو میں آزاد ہوں۔'' فروا کچھ لاڈ سے بولی۔

''دسویں کے پرچے دے دیے اب کچھ گھر داری کرو، میرا ہاتھ بٹاؤ۔'' ثانیہ نے سیب کی پلیٹ میاں کے سامنے رکھی۔

''وہی سیکھنے تو جانا ہے، آپ خود ہی تو اتنی تعریف کرتی ہیں، ہادیہ آپی اور حریرا کی تو میں نے سوچا کہ میں بھی ان سے کچھ سیکھ لوں۔''

''سیکھ ہی نہ لیں میری اولادیں کچھ......بھائی جان کی بچیوں سے۔'' انھوں نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''اُووووف......اب حریرا نامہ اور ہادیہ نامہ شروع ہو جائے گا۔'' فروا نے کلس کر سوچا۔

اس کی توقع کے عین مطابق......ثانیہ شروع ہو چکی تھیں۔

''ہادیہ کو دیکھیے......کیسی قابل بچی ہے۔صبح اسکول کی نوکری، شام کو ٹیوشنز اور ساتھ ساتھ اپنی پڑھائی بھی جاری رکھے ہوئے ہے، ایک ہمارے صاحب زادے ہیں، عمر میں ہادیہ سے چند ماہ بڑے ہی ہیں مگر جناب کو جم اور دوستوں سے ہی فرصت نہیں ہے۔اور......اور......ایک ہماری صاحب زادی ہیں جو کچن میں جاتے......'' فروا نے جلدی سے ماں کا جملہ اچک کر بولنا شروع کیا۔

''جاتے ہی......توڑ پھوڑ شروع کر دیتی ہیں وہاں حریرا کو دیکھو......کیسے کیسے کھانے۔''

بات فروا کے منہ ہی میں رہ گئی......کہ ثانیہ چپل اُٹھا چکی تھیں۔

اس نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

☆☆☆

''اوہو۔مجھے لگا ہادیہ آپی گھر میں ہوں گی۔'' فروا نے افسوس سے سر ہلایا۔''اتنی مشکل سے پہلے باما کو منایا، پھر ہارون بھائی کی بیسیوں منتیں کیں، تب کہیں جا کر چھوڑ کر گئے ہیں۔''

سخت مایوسی ہوئی تھی اُسے ہادیہ آپی کے گھر میں نہ ہونے کا سن کر۔

"تو تم نے آپی کا کیا کرنا تھا۔" حریرا نے سکون سے صوفے پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"مہندی کے ڈیزائن سیکھنے ہیں۔ میں نے تو امتحان کے دنوں میں ہی سوچ لیا تھا کہ فارغ ہوتے ہی ہادیہ آپی سے مہندی لگانا سیکھوں گی۔"

"چھوڑو آپی کو...... آؤ...... بیسن کا حلوہ بناتے ہیں۔ میں نے یوٹیوب سے ایک نئی ریسیپی دیکھی ہے۔ ٹرائی کرتے ہیں۔" حریرا نے فروا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے اُٹھانے کی کوشش کی۔

"بس رہنے دو تم۔" فروا نے اُس کے سامنے ہاتھ جوڑے......

"وہ جو پچھلی بار تم نے لزانیہ کے نام پر ملغوبہ کھلایا تھا ناں۔ تین دن تک میرے پیٹ کا درد نہیں گیا تھا۔"

"ارے...... وہ تو پہلی بار تھی نا۔ اس لیے ایسا ہوا تھا۔ اُس کے بعد تو میں نے دوبارا اتنا ٹیسٹی لزانیہ بنایا کہ کیا بتاؤں۔ اتنے مزے سے اسٹور میں پیٹی کے اوپر بیٹھ کر کھایا تھا اور ڈھیروں شاباش دی تھی خود کو......"

"اچھ۔ چھ۔ چھاا......" فروا نے اچھا پر اچھا خاصا زور دیا...... "ٹیسٹی بن گیا تو اسٹور میں اکیلے بیٹھ کر کھا لیا...... اور کچا، پکا، ابلا، جلا، پھیکا، سیٹھا کھانے کے لیے میں رہ گئی ہوں۔" فروا نے شہادت کی انگلی سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے سخت ملامتی انداز میں اپنی ہم عمر ماموں زاد کو دیکھا۔

حریرا نے اس کی بات پر بغلیں جھانکنا شروع کر دیں۔

"چلو، اُٹھو اب اور کچھ ایسا بنا کر کھلاؤ کہ میں بھی تمہیں ڈھیروں ڈھیر شاباش دے سکوں......"

"اچھا......" حریرا نے کچھ سوچتے ہوئے شہادت کی انگلی سے کنپٹی بجائی۔

"پکوڑے بناؤں...... اور ان کے ساتھ مزے دار سی چائے؟ سوالیہ نظریں حریرا کے چہرے پر گاڑیں......

"ٹھیک ہے...... اور ساتھ املی کی چٹنی بھی۔" فروا نے زور و شور سے تائید میں سر ہلاتے ہوئے اضافہ کیا۔

"چلو پھر...... آؤ، میرے ساتھ کچن میں۔" حریرا اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ فروا تابعداری سے سر ہلاتے اس کے پیچھے ہولی۔

☆☆☆

ایک گھنٹے کی مشقت اور سخت گرمی برداشت کرنے کے بعد ابھی وہ کھانا شروع کرنے ہی والی تھیں کہ اطلاعی گھنٹی کی آواز نے انھیں سخت حواس باختہ کر دیا۔

"اب کیا کریں؟" دونوں نے نظروں ہی نظروں میں ایک دوسرے کو کچھ پیغام دیا......

جتنی دیر میں بھاگ دوڑ کر کے انھوں نے چیزیں ٹھکانے لگائیں، اتنی دیر میں گھنٹی تین، چار بار بج بج کر خاموش ہونے کے بعد اب مسلسل بج رہی تھی۔ آنے والے اب گھنٹی پر ہاتھ رکھ کر ہٹانا بھول گئے تھے۔

حریرا نے دروازہ کھولتے ہی ریکارڈ کی طرح بجنا شروع کر دیا۔

"کیا ہے کھول رہی ہوں ناں دروازہ، اب بندہ ہر وقت دروازے کے ساتھ تو چپکا نہیں بیٹھا ہوتا نا۔"

آنے والوں نے اس کی کسی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے سیدھا کچن کی طرف دوڑ لگائی۔

"چولہے سے ابھی تک سینک اٹھ رہا ہے۔ کڑاہی بالکل گرم ہے۔ جھوٹے برتن سنک میں موجود نہیں ہیں۔"

ہادیہ نے با آواز بلند تمام تفصیل گوش گزار کی۔

"مطلب چیزیں تیار کرنے کے بعد اب تک ان لوگوں کو کھانے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔"

"چلو شاباش۔ اب اچھے بچوں کی طرح جو کچھ چھپایا ہے۔ سب نکال کر لے آؤ۔"

"ویری گڈ!"

سرور صاحب نے توصیفی انداز میں ہادیہ کو سراہا۔

"میں اپنی قابل اور سمجھ دار بیٹی کی ذہانت کو داد دیتا ہوں۔ ورنہ جتنی دیر یہ دونوں دروازہ کھولنے میں لگا رہی تھیں۔ مجھے لگا کہ سب کچھ ختم کر کے ہی دروازہ کھولیں گی۔"

"تھوڑے سے ہی ہیں۔" حریرا منمنائی۔

اف ان لوگوں کو بھی عین وقت پر ہی پہنچنا تھا کیا تھا جو تھوڑا سا اور لیٹ ہو جاتے۔ ہم کھا بھی چکے ہوتے۔ فروا بھی بس سوچ ہی کے رہ گئی کہہ کچھ نہ سکی۔ مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق انہیں سارا مال برآمد کرنا ہی پڑا۔ سب نے مل کر دعوت اڑائی۔ تھوڑا بہت سب کے حصے میں کچھ نہ کچھ آ ہی گیا۔

☆☆☆

سرور صاحب بیگم کے ساتھ عمرے پر گئے تو دونوں بچیوں کو بہن کے ہاں چھوڑ گئے۔ ایک ہفتے تک تو سب ٹھیک ہی تھا، روزانہ موبائل پر بات بھی ہو جاتی تھی پر آج جانے کیا ہوا......

"یا اللہ! امی، ابو کب واپس آئیں گے۔"

حریرا، رونے پر آئی تو ہادیہ اور فروا سے چپ کروانا مشکل ہو گیا۔

"کیا ہوا گڑیا!" ثانیہ پھپھو اس کو روتا دیکھ کر پریشان ہو گئیں۔

"مجھے گھر جانا ہے۔" بس، ایک ہی ضد پکڑ لی تھی۔

سب پوچھ پوچھ کر تھک گئے...... پر سوائے گھر جانے کی ضد کے کچھ اگلوا نہ پائے......

☆☆☆

ہاشم صاحب گھر آئے تو، ماحول کچھ سوگوار سا لگا۔ کچھ غیر معمولی پن تھا آج، جو گاڑی کی چابیاں سائیڈ پر رکھتے انھوں نے گھر میں محسوس کیا۔ بچیوں کے ستے ہوئے چہرے، بیگم کی غیر معمولی چپ، ہارون کی خلاف توقع (جم کے جانے کے بجائے) گھر میں موجودگی۔

"کوئی بات ہوئی ہے؟" ہاشم صاحب نے مخاطب بیگم کو کیا۔ پر سوال تمام حاضرینِ محفل سے تھا۔

"حریرا نے صبح سے کچھ نہیں کھایا ہے۔ بس...... اسے گھر جانا ہے۔"

فروا نے نیوز بریک کی۔

☆☆☆

دعوت کا تقریباً سارا اہتمام حریرا نے کیا تھا۔ سوائے میٹھے کے جو ہادیہ نے بنایا تھا۔

ان سب کو ایئرپورٹ سے آئے دو گھنٹے ہونے کو آئے تھے اور اب وہ کھانا، کھانا، شروع کرنے والے تھے جب...... کہانی میں ٹوئسٹ آیا......

"پھپھو! حریرا کی طرف سے میں آپ سے معافی مانگتی ہوں۔" "پھپھو، کانٹوں کے شور میں، ہادیہ کی بات نے سب ہی کو متوجہ کیا۔

سرور صاحب اور عالیہ نے کچھ چونک کر اس کی بات سنی۔

"کیا اس تقریر کا عنوان معافی ہے......؟" ہارون نے کباب کی پلیٹ اپنی طرف کھسکاتے ہوئے کہا۔

"کوئی بدتمیزی کی ہے حریرا نے......؟" عالیہ نے پریشانی سے پہلے ہادیہ، پھر اپنی نند کو دیکھا۔

ثانیہ نے نظروں ہی نظروں میں ہادیہ کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

"بات ہو جانی چاہیے۔" ہادیہ نے بھی آنکھوں کے اشارے سے ہی جواب دیا۔

☆☆☆

بات شروع کہاں سے ہوئی تھی آخر......؟ پہلا دن:

"پھپھو! میرے خیال سے آپ کو پیرنٹنگ کا کوئی کورس کرنا چاہیے، تاکہ آپ کے بچے ہماری

طرح ہو جائیں۔"

دوسرا دن "پھپھو! آپ آخر ماما کی طرح جاب کیوں نہیں کرتیں ہر وقت گھر پہ فارغ ہوتی ہیں۔"

تیسرا دن: پھپھو! آپ اپنا وزن کیوں کنٹرول نہیں کرتیں۔ یہ اتنا موٹاپا کوئی اچھی چیز تو نہیں ہے۔ ماما کو دیکھیں، کتنی اسمارٹ ہیں......"

اور بس...... ثانیہ کا ضبط جواب دے گیا۔

"اپنی مرضی سے ہوں کیا میں موٹی۔ کرتی تو ہوں اتنی کوشش۔ اب تمہاری ماں پر تو بوٹی چڑھتی ہی نہیں ہے۔ وہ تو ایسی ہی ہے شروع سے اور...... اور...... اور"

پھر ان کو کنٹرول کرنا اتنا ہی مشکل ہوتا گیا...... جتنا ان کے لیے موٹاپا کنٹرول کرنا۔

☆☆☆

"صرف حریرا کی طرف سے نہیں فروا کی طرف سے بھی معافی مانگو پلان ان دونوں کا تھا۔" یہ ہارون نے کہا ثانیہ کے سر پر ایک نیا دھماکہ تھا......

"مطلب؟" سب کی سوالیہ نظریں ہارون کی طرف اٹھیں۔

اندر کچن میں حریرا اور فروا کھڑی تھر تھر کانپ رہی تھیں "فروا! اب خیر نہیں ہے میری۔"

"اور میری بھی خیر نہیں ہے، بھائی نے سارا پلان لیک کر دیا ہے۔"

"میں بالکل اتفاق سے ان دونوں کے سر پہ پہنچ گیا تھا جب یہ دونوں منصوبہ سازی کر رہی تھیں۔

کہ، جیسے ماما ہر وقت موازنہ کرتی رہتی ہیں اپنے بچوں کا دوسروں سے، اسی طرح وہ بھی ماما کا موازنہ کریں گی اور یہ کام حریرا کے ذریعے کیا جائے گا کیونکہ حریرا نے تو اپنے گھر واپس آ جانا تھا جبکہ فروا نے وہیں رہنا تھا اور اس سارے منصوبے کی اصل ماسٹر مائنڈ فروا تھی۔"

ہارون نے تفصیل سے سارا منصوبہ گوش گزار کیا۔

"میر جعفر نہ ہوں تو...... سن ہی لیا تھا تو بتانے کی کیا ضرورت تھی......" فروا بھانڈا پھوٹ جانے پر سخت پریشان تھی۔ دونوں کی نظریں ملیں تو ایک ہی تحریر واضح تھی ان میں...... اب خیر نہیں...... بچو۔

☆☆☆

وہ دونوں مجرموں کی طرح سر جھکائے کھڑی تھیں۔ کمرے میں اس وقت صرف تین نفوس تھے۔ سرور صاحب، فروا اور حریرا۔

اندر داخل ہوتی ثانیہ نے بھائی کا آخری جملہ سنا۔

"آپ لوگوں کو یہ خیال آیا کیسے کیوں کہ آپ لوگ اس طرح کی کوئی بھی حرکت اپنے کسی بھی بڑے کے ساتھ کر سکتے ہیں۔" سرور صاحب بہت تحمل سے بات کر رہے تھے۔ اس کے باوجود ان دونوں کو اپنی ٹانگوں سے جان نکلتی محسوس ہو رہی تھی۔

معافی مانگنے سے معافی ملنے تک کا یہ معاملہ بخیر و خوبی انجام کو پہنچا۔

فروا اور حریرا جا چکی تھیں۔

☆☆☆

"ثانیہ!" سرور صاحب نے بہن کو مخاطب کیا۔ "جی بھائی جان۔"

"اگر ہم طوطے کو کالا اور کوے کو سفید دیکھنے کی خواہش کرنے لگیں تو کیا یہ درست ہے؟"

"نہیں......" انہوں نے نفی میں گردن ہلائی۔

"موازنہ زہر قاتل ہے۔ چاہے اپنے بچوں کا دوسروں کے بچوں کے ساتھ ہو یا اپنے ہی بچوں کے ساتھ۔" سرور صاحب کہہ رہے تھے...... ثانیہ خاموشی سے سن رہی تھیں۔

"اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو مختلف صلاحیتوں کے ساتھ تخلیق کیا ہے۔ اور ہمیں ہر انسان کو اس کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ قبول کرنا چاہیے۔"

"ٹھیک کہہ رہے ہیں بھائی جان۔" بات ثانیہ کو سمجھ میں آ گئی تھی۔

☆☆

صدف عمر

سارے موسم بدل گئے

ٹرین اپنے مخصوص انداز سے رواں دواں تھی۔ راستے کے مناظر تکتے تکتے اس نے چور نظروں سے ابا کو دیکھا، جو اس سے بے نیاز کسی گہری سوچ میں گم تھے۔

وہ سخت بدمزہ ہوئی، کچھ دیر منتظر نظروں سے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد وہ بے زاری سے سر کھجاتی اندر ڈبے کی رونقیں دیکھنے لگی۔ نامعلوم کون سا اسٹیشن آیا تھا۔ چھابڑی والوں کا ایک ریلا سا ڈبے کے اندر گھس آیا۔

اس نے للچاتی نظروں سے پکوڑوں اور املی والی چٹنی بیچتے اس آدمی کو دیکھا۔ بھوک سے پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے مگر لگتا تھا ابا کو تو احساس ہی نہیں تھا۔ اس نے حسب عادت سر کھجاتے ہوئے سوچ میں گم ابا کا بازو زور سے ہلایا۔

''ابا! ابا! بھوک لگی ہے۔ کچھ لے دو نا۔''

ابا نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اس کی للچاتی نظروں کے تعاقب میں ان ''باسی'' پکوڑوں کو۔ ایک گہرا سانس بھرتے انہوں نے اشارے سے اسے بلایا۔ پکوڑے تھے یا گویا خزانہ وہ سیکنڈوں میں سب چٹ کر گئی۔ املی والی چٹنی سے سنی انگلیاں باآواز چاٹتے وہ اردگرد سے مکمل بے نیاز تھی۔

ابا تاسف سے اس کے انداز دیکھتے رہے، کچھ کہنا فضول ہی لگا۔ باقی ماندہ ہاتھ بڑی بے تکلفی سے دوپٹے سے پونچھ کر اس نے سر کھجایا پھر اپنی طرف ابا کو متوجہ دیکھ کر قدرے جھجکتے مزید فرمائش کی۔

''ابا! پیاس لگی ہے۔'' اسی خاموشی سے ابا نے اسے ٹھنڈی بوتل بھی لے دی۔ وہ دل ہی دل میں آج کی دعوت کا مزا لیتی شاداں و فرحاں تھی۔

''واہ بھئی۔ آج تو مزا آ گیا۔ سچی کتنے عرصے بعد پکوڑوں کے ساتھ ٹھنڈی بوتل نصیب ہوئی ہے۔ اچھا ہے نہ ہی وہ ندیدی ناہید اور نہ ہی وہ مربھکا جاتی، ورنہ ان خبیثوں کی وجہ سے مجھے یہ بوتل پینی نصیب نہ ہوتی۔ جان چھوٹی ان سر دردوں سے۔''

اپنے ''قیمتی'' خیالوں میں غلطاں وہ باپ کے چہرے پہ نظر آتی تشویش سے قطعی لاعلم و بے نیاز تھی۔ جو پچھلے تین ہفتوں سے اس کے رنگ ڈھنگ دیکھ کر تاسف اور پچھتاوے کے گہرے سمندر میں ڈوبے جا رہے تھے۔ انہیں اپنی لاعلمی پر بھی افسوس ہو رہا تھا۔ وہ سمجھتے رہے وہ اپنوں کے درمیان پل رہی ہے تو اس کی تربیت بھی اچھی ہی ہو رہی ہوگی اور انہیں ہمیشہ کہا بھی یہی جاتا رہا تھا مگر پچھلے دنوں اماں کی وفات کا سن کر وطن واپس آ کر انہیں ذرا فرصت سے اسے دیکھنے کا موقع ملا تو پتا چلا کہ تربیت تو ایک طرف اس میں تو کوئی ایک وصف بھی انسانوں والا نہ تھا۔ اماں پچھلے تین، چار سال سے بیمار تھیں مگر انہیں چھٹی نہیں مل رہی تھی، ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آ جاتی اور وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔

اماں کے بہترین علاج کے لیے انہوں نے کافی پیسہ بھیجا تھا، پیسہ تو وہ اپنی اکلوتی دختر کے لیے بھی ہر مہینے پابندی سے بھجواتے رہے تھے مگر وہ خرچ کہاں ہوتا رہا تھا انہیں اچھی طرح معلوم ہو گیا تھا۔

بھائی صاحب نے اپنی ذاتی دکان خرید لی تھی۔ بھابھی صاحبہ کا وزن اور چہرے پر چھائی لالی ان کی بے فکری اور خوش حالی کا پتا دے رہی تھی۔ ان کے

مکمل ناول

دبے دبے گلے شکوے پر جو وہ بھائی صاحب سے کر رہے تھے رفعت بھابھی نے بڑی بے مروتی سے واشگاف الفاظ میں جتا دیا۔

''بھئی۔ ہم کسی کے نوکر تو نہیں لگے کہ ہر مہینے چند گنے چنے پیسوں کے عوض ان کی لاڈلی کی خدمتیں کرتے رہتے۔ گھر کے کام، پھر بیمار ساس اوپر سے اپنے پانچ بچے، میں اکیلی کس کس طرف دیکھتی، اوپر سے یہ آمنہ اپنے نام کی ایک ہی ہے۔ ایسی ڈھیٹ ہے کہ مجال ہے جو کسی کی بھی سن لے۔ ہر بات کا الٹ جواب، ہر کام غلط۔ میں تو بھر پائی بھی۔ اگر ایسا ہی درد اٹھ رہا ہے تو جایئے۔ شوق سے لے جایئے بنو کو ادھر جہاں اس کی اعلا تربیت ہو سکے۔ ہمارے سر چڑھ کر نہ بولے کوئی۔''

بھائی صاحب بہتیرے اشارے کرتے رہے مگر انہوں نے بے نقط سنا کر ہی دم لیا۔ مبین صدیقی سر جھکائے سنتے رہے پھر اگلے دو دن سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے اپنا اور اس کا سامان باندھا اور اسے ساتھ لیے نامعلوم ٹھکانے کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

انہوں نے اونگھتی آمنہ عرف منو کو دیکھا۔ نیند کی شدت سے اس کا سر دائیں بائیں جھولتا، جھٹکے کھا کر وہ فوراً چوکنا ہو کر بیٹھ جاتی مگر نیند کا غلبہ شدید تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر گویا سونے کا اشارہ دے دیا، اندھا کیا چاہے کے مصداق وہ چند لمحوں میں ہی غافل ہو گئی۔

سر پر بخیتی سے اوڑھے دوپٹے سے ایک عجیب سی ناگوار مہک آ رہی تھی۔ دور نگے کپڑے، جو دھل دھل کر گھس کر اپنا اصل رنگ کھو چکے تھے، پاؤں میں کاسنی دو پٹی کی پلاسٹک کی چپل میل سے بھری ہوئی تھی۔

ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ کہیں سے صدیقہ کی بیٹی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ صدیقہ جو صفائی اور سلیقے میں بے مثال تھیں۔ انہیں وہ پانچ سالہ منو یاد آئی۔ صاف ستھرے پھولوں والے فراک میں دو پونیاں کیے وہ ہل ہل کر قاعدہ پڑھ رہی تھی۔

ان دنوں وہ سعودیہ سے آئے ہوئے تھے۔ پڑھتے پڑھتے وہ چور نگاہوں سے ابا کو دیکھتی پھر شرما کر سر جھکا لیتی۔ تب اس کا گندمی رنگ کیسا کھلا ہوا سا تھا۔ موٹے بھرے بھرے گال سرخ انگارہ سے لگتے۔ وہ ترنگ میں آ کر اس کے گالوں پر چٹکی کاٹتے تو وہ مسکرانے لگتی۔ صدیقہ کو دوسرے بچے کی شدید خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب آمنہ کا بھی کوئی بھائی بہن آ جائے۔ وہ ان کی بات سن کر مسکرا دیتے۔

''مجھے زیادہ بچے اچھے نہیں لگتے۔'' انہوں نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

''ہاں۔ آپ کو تو میں بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب ہی آنے میں اتنا عرصہ لگا دیتے ہیں۔''

انہوں نے شکوہ کیا اور اسے ستانے کو انہوں نے تردید نہیں کی۔ یہ ان کی صدیقہ سے آخری ملاقات تھی۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو وہ بہت اداس بھی تھی اور خوش بھی۔

''میں چاہتی ہوں اس دفعہ جب ہمارا بچہ اس دنیا میں آئے تو آپ میرے پاس لازمی ہوں۔'' اس نے بڑے مان سے وعدہ لیا تھا اور انہوں نے کر بھی لیا۔ اماں اور بھابھی بیگم کو اس کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ اس امید پر چلے گئے کہ دوبارہ جلد آئیں گے اور وہ آئے بھی پانچ ماہ کے قلیل عرصے بعد ہی مگر اس دفعہ صدیقہ کی میت پر۔

بچے کے ساتھ پلتی رسولی سے وہ بے خبر رہیں مگر اچانک ایسا درد اٹھا کہ آپریشن ناگزیر ہو گیا۔ فون پر جب بھائی صاحب نے اطلاع دی تو ساکت رہ گئے۔ جلدی جلدی چھٹی لے کر وہ پاکستان پہنچے تو مگر دیر ہو چکی تھی۔ ہر دفعہ ان کی آمد پر آنکھوں میں جگنو لیے وہ چہرہ خاموش ہو چکا تھا۔

صدمے سے چور دل لیے وہ سوچ رہے تھے کہ جلدی آنے کے وعدے کو ایفا کرنے پر وہ روئیں یا ہنسیں۔ اماں مرحومہ کی خوبیاں یاد کر کے روئے جا رہی تھیں۔ بھابھی بیگم مہمانوں میں لگی ہوئی تھیں ایسے میں کونے میں بیٹھی منو کو انہوں نے دیکھا جو سہمی

سی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھے اور اسے سینے سے لگا کے رونے لگے۔ باپ کے سینے سے لگی وہ ننھی جان کانپے جا رہی تھی۔

دکھ و غم جتنا بھی گہرا ہو صبر آ ہی جاتا ہے۔ ان کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ سہمی اور مرجھائی ہوئی منو کا ہاتھ پکڑے وہ اماں کے کمرے میں آئے تھے اور اسے ان کے حوالے کر دیا۔

اس وقت بھابھی بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ بہت دلاسے دیے کہ وہ منو کی طرف سے بے فکر ہو کر جائیں وہ اسے اپنے بچوں کی طرح ہی رکھیں گی۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ ان کی تسلیوں پر واپس چلے گئے۔

درمیان میں سخت حالات بھی آئے۔ ان کی نوکری ختم ہو گئی تھی۔ صدیقہ کیا گئی لگتا تھا خوش قسمتی کے سارے دروازے ہی بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی کٹھنائیاں جھیلیں۔ بہت بار دل چاہا کہ واپس چلے جائیں۔ اماں کی بیماری کی خبر ملتے رہی مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آتی رہی مگر اماں کی وفات کی خبر سن کر ان کا دل درد سے پھٹنے لگا۔

اس بار ان سے رہا نہ گیا۔ اپنی کوتاہی کا احساس ندامت میں ڈھلا تھا کہ وہ ہر مجبوری کو نظر انداز کر کے چلے آئے، مگر یہاں آ کر اپنی اکلوتی اولاد کو اس حال میں دیکھ کر ان کے پچھتاوے مزید بڑھ گئے۔

اماں تو بیمار تھیں ان سے گلہ نہ تھا۔ وہ تو کئی بار دبے دبے لفظوں میں انہیں کہہ چکی تھیں کہ آ کر منو کو لے جائیں اور وہ سمجھ نہ سکے۔ انہیں بھائی صاحب اور بھابھی بیگم سے اصل شکوہ تھا۔ ان کی غفلت، ان کی منو کی طرف سے لاپروائی انہیں بری طرح مایوس کر گئی۔

انہوں نے ہر طرح کی سختی خود پر جھیلی تھی مگر اماں اور منو کے لیے ہر مہینے باقاعدگی سے خرچ بھیجتے رہے تھے اور منو......!

تاڑ کی طرح لمبی، منو کا سنہرا کھلتا گندمی رنگ قدرے سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ میلے حلیے اور اجڈ اطوار والی آمنہ کو تو وہ پہلی بار دیکھ کر پہچان ہی نہ سکے۔ مگر جب تعارف ہوا تو وہ دنگ رہ گئے۔ یہ ان کی آمنہ تھی......؟ صفائی سے نابلد گفتگو کے آداب سے نا آشنا۔ گنوار سی۔

انہیں دھچکا لگا باقی کی کسر بھابھی بیگم کی زبان نے پوری کر دی، انہوں نے تو فوراً فیصلہ کر لیا اور اب وہ ٹرین میں سوار قسمت کے جادوئی در پر دستک دینے جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ جب کراچی پہنچے تو سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ ابا کے ساتھ اس گہرے سبز ہرے رنگ کے گیٹ پر کھڑی حیرت سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ یہ جگہ یہ ماحول ان کے محلے سے قطعی مختلف تھے۔ کھلی کشادہ صاف ستھری گلیاں اور پھولوں سے ڈھکے گھر۔ دروازہ اسی کے ہم عمر ایک لڑکے نے کھولا تھا۔

”جی فرمائیے۔“ سلام کے بعد شائستگی سے اس نے پوچھا پھر ابا کا تعارف لے کر وہ اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اندر سے ابا کی عمر کے آدمی باہر آئے۔ تپاک سے ملنے کے بعد وہ انہیں اندر لے گئے۔

وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتی اس طلسم کدہ میں آنکھیں پھاڑے داخل ہوئی تھی۔ صاف ستھری سفید اور کالی ٹائلوں سے سجا صحن، کنارے نفاست سے بنی کیاریاں، دیوار پر سبزے اور پھولوں کی بیلیں۔ جگہ جگہ رکھے گملے۔ دھلا دھلایا صاف ستھرا صحن۔ اس میں رکھا تخت اور اس پر بچھی سفید چادر اور نرم گاؤ تکیے۔ تخت پوش کے سامنے قرینے سے چار عدد کرسیاں رکھی تھیں۔ اور سامنے پڑی میز پر کتابیں کھلی پڑی تھیں۔

یہ صاف چمکتا گھر دیکھ کر اسے الجھن سی ہونے لگی۔ یوں جیسے آپ اچانک گھور اندھیرے سے نکل کر تیز روشنی میں آ جائیں تو روشنی کی چمک آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے۔ وہاں ملتان والے گھر میں تو ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک بے ترتیبی سی سارا دن پھیلی رہتی۔ کہاں وہ بدنظمی کا اعلیٰ شاہکار گھر اور کہاں ایسا سمٹا، ستھرا گھر جس کے فرش سے لے کر دیواریں اور

دبے دبے گلے شکوے پر جو وہ بھائی صاحب سے کر رہے تھے رفعت بھابھی نے بڑی بے مروتی سے واشگاف الفاظ میں جتادیا۔

"بھئی۔ ہم کسی کے نوکر تو نہیں لگے کہ ہر مہینے چند گنے چنے پیسوں کے عوض ان کی لاڈلی کی خدمتیں کرتے رہتے۔ گھر کے کام، پھر بیمار ساس اوپر سے اپنے پانچ بچے، میں اکیلی کس کس طرف دیکھتی، اوپر سے یہ آمنہ اپنے نام کی ایک ہی ہے۔ ایسی ڈھیٹ ہے کہ مجال ہے جو کسی کی بھی سن لے۔ ہر بات کا الٹ جواب، ہر کام غلط۔ میں تو بھر پائی بھی۔ اگر ایسا ہی درد اٹھ رہا ہے تو جایئے۔ شوق سے لے جایئے بنو کو ادھر جہاں اس کی اعلا تربیت ہو سکے۔ ہمارے سر چڑھ کر نہ بولے کوئی۔"

بھائی صاحب بہتیرے اشارے کرتے رہے مگر انہوں نے بے نقط سنا کر ہی دم لیا۔ مبین صدیقی سر جھکائے سنتے رہے پھر اگلے دو دن سوچتے رہنے کے بعد انہوں نے اپنا اور اس کا سامان باندھا اور اسے ساتھ لیے نامعلوم ٹھکانے کی طرف چل دیے۔

☆☆☆

انہوں نے اونگھتی آمنہ عرف منو کو دیکھا۔ نیند کی شدت سے اس کا سر دائیں بائیں جھولتا، جھٹکے کھا کر وہ فوراً چوکنا ہو کر بیٹھ جاتی مگر نیند کا غلبہ شدید تھا۔ انہوں نے آہستگی سے اس کا سر اپنے کندھے پر رکھ کر گویا سونے کا اشارہ دے دیا، اندھا کیا چاہے، کہ مصداق وہ چند لمحوں میں ہی غافل ہو گئی۔

سر پر تنی سیے اوڑھے دوپٹے سے ایک عجیب سی ناگوار مہک آ رہی تھی۔ دور نگے کپڑے، جو دھل دھل کر گھس کر اپنا اصل رنگ کھو چکے تھے، پاؤں میں کاسنی دوپٹی کی پلاسٹک کی چپل میل سے بھری ہوئی تھی۔

ان کا دل دکھ سے بھر گیا۔ وہ کہیں سے صدیقہ کی بیٹی نہیں لگ رہی تھی۔ وہ صدیقہ جو صفائی اور سلیقے میں بے مثال تھیں۔ انہیں وہ پانچ سالہ منو یاد آئی۔ صاف ستھرے پھولوں والے فراک میں دو پونیاں کیے وہ ہل ہل کر قاعدہ پڑھ رہی تھی۔

ان دنوں وہ سعودیہ سے آئے ہوئے تھے۔ پڑھتے پڑھتے وہ چور نگاہوں سے ابا کو دیکھتی پھر شرما کر سر جھکا لیتی۔ تب اس کا گندمی رنگ کیسا کھلا ہوا سا تھا۔ موٹے بھرے بھرے گال سرخ انگارہ سے لگتے۔ وہ ترنگ میں آ کر اس کے گالوں پر چٹکی کاٹتے تو وہ مسکرانے لگتی۔ صدیقہ کو دوسرے بچے کی شدید خواہش تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اب آمنہ کا بھی کوئی بھائی بہن آ جائے۔ وہ ان کی بات سن کر مسکرا دیتے۔

"مجھے زیادہ بچے اچھے نہیں لگتے۔" انہوں نے جان بوجھ کر چھیڑا۔

"ہاں۔ آپ کو تو میں بھی اچھی نہیں لگتی۔ جب ہی آنے میں اتنا عرصہ لگا دیتے ہیں۔"

انہوں نے شکوہ کیا اور اسے ستانے کو انہوں نے تردید نہیں کی۔ یہ ان کی صدیقہ سے آخری ملاقات تھی۔ جب وہ واپس جا رہے تھے تو وہ بہت اداس بھی تھی اور خوش بھی۔

"میں چاہتی ہوں اس دفعہ جب ہمارا بچہ اس دنیا میں آئے تو آپ میرے پاس لازمی ہوں۔" اس نے بڑے مان سے وعدہ لیا تھا اور انہوں نے کر بھی لیا۔ اماں اور بھابھی بیگم کو اس کا بہت خیال رکھنے کی تاکید کر کے وہ اس امید پر چلے گئے کہ دوبارہ جلد آئیں گے اور وہ آئے بھی پانچ ماہ کے قلیل عرصے بعد ہی مگر اس دفعہ صدیقہ کی میت پر۔

بچے کے ساتھ پلتی رسولی سے وہ بے خبر رہیں مگر اچانک ایسا درد اٹھا کہ آپریشن ناگزیر ہو گیا۔ فون پر جب بھائی صاحب نے اطلاع دی تو ساکت رہ گئے۔ جلدی جلدی چھٹی لے کر وہ پاکستان پہنچے تو مگر دیر ہو چکی تھی۔ ہر دفعہ ان کی آمد پر آنکھوں میں جگنو لیے وہ چہرہ خاموش ہو چکا تھا۔

صدمے سے چور دل لیے وہ سوچ رہے تھے کہ جلدی آنے کے وعدے کو ایفا کرنے پر وہ روئیں یا ہنسیں۔ اماں مرحومہ کی خوبیاں یاد کر کے روئے جا رہی تھیں۔ بھابھی بیگم مہمانوں میں لگی ہوئی تھیں ایسے میں کونے میں بیٹھی منو کو انہوں نے دیکھا جو بھی

ہی گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بے ساختہ آگے بڑھے اور اسے سینے سے لگا کے رونے لگے۔

باپ کے سینے سے لگی وہ ننھی جان کانپے جا رہی تھی۔

دکھ و غم جتنا بھی گہرا ہو صبر آ ہی جاتا ہے۔ ان کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں۔ سہمی اور مرجھائی ہوئی منو کا ہاتھ پکڑے وہ اماں کے کمرے میں آئے تھے اور اسے ان کے حوالے کر دیا۔

اس وقت بھابھی بیگم بھی وہیں موجود تھیں۔ بہت دلاسے دیے کہ وہ منو کی طرف سے بے فکر ہو کر جائیں وہ اسے اپنے بچوں کی طرح ہی رکھیں گی۔ وہ بوجھل دل کے ساتھ ان کی تسلیوں پر واپس چلے گئے۔

درمیان میں سخت حالات بھی آئے۔ ان کی نوکری ختم ہو گئی تھی۔ صدیقہ کیا گئی لگتا تھا خوش قسمتی کے سارے دروازے ہی بند ہو گئے تھے۔ انہوں نے کئی کٹھنائیاں جھیلیں۔ بہت بار دل چاہا کہ واپس چلے جائیں۔ اماں کی بیماری کی خبر ملتے رہی مگر ہر بار کوئی نہ کوئی رکاوٹ آڑے آتی رہی مگر اماں کی وفات کی خبر سن کر ان کا دل درد سے پھٹنے لگا۔

اس بار ان سے رہا نہ گیا۔ اپنی کوتاہی کا احساس ندامت میں ڈھلا تھا کہ وہ ہر مجبوری کو نظر انداز کر کے چلے آئے، مگر یہاں آ کر اپنی اکلوتی اولاد کو اس حال میں دیکھ کر ان کے پچھتاوے مزید بڑھ گئے۔

اماں تو بیمار تھیں ان سے گلہ نہ تھا۔ وہ تو کئی بار دبے دبے لفظوں میں انہیں کہہ چکی تھیں کہ آ کر منو کو لے جائیں اور وہ سمجھ نہ سکے۔ انہیں بھائی صاحب اور بھابھی بیگم سے اصل شکوہ تھا۔ ان کی غفلت، ان کی منو کی طرف سے لاپروائی انہیں بری طرح مایوس کر گئی۔

انہوں نے ہر طرح کی سختی خود پر جھیلی تھی مگر اماں اور منو کے لیے ہر مہینے باقاعدگی سے خرچ بھیجتے رہے تھے اور منو......!

تاڑ کی طرح لمبی، منو کا سنہرا کھلتا گندمی رنگ قدرے سیاہی مائل ہو چکا تھا۔ میلے حلیے اور اجڈ اطوار والی آمنہ کو تو وہ پہلی بار دیکھ کر پہچان ہی نہ سکے۔ مگر جب تعارف ہوا تو وہ دنگ رہ گئے۔ یہ ان کی آمنہ تھی......؟ صفائی سے نابلد گفتگو کے آداب سے نا آشنا۔ گنوار سی۔

انہیں دھچکا لگا باقی کی کسر بھابھی بیگم کی زبان نے پوری کر دی، انہوں نے تو فوراً فیصلہ کر لیا اور اب وہ ٹرین میں سوار قسمت کے جادوئی در پر دستک دینے جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ جب کراچی پہنچے تو سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ ابا کے ساتھ اس گہرے سبز ہرے رنگ کے گیٹ پر کھڑی حیرت سے ارد گرد دیکھ رہی تھی۔ یہ جگہ یہ ماحول ان کے محلے سے قطعی مختلف تھے۔ کھلی کشادہ صاف ستھری گلیاں اور پھولوں سے ڈھکے گھر۔

دروازہ اسی کے ہم عمر ایک لڑکے نے کھولا تھا۔

"جی فرمایئے۔" سلام کے بعد شائستگی سے اس نے پوچھا پھر ابا کا تعارف لے کر وہ اندر چلا گیا۔

تھوڑی دیر ہی گزری تھی کہ اندر سے ابا کی عمر کے آدمی باہر آئے۔ تپاک سے ملنے کے بعد وہ انہیں اندر لے گئے۔

وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چلتی اس طلسم کدہ میں آنکھیں پھاڑے داخل ہوئی تھی۔ صاف ستھری سفید اور کالی ٹائلوں سے سجا صحن، کنارے نفاست سے بنی کیاریاں، دیوار پر سبزے اور پھولوں کی بیلیں۔ جگہ جگہ رکھے گملے۔ دھلا دھلایا صاف ستھرا صحن۔ اس میں رکھا تخت اور اس پر بچھی سفید چادر اور نرم گاؤ تکیے۔ تخت پوش کے سامنے قرینے سے چار عدد کرسیاں رکھی تھیں۔ اور سامنے پڑی میز پر کتابیں کھلی پڑی تھیں۔

یہ صاف چمکتا گھر دیکھ کر اسے الجھن سی ہونے لگی۔ یوں جیسے آپ اچانک گھور اندھیرے سے نکل کر تیز روشنی میں آ جائیں تو روشنی کی چمک آنکھوں میں چبھنے لگتی ہے۔ وہاں ملتان والے گھر میں تو ہر وقت ایک ہنگامہ، ایک بے ترتیبی سی سارا دن پھیلتی رہتی۔ کہاں وہ بدنظمی کا اعلیٰ شاہکار گھر اور کہاں ایسا سمٹا، ستھرا گھر جس کے فرش سے لے کر دیواریں اور

کھڑکیاں بھی چمک رہی تھیں۔

ابا ایک خاتون سے مل رہے تھے۔ وہ ہونقوں کی طرح منہ کھولے ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔

"یہ آمنہ ہے آپا۔ میری بیٹی۔ آمنہ سلام کرو۔" اس تعارف کے بعد ابا اسے اشارہ کر رہے تھے مگر وہ سن کہاں رہی تھی وہ تو حیرتوں کے سمندر میں غرق تھی۔

"آمنہ......! سلام کرو۔" اب کے ابا نے قدرے زور دے کر کہا تھا۔ اس نے ٹپٹا کر جاہلانہ طریقے سے سلام جھاڑا۔

"سلاما لیکم۔"

اور ابا بے چارے مزید شرمندہ ہو گئے۔

"وعلیکم السلام۔ آؤ۔ بیٹھو۔"

ابا تو ان ہی کے ساتھ تخت پر بیٹھ گئے جبکہ آمنہ کرسی پر بڑے انداز سے بیٹھ گئی۔

ایسا پروٹوکول اسے ملا ہی کب تھا۔

خود کو مہارانی سمجھتے وہ کرسی پر بیٹھے ادھر ادھر دیکھے جا رہی تھی۔ ابا ان لوگوں کے ساتھ گفتگو میں مصروف ہو گئے اور وہ بڑے کروفر سے گردن اکڑائے یہ سوچ کر خوش ہو رہی تھی کہ اگر ابھی اسے ناہید جانی وغیرہ دیکھ لیتے تو جل جل کر مر جاتے۔

"دیکھ لو جل ککڑی کہیں کی۔ آج کی کھیل کی ملکہ میں ہوں اور تم جمعدارنی ہونہہ"

ہمیشہ خود کے ساتھ کھیل میں ہونے والی ناانصافی کا حساب وہ خیالوں میں اسے مخاطب کر کے پورا کر رہی تھی۔

اس دوران وہی لڑکا ٹرے میں شربت کا جگ اور گلاس قرینے سے سجائے چلا آیا تھا اس کی خود کلامی وہ سن چکا تھا لہٰذا گلاس میں شربت انڈیل کر اس کے آگے بڑی تہذیب سے پیش کرتا وہ بڑی سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔

"لیجیے ملکہ عالیہ۔ یہ آب حیات پی کر دشمنوں کو مزید جلائیں۔"

اس کی بات سنتی اس نے بے دھیانی میں ہی قدرے جوش سے گلاس پکڑنے کو ہاتھ بڑھایا تھا۔ اور شربت چھلک کر اس کے کپڑوں پر گلاس زمین پر۔

"ہائے...... یہ کیا کر دیا۔" بظاہر سنجیدگی سے مگر درحقیقت آنکھوں میں شرارتی سی چمک لیے وہ اسے گھور رہا تھا۔ ابا بے چارے بھی مزید شرمندہ ہو گئے۔

"صفی! اسے غسل خانے تک لے جاؤ۔" اسی خاتون نے اسے آرڈر دیا۔ وہ اسے اپنی رہنمائی میں غسل خانے چھوڑ کر گرے ہوئے شربت اور کانچ کو صاف کرنے چلا گیا۔ اور وہ...... وہ تو ورطۂ حیرت میں مبتلا تھی۔ آنکھیں پھاڑے وہ غسل خانے کی ہر چیز کو تکتی۔ واش بیسن، شاور سے لے کر فرش دیواریں غرض سب کچھ ہی ایسا چمک رہا تھا جیسے وہ غلطی سے کسی شیش محل میں آ گئی ہو۔

اسے اپنے گھر کا وہ گندا سا باتھ روم یاد آیا جسے ہفتے میں ایک بار اوپر اوپر سے صاف کرنے کی زحمت کر لی جاتی تھی۔ اس کا دل چاہا وہ یہیں بستر لگا کر سو جائے۔

وہ جو سمجھتی تھی کہ غسل خانے ہر گھر میں ایسے ہی ہوتے ہوں گے میلے اور بدبو سے بھرے ہوئے تو آج اسے پتا چلا کہ وہ غلط تھی۔ نل کھولے اس نے اپنے دامن کو اناڑی پن سے دھویا تو شیشے میں نظر آتے اپنے عکس کو دیکھ کر وہ ٹھٹک گئی۔ اس منظر میں کوئی چیز میلی تھی تو وہ اس کا اپنا وجود تھا۔ ایک لمحہ کو اسے عجیب سا لگا تھا مگر اگلے ہی پل وہ سر جھٹک کر باہر نکل آئی۔

صحن سے باتوں کی آوازیں آ رہی تھیں وہ اندازے سے چلتی باہر آ گئی۔ جہاں میز پر ایک بھرا ہوا شربت کا گلاس اس کا منتظر تھا وہ لڑکا اب غائب تھا۔ اور پھر...... اس کے انداز ابا کو قدم قدم پر شرمندہ کر رہے تھے۔

کل سے سفر میں بھی اس کا سارا دھیان صرف کھانے پر ہی رہا تھا اور آج بھی۔

کھانے کے لیے اسی لڑکے نے برآمدے میں دستر خوان بچھایا تھا۔ عفت آپا نے اس دوران

باورچی خانے جا کر جھٹ پٹ کھانے کا اہتمام بھی کرلیا تھا۔

دستر خوان سجا تو اہتمام دیکھ کر آمنہ کے منہ میں پانی آگیا۔ آلو کی قتلیاں۔ کدو کا رائتہ، پودینے کی چٹنی کے ساتھ بھنڈی گوشت کا مزے دار سالن۔ سلیقے سے سجا سلاد اس کی بھوک اور ''حرص'' مزید بڑھا گیا۔ سلاد میں پیاز کے لچھے اتنی نفاست سے باریک کٹے ہوئے تھے اور وہاں چچی کے ہاتھ بنا سلاد جیسے دیکھ کر اسے ٹڈی کا خیال آجاتا تھا اور چچا صاحب شوق سے کھا جاتے اور یہاں...... اس کے منہ میں لیموں کی کٹھاس میں لپٹا پیاز آکر مزہ دے گیا۔

ابا نے سارے راستے برائے نام ہی کھایا مگر۔ اس کی تو نیت ہی سیر نہیں ہو رہی تھی ابا اب بھی بے دلی سے کھانا کھا رہے تھے۔ وہ آپا اور بھائی میاں سے ہلکی آواز میں نجانے کون سے مسئلے کہہ رہے تھے۔

وہ سب سے قدرے ہٹ کر بیٹھی تھی۔ اب جو سب کا دھیان خود سے ہٹا دیکھا تو جلدی جلدی بڑے بڑے نوالے حلق میں بغیر چبائے انڈیلنے لگی۔ گھر کا کھانا بھی ایسا لذیذ ہو سکتا ہے اسے اندازہ نہ تھا۔

اسے تو آج تک ایسی لذت دیگ کے پکے کھانوں میں ہی محسوس ہوئی تھی جو قسمت سے کبھی کبھار اسے کھانے کو مل جاتے۔

خوب اچھی طرح سلاد، رائتہ سے انصاف کرتے اس نے آخر میں نظر بچا کر منہ لگا کر باقی ماندہ رائتہ جو دستر خوان پر پڑا تھا۔ پی لیا۔ وہ لڑکا کھانا بھول بھال کر نوالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا بڑی حیرت سے اس کی جناتی خوراک ملاحظہ کر رہا تھا۔ منہ سے آتی چپڑ چپڑ کی آوازیں۔ بار بار دوپٹے سے ہاتھ صاف کرنا۔ تھوڑی دیر بعد سر کھجانا۔

ابا اس کے انداز دیکھتے بہت مایوس نظر آرہے تھے۔ عفت آپا جانچتی نظروں سے اسے دیکھ لیتیں۔ پھر اس شرارتی لڑکے کو نظروں ہی نظروں میں سرزنش بھی کرتیں جو چہرے پر فہمائشی مسکراہٹ سجائے اس کے آگے اپنے حصے کا رائتہ رکھ کر پر زور اصرار کر رہا تھا۔

''لو۔ یہ بھی پی لو۔ یچی ایسا انوکھا کرتب تو آج تک مجھ سے نہیں ہوا۔ کیا تم مجھے بھی ایک سانس میں یہ پینا سکھا سکتی ہو؟'' اور منہ پونچھتی وہ کھسیا گئی۔

''صفی......! جاؤ باورچی خانے سے کی لے آؤ۔''

ان کی متنبہ آواز پر وہ مسکراتا ہوا چلا گیا۔ ٹھنڈی میٹھی لسی پینے کے بعد اس کا دل چاہا کہ ادھر ہی ٹانگیں پسار کر سو جائے اور پھر...... پھر اس نے ایسے ہی کیا۔ دوپٹے سے بے تکلفی سے منہ صاف کر کے وہ سائیڈ میں سکڑ کر لیٹ گئی۔

کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا۔ آج بڑی مدت کے بعد اس نے اتنا مزے دار کھانا اتنی مقدار میں کھایا تھا سو شکم سیری کے بعد آنے والی نیند کیسی میٹھی ہوتی ہے اس کا احساس اسے آج ہی ہوا تھا۔

اس کی آنکھ صبح جلد ہی کھل گئی۔ صحن میں ترتیب سے چار چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ جن پر اس وقت کوئی موجود نہ تھا اور خود برآمدے میں موجود ایک چارپائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ عفت آپا کا بستر اس کے برابر لگا ہوا تھا مگر خود موجود نہ تھیں۔ سستی سے کروٹ بدل کر اس نے چھت کو دیکھا۔ گھوں گھوں۔

پنکھا چل رہا تھا۔ پھر چڑیوں کے چہچہانے کی آواز پر اس نے گردن موڑی۔ اسی وقت اسے ابا اور بھائی میاں کے ساتھ اس نے جھٹ سے آنکھیں بند کرلیں۔ صحن کے مغربی کنارے لگا وہ بڑا سا پیڑ چڑیوں کی آواز سے گونج رہا تھا۔ کیاریوں کو غالباً پانی دیا گیا تھا۔ کئی چھوٹی چھوٹی چڑیاں اس پانی میں پھدک رہی تھیں۔ وہ آنکھ کی جھری سے ان کا کھیل دلچسپی سے دیکھتی رہی ایسے کہ کسی کو اس کے بیدار ہونے کا شک نہ ہو۔

اس وقت اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ یہ

فراغت، یہ سکون بھری بولتی خاموشی اسے اچھی لگ رہی تھی۔ اتنے میں اسے وہی لڑکا دکھائی دیا اس نے زور سے آنکھیں موندلیں۔ اگر وہ اسے یوں چوری چوری جھانکتے دیکھ لیتا (اور جس کا امکان بھی زیادہ تھا) تو پھر کوئی نیا شوشہ ضرور ہی چھوڑتا۔

وہ اب بڑی پھرتی سے چارپائیاں اٹھا اٹھا کر سائیڈ پر بنے کمرے میں رکھ رہا تھا۔

ذرا سی دیر میں سارا صحن "صاف" ہوگیا۔ کچن سے ٹرے اٹھائے عفت آپا نکلیں۔ اس نے آنکھ کی جھری سے دیکھا۔ وہ "جن" اب غائب تھا اور تینوں شاید ناشتہ کررہے تھے۔

"آپا......! میری ساری امیدیں اب آپ سے ہی وابستہ ہیں۔ مجھے مایوس مت لوٹایئے گا۔ یہ پتھر آپ کے در پر لایا ہوں اسے تراش کر ہیرا بنا دیں گی تو شاید میرے پچھتاوؤں میں بھی کمی آسکے اور روز قیامت میں صدیقہ کے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہوسکوں۔"

ابا کی تھکی ہوئی آواز میں امید و خوف کا ملا جلا تاثر تھا۔

"ہیں......کون سا پتھر ہے ابا کے پاس؟ جسے یہ آپا ہیرا بنا سکتی ہیں۔" اس نے حیرت سے سوچا۔ اس نے تو اب تک ابا کے پاس نہیں دیکھا تھا۔

"دیکھو مبین میاں۔ سچ تو یہ ہے کہ ہیرا تراشنا میرا کام کہاں! ہاں میں کوشش ضرور کروں گی کہ اسے وہ گن ضرور سکھا سکوں کہ سر اٹھا کر اس معاشرے میں چل سکے۔ سچ پوچھو تو تم نے بھی تو حد کردی۔ ایسی غفلت، ایسی لاپروائی۔ وہ بھی اپنی سگی اولاد سے مانا کہ تم مشکلوں کا شکار تھے مگر بھی ذرا بھی احساس نہیں ہوا تمہیں کہ بچی کیسی پل رہی ہے......؟ انسانوں والی کوئی صفت ہی نظر نہیں آتی اس میں۔"

وہ بڑی صاف گوئی سے انہیں آڑے ہاتھوں لے رہی تھیں۔

"اپنی ساری کوتاہیاں، ساری خطائیں مانتا ہوں مگر آپا، جب بھی فون کیا یہی کہا گیا کہ منو ٹھیک ہے۔ پڑھائی کی مد میں ہر مہینے الگ سے پیسے بھیجے کہ اسے اچھے تعلیمی ادارے میں پڑھایا جائے مگر دیکھیے تعلیم و تربیت سے کوسوں دور یہ میری بچی...... مجھے تو یقین ہی نہیں آرہا کہ یہ میری صدیقہ کی بیٹی ہے۔"

آزردگی ان کے لہجے سے ٹپک رہی تھی بھائی میاں نے تسلی دی۔

"چلو جانے دو۔ جو ہوگیا سو ہوگیا۔ آئندہ کے لیے اچھی امید رکھو۔ تمہاری آپا نے اچھے اچھوں کو سدھارا ہے۔ یہ تو چھوٹی سی لڑکی ہے اس کی کیا بساط۔"

بھائی میاں کا لہجہ آخر میں شگفتہ ہوگیا، وہ مسکرا بھی نہ سکے۔

انہیں اپنوں کی خود غرضی نے بہت رنج پہنچایا تھا۔ ہر مہینے وہ اماں کے ساتھ ساتھ اس کے خرچ کے لیے بھی اچھے خاصے روپے بھیجا کرتے تھے چاہے حالات کیسے بھی رہے ہوں انہوں نے خود تنگی برداشت کی۔ کیا اس لیے......؟

آمنہ کی پوشاک۔ اس کی حالت دیکھ کر انہیں اندازہ ہوگیا تھا۔ اس پر ایک دھیلا بھی خرچ نہیں کیا گیا۔ دکھ ان کاغذی نوٹوں کا نہیں بھائی صاحب اور بھابھی بیگم کے دھوکے کا تھا۔

اس کے انداز و اطوار انہیں صدمے میں ڈال رہے تھے۔ ایسی بے ڈھنگی ایسی میلی گنواری آمنہ تو ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھی۔ اس کا قد تو بڑھ گیا تھا مگر لگتا تھا کہ عقل ایک ہی مقام پر ٹھہر گئی ہے۔

ابا اسی شام چلے گئے۔ انہیں کچھ ضروری کام نپٹانے تھے سو واپس جانے سے پہلے وہ ادھر آنے کا وعدہ کر کے چلے گئے۔ جانے سے پہلے انہوں نے عفت آپا کے ہاتھوں میں کچھ پیسے رکھے۔

"آپا اس کے لیے ڈھنگ کے کپڑے لے آئیے گا۔ میں ہر مہینے اس کا خرچا بھیجا کروں گا۔"

عفت آپا منع کرتے کرتے کچھ سوچ کر رک گئیں۔

☆☆☆

ابا تو چلے گئے اور عفت آپا نے اس مشکل مہم کو سرانجام دینے کا بیڑہ اٹھالیا۔ پہلے تو اس کے ساتھ آئے بیگ کو چھانٹ کر قدرے بہتر جوڑا نکالا۔

"صفی! یہ استری کرلاؤ۔" وہی لڑکا بڑی تابعداری سے سر ہلاتا وہ جوڑا اٹھا کر چلا گیا۔ واپس آیا تو آپا اسے کچھ سمجھا رہی تھیں۔

"ہائیں...... یہ انسانوں کے پاؤں ہیں یا جنات کے۔"

اس کے لمبے میلے کھردرے پاؤں کو دیکھتا وہ اچنبھے سے چیخا۔ شرمندہ ہوتی منو نے دونوں پاؤں کو ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔

وہ اب بھی اچک اچک کر دیکھتا۔ باریک بینی سے تبصرہ کر رہا تھا۔

"ہاں تو اگر جنات جیسے پاؤں ہیں تو کیا ہوا شکر کرو۔ پاؤں تو ہیں ناں۔ بھول گئے مجید بابا کو جن کے پاؤں کٹ گئے تھے۔" آپا نے بے نیازی سے یاد دلایا تو وہ فوراً توبہ تلا کرنے لگا۔

"توبہ توبہ۔ صحیح فرمایا والدہ آپ نے۔ بے چارے گھسٹتے پھرتے تھے زمین پر۔" منو منہ کھولے اس کے انداز ملاحظہ کر رہی تھی۔ "چلو اب تم جا کر اپنی کتابیں کھول کر بیٹھو۔" اسے ٹال کر وہ منو کو غسل خانے لے آئیں۔

"یہ شیمپو۔ یہ صابن، یہ جھاویں۔" اسے بتا کر اچھی طرح سے نہانے کا کہہ کر وہ چلی گئیں۔

مگر منو اس پہلے امتحان میں کوئی خاص کامیاب نہیں ہو سکی۔ عفت آپا نے ناقدانہ انداز سے اس کے ہاتھوں، پیروں، گردن غرض ہر جگہ کا معائنہ کیا تھا اور مایوسی سے سر ہلا دیا۔ اسے اس سب سے الجھن ہو رہی تھی۔

"کتنے دنوں بعد نہایا کرتی ہو؟"

"مہینے میں ایک دوبار۔"

"ہائیں۔ سردیوں میں یا گرمیوں میں؟"

"سردیوں میں تو مجھے بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔ گرمیوں میں۔" فخریہ لہجے میں بتاتی وہ ان کے تاثرات سے بے خبر تھی۔

"سبحان اللہ۔ بی بنو۔ تو اس کی بھی کیا ضرورت تھی۔ پسینے سے ہی غسل کافی ہے نا۔"

اور وہ خاک سمجھی، وہ بڑبڑاتے ہوئے اسے ساتھ لے گئیں۔ اسے سدھارنا آسان نہیں تھا۔

وہ اگلے دن ہی بازار جا کر اس کے لیے جوڑوں کا کپڑا اٹھا لائیں پھر دو دن لگا کر خود سیے۔ صفی تو اس کی اتنی خدمتوں پر شکوہ کرتا رہا، اماں اس کے کیسے کیسے نخرے اٹھا رہی ہیں تو کبھی اس کے طریقوں پر سر دھنتا کہ واہ ایسے نمونے تو صدیوں پہلے جنگلوں میں غاروں میں پائے جاتے تھے۔

بھائی میاں اسے سراہتے ضرور۔

وہ جلد سے جلد دوبارہ گھر جانے کی دعا کرنے لگی کیونکہ یہاں "منو سدھارو" مہم اسے ایک آنکھ نہیں بھا رہی تھی اوپر سے وہ شیطان کا چیلا صفی۔ اس نے ناک میں دم کر رکھا تھا۔

زیادہ برا حال اس کے سر کا تھا۔ جوؤں اور لیکھوں سے بھرا سر بڑی دقتوں سے صاف کیا گیا۔ صفی نے تو باقاعدہ وہ چیخیں ماریں کہ الامان۔

"ہائے کیڑے۔ اماں دیکھیں تو اتنے سارے کیڑے۔ ہائے کاٹ نہ ڈالیں آپ کو بیٹے دور جائیے تو اسی لیے چادر لیے رکھتی تھی...... لگتا ہے بڑی محبت محنت سے پالا ہے انہیں جب ہی تو کسی خزانہ کی طرح چھپا چھپا کر رکھتی ہو۔ اخ...... اوں۔" وہ برابر کمنٹری کیے جا رہا تھا۔

خالہ نے (منو کو انہوں نے آپا کہنے پر ٹوک دیا تھا) گھر کا تو وہ منہ بسورنے لگا۔

"مجھے کیوں ڈانٹ رہی ہیں۔ دیکھیں تو یہ گندے لاڈلے کیڑے۔ کیسے بھاگتے پھر رہے ہیں جیسے ابا کی جاگیر ہو۔" خالہ نے اسے وہاں سے ہٹا دیا۔ منو سر جھکائے خفت زدہ سی بیٹھی رہی۔ ان دنوں اسکول کی چھٹیوں کی وجہ سے ہر سرگرمی کم بخت کی نظروں میں آ ہی جاتی سو بعد میں اس کا خوب ریکارڈ لگتا۔

”اتنی محنت ومحبت سے پائے گئے ان فالتو کیڑوں کے ختم ہو جانے کا دکھ تو ہوتا ہوگا نا تمہیں۔ اب ان کے سوگ کا اعلان مت کر دینا۔ ویسے اگر تم کہو تو اماں سے سفارش کر دوں ان کی جان بخشی کی۔“

وہ اسے گھورے گئی اور منہ ہی منہ میں بدبدائی۔

”ذلیل۔ کم بخت۔ بدتمیز۔“ دل تو چاہتا کہ رکھ کر ایک زوردار تھپڑ لگائے مگر نئی جگہ تھی وہ لحاظ کر گئی اور صفی یوں مسکرانے لگا جیسے کہہ رہا ہو ”بچو سوچنا بھی مت۔“

☆☆☆

رفعت آپا، مبین کی خالہ زاد بہن تھیں۔ ان کی شادی شجاع احمد سے ہوئی تھی جو رشتے میں مبین کے ماموں زاد تھے۔ شجاع صاحب ہائی اسکول میں اردو پڑھاتے تھے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں ڈگری لے رکھی تھی سو گھر میں ہر وقت فارسی دانی اور شاعری چلتی رہتی۔

رفعت آپا ایک سلیقہ مند اور ہمدرد خاتون تھیں۔ بہن بھائیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ماں کے انتقال کے بعد انہوں نے ہی ماں بن کر سب کو پالا۔ ان کی شادیاں کرائیں۔

خود ان کی شادی دیر سے ہوئی شجاع احمد کو وہ شروع سے ہی اچھی لگتی تھیں لہٰذا جب تک وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ براں نہیں ہوتیں وہ ان کا انتظار کرتے رہے۔

شادی کے بعد ان کے ہاں دو بیٹے ہوئے بڑا عالی شان چھوٹا سفیان۔ ان کا گھر شہر سے ذرا دور نئی آبادی میں تھا۔ یہ گھر انہوں نے اپنی پسند سے بنوایا تھا۔ صاف ستھری نئی بنی اس آبادی میں زیادہ تر پڑھے لکھے متوسط طبقے کے لوگ آباد تھے۔

ان کا سلیقہ ان کے گھر سے جھلکتا تھا۔ بیٹی کوئی تھی نہیں سو صفی ان کی بہت مدد کرتا۔ انہیں ہر طرح کا آرام وسکھ پہنچاتا۔ عالی شان من موجی سا تھا دل چاہتا تو مدد کروا دیتا ورنہ اس کے اپنے بکھیڑے بہت تھے۔ پر چھوٹا سا گھرانہ اس گھر سے قطعی مختلف تھا جہاں سے آمنہ آئی تھی۔

☆☆☆

”ہیں...... یہ تمہارے پاؤں ہیں یا کسی سے ادھار لیے ہیں؟“

وہ جو کوئی بھی تھا اچانک ہی اس کے سر پر آ کر بولا تھا۔ آمنہ اس وقت کیاریوں کے پاس لگے نلکے کے قریب بیٹھی حسب ہدایت پاؤں کو رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی کہ اچھل پڑی۔ مڑ کر دیکھا تو ایک دبلا پتلا سا لڑکا بڑا سا بیگ کندھے سے لٹکائے تجسس سے اس کے پاؤں دیکھ رہا تھا۔

”آپ کون......؟“ وہ قدرے چڑی۔

”ایسے جناتی پاؤں کبھی دیکھے نہ سنے۔ تم کیا کوئی جن زادی ہو؟ ویسے لگ تو رہی ہو شکل سے...... یہ اڑے اڑے لیسو...... یہ ابلی ہوئی آنکھیں۔ ایں...... کون ہو تم......؟ کیا چڑیل یا پچھل پیری......؟“

آنے والا بے تکان بولے جا رہا تھا۔ اسے شدید غصہ آیا۔

”آپ کو اس سے کیا کہ میں کون ہوں۔“

”بھئی میرے گھر میں بیٹھ کر مجھے ہی تیور دکھا رہی ہو۔ واہ۔ خوب...... یعنی کہ الٹا چور کوتوال سے پوچھے۔“ محاورے کا ناس کیا گیا۔ آمنہ نے نلکا بند کر کے جھانویں کو پٹخا۔ اسے غصے کے ساتھ ساتھ اب رونا بھی آ رہا تھا۔

جس کو دیکھو اس کے پاؤں کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

”صفی...... ارے او صفی۔“ اب زور زور سے صفی کو بلایا جا رہا تھا۔

”ارے بھائی جان آپ۔“ صفی اندر سے نکلا اور تیر کی طرح آ کر اس سے بغل گیر ہوا۔

”آپ اچانک۔ ایسے کیسے آ گئے۔ اطلاع دی نہ فون کیا۔ کیسے ہیں۔“ جوش سے وہ اس سے لپٹا جا رہا تھا۔

”بھئی شانتی۔ شانتی۔ ٹھیک ہوں میں یہ مدر

ثریا اور مثنوی روم کہاں ہیں؟" برآمدے کی جانب بڑھتے اس کے قدم ذرا ٹھٹکے۔

"ارے یہ...... یہ ابھی تک غائب نہیں ہوئی میں سمجھا شاید کوئی چھل پیری ہے۔"

یقیناً اسے کہا جارہا تھا۔ وہ پیر پٹختی اسٹور میں گھس گئی۔ صفی ہلکے سے ہنسا۔

"محترمہ اس سے بھی آگے کی چیز ہیں سنبھل کے بھائی میاں۔"

صفی کی آواز اسے صاف سنائی دے رہی تھی وہ بھل بھل بہتے آنسوؤں کو روک نہ سکی۔ آنے والے بڑے صاحب زادے جناب عالی شان شجاع احمد تھے جو اپنے ایک ٹورنامنٹ کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر گئے ہوئے تھے۔ شام تک گھر میں خوب آوازیں گونجتی رہیں۔

قہقہے۔ قصے۔ لطیفے غرض موصوف لگتا تو سال بھر کی باتوں کا اسٹاک آج ہی ختم کرنا چاہتے ہوں۔ وہ اندر ہی رہی۔

کھانے کے وقت صفی کے بار بار بلانے پر اسے مجبوراً نکلنا پڑا۔ تخت پر لگے دستر خوان پر اس وقت مہکتا پلاؤ اور ساتھ شامی کباب تھے، اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ان چند دنوں میں وہ یہ تو جان گئی تھی کہ عفت خالہ کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ تھا وہ عام سا کھانا بھی ایسا لذیذ بناتیں کہ کھانے والا اپنی انگلیاں چاٹتا رہ جاتا۔

پلاؤ کی مہک بتارہی تھی کہ وہ کیسا ذائقہ دار اور لذیذ ہوگا۔ کرسی گھسیٹ کر بیٹھتے اس نے حتی الامکان اس لمبو کو دیکھنے سے احتراز کیا۔

"جیومدر ثریا۔ خوشبو بتارہی ہے کہ لوگوں کے منہ میں پانی بھر آیا ہے جسے پینے کی کوشش کی جارہی ہے۔"

بے تکلفی سے پلیٹ میں پلاؤ بھرتے وہ اپنے مخصوص انداز سے بولا تھا مگر صفی کی دبی دبی ہنسی منو کو تاؤ دلا گئی۔

"بھئی ذائقہ تو بہت ہے ہماری زوجہ کے ہاتھوں میں...... وہ تو لوکی کو بھی چھولیں تو قورمے سا ذائقہ آجاتا ہے۔" خالو خوش دلی سے بولے۔

سپوت سر ہلا ہلا کر تائید کرتے رہے۔ منو نے اپنے تئیں بڑی تمیز سے پلیٹ میں چاول ڈالے تھے۔ ساتھ میں دو عدد کباب۔ رائتہ، سلاد کی ڈھیری سی بنا کر پلاؤ کی مہک کو اندر اتارتے چمچہ منہ میں ڈالا۔ باوجود احتیاط کے اب بھی اکثر اس کے منہ سے آواز نکل ہی آتی۔

"اچھا...... تو یہ ہیں وہ کوئلہ۔ مطلب پتھر۔ مطلب بے تراشا پتھر۔ جسے ہیرا بنانے کا والدہ کو ملا ہے۔ ویسے اس طرح کے پتھر نایاب بلکہ کم یاب ہو چکے ہیں، بلکہ صرف پتھروں کے زمانے میں ہی پائے جاتے تھے۔ ایسے نادر نمونے اب کہاں دیکھنے کو ملتے ہیں۔" نجانے وہ کس سے مخاطب تھا۔ بظاہر پلاؤ کھا کے وہ بڑامد بر بنا بات کررہا تھا۔

"اونہوں برخوردار۔ بری بات۔" خالو کے ٹوکنے پر اس نے بھنویں اچکا کر دیکھا۔

"لو...... اب بات کرنا بھی منع ہے۔"

بڑبڑاتے ہوئے اس نے چمچہ منہ میں ڈالا تھا۔ مگر پھر رک کر جیسے کچھ سننے کی کوشش کرنے لگا۔ چپڑ چپڑ کی آواز اس نے آس پاس نظر دوڑا کر سب کو دیکھا پھر اس کی نگاہ، منو پر رک گئی جو حسب عادت سب بھول بھال کر بے دھیانی میں ہی اپنے جناتی انداز پر اتر آئی تھی۔ نوالہ چباتا بھولے وہ اسے بغور دیکھے گیا۔

"واہ...... سبحان اللہ...... کیا کہنے۔ اس سر اور تال کے...... ویسے یہ کون سا راگ ہے۔ بھیرویں یا درباری؟ کیوں والد...... ٹھیک نام لیے ہیں نا میں نے......" براہ راست منو کو دیکھتا اس نے خالو سے تصدیق چاہی۔

"بھائی...... یہ راگ چپ چپ ہے۔ جو کافی ریاض کے بعد آتا ہے اور کسی کسی کو آتا ہے۔" جواب صفی کی جانب سے آیا تھا۔ منو کھسیا کر منہ بند کر کے بیٹھ گئی۔

"عالی...... کیوں فضول بولے جارہے ہو۔ کھانا کھاؤ خاموشی سے۔" منو کی روہانسی شکل دیکھ کر خالہ نے اسے ٹوکا۔

"کچھ نہ بولے خدا کرے کوئی۔"

"ہائے اپنے گھر میں ہی زبان بندی۔ ایسا ظلم۔"

وہ کھانا کھانے لگا۔ منو نے خالہ کے کہنے پر کھانا شروع کیا مگر اس بار وہ محتاط تھی۔

عالی شان خالہ کے بڑے صاحب زادے نے حال ہی میں یونی ورسٹی میں داخلہ لیا تھا۔ کرکٹ کے شیدائی۔ تعلیم میں آگے۔ قدرے موڈی۔ قدرے بے نیاز و مغرور زیادہ صاف گو۔ یہ اندازہ آئندہ چند سالوں میں منو کو بخوبی ہو گیا۔ صفی الگ مزاج کا تھا۔ بعد میں اس کی سب سے زیادہ دوستی بھی اسی سے ہوئی تھی۔ وہ اس کا بہت خیال رکھتا تھا۔

"بھئی میری کوئی بہن تو تھی نہیں دیکھو۔ اللہ نے ایک عدد پلی پلائی جناتی پاؤں والی بہن دے دی ہے۔"

وہ مسکرا کر چڑاتا۔ پہلے پہل تو وہ خفا ہو جاتی تھی مگر اب خوب حق جتاتی۔

ابا سے خالہ ہر ہفتے اس کی بات زبردستی کرواتی تھیں وہ پہلے جھجکتی بھی مگر اب بڑے آرام سے ان سے بات کر لیا کرتی۔ شروع کے چند سال اجڈ منو کے لیے اگر مشقت بھرے تھے تو عفت خالہ کے لیے بھی کسی امتحان سے کم نہیں تھے۔

سو نہایت صبر و برداشت سے اس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی گئیں کہ وہ بے ڈھنگی منو سر تا پا بدل گئی۔ مگر نہ بدلے تو اس کے پاؤں۔ بقول صفی کے "مزدور پاؤں۔"

☆☆☆

خالو تعلیم کے سلسلے میں اس کی بہت مدد کی۔ صفی آٹھویں میں تھا جب منو آئی تھی جبکہ منو ابھی پانچویں میں ہی پھنسی ہوئی تھی۔ صفی نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا اتنا کہ انیس سال کی عمر میں اس نے میٹرک تو اے گریڈ سے کر ہی لیا تھا۔

خالو درویش صفت انسان تھے۔

کئی طالب علموں کو مفت پڑھاتے۔ شام کو ڈرائینگ روم کا دروازہ کھل جاتا اور علم کے سمندر سے خود کو سیراب کرنے والے کشاں کشاں چلے آتے۔ صفی سب کے لیے چائے بنا کر لے جاتا۔ یہ ڈیوٹی وہ کئی سال سے خوش دلی سے سرانجام دے رہا تھا۔

خالہ چونکہ خاندان بھر میں بہت مشہور تھیں تو ہر ہفتے کوئی نہ کوئی مہمان خالہ کے پاس آیا رہتا۔ شروع شروع میں منو کو لوگوں کی نظروں سے بڑی الجھن ہوتی تھی جب اس کی بابت پوچھا جاتا۔ اور تعارف کے بعد ایسے جملے سننے کو ملتے۔

"اچھا...... یہ بہن کی بیٹی ہے۔"

"ہائے یہ...... کہیں سے صدیقہ جیسی نہیں لگتی......"

"آپا...... لڑکی لوٹھا ہو گئی ہے پر عقل نام کو نظر نہیں آ رہی۔"

خالہ بڑے سبھاؤ سے جواب دیے جاتیں۔

"بس...... بن ماں کی بچیاں ایسی ہی ہوتی ہیں...... جب کوئی تربیت کرنے والا نہ ہو۔"

"بچی ہے...... ٹھیک ہو جائے گی۔ ابھی تو خام مٹی ہے۔"

"آپ کہہ رہی ہیں تو مان لیتی ہوں۔ ورنہ آثار تو نظر نہیں آ رہے۔"

کوئی کہتا۔ "آپ جیسی استاد ملے تو وہ ضرور ہیرا بن جائے گا۔"

غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ منو لوگوں کی آمد پر چھپتی پھرتی مگر خالہ غیر محسوس طریقے سے اسے بلوا لیتیں۔

"منو، یہ اٹھا لو۔ یہ لے جاؤ۔ یہ کر دو۔" اور منو صاحبہ پٹر پٹر کرتی آتیں اور بے ڈھنگے پن سے کام کیے جاتیں۔

خالہ کی شفقت توجہ اور محبت نے اس بدزبان، بدتہذیب منو کو دھیرے دھیرے بدل ڈالا تھا۔ ایکی

توجہ، اتنی اہمیت اسے کب ملی تھی اور ان کی ہر بات مانتی چلی گئی۔ یہاں کا ماحول اس جیسے خام مٹی کو ایک متوازن سانچے میں ڈھالنے میں بہت معاون ثابت ہوا۔ اس کی تربیت میں اس گھر کے ہر فرد نے اپنا حصہ ڈالا تھا۔ چچا میاں اور چچی سے ان سات سالوں میں کوئی رابطہ نہیں ہوا تھا۔

ابا کو اس دوران کینیڈا میں ایک اچھی نوکری مل گئی تو وہ سعودیہ سے وہاں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ایک بیوہ سے عقد ثانی کرلیا۔ یہ خبر سن کر اسے بہت اچھا لگا۔ اب اسے احساس ہونے لگا تھا کہ ابا کتنے عرصے سے دیار غیر میں اکیلے ہیں بالکل تنہا کسی بھی اپنے کے بغیر۔ صفی نے تو باقاعدہ گانے گائے۔ باقاعدہ بھنگڑے ڈالے۔

"تیرے ابا بنے ہیں دولہا۔
اور پھول کھلے ہیں دل کے
ارے میری بھی ہو جائے شادی دعا کرو سب مل کے۔"

پھر اس سے ٹریٹ بھی لی۔ وہ بھی انجوائے کرتی رہی۔ البتہ عالی شان کا ردعمل مختلف تھا حسب توقع۔

"اچھا...... تو شادی کرلی ماموں میاں نے۔"

"واہ۔ لگتا ہے کوئی تگڑی آسامی ہوگی۔"

"ہاں...... اچھا ہے ایک لحاظ سے......"

اسے برا لگا۔

"میرے ابا کوئی لالچی تھوڑی ہیں۔"

"لو...... تمہیں کیا خبر دنیا کی...... آج کل ہر کوئی مفاد پرستی کے مرض میں مبتلا ہے۔ کیا اقتدار کی لالچ کسے عزت کی۔ تو کسی کو دولت و شہرت کی ایک ہمارے ابا اماں انوکھے ہیں۔ اپنا پیٹ کاٹ کر دوسروں کو پالنے والے۔"

وہ اب اکثر ان سے خفا ہی رہتا۔ منو کو لگا کہ یہ جملہ اسی کے لیے کہا گیا ہے۔ وہ چپ سی ہوگئی۔ جانتی تھی ایک وہی ان کے گھر میں اتنے سالوں سے مفت کی روٹیاں توڑ رہی تھی۔

"اپنی اولاد کی کوئی پروا نہیں مگر سارے جہاں کا درد انہی کے جگر میں ہے۔"

اس کی گل افشانیاں اب تلخی میں بدل رہی تھیں اور یہ حقیقت بھی تھی۔ خالہ کے گھر ہر مہینے کوئی نہ کوئی ضرورت مند آجاتا اور خالہ خاموشی سے اس کی مدد کر دیتیں۔ کتنے لڑکوں کو تعلیم خالو نے اپنی جیب سے دلوائی تھی کئی تو ایسے بھی تھے جن کے گھروں کے چولہے انہی کی بدولت جلتے۔ خالہ بہت سلیقے سے گھر چلاتیں۔

خالو کے چند باغ تھے، جن کی آمدنی سے وہ کئی گھرانوں کا بوجھ بڑے چپکے سے اٹھائے ہوئے تھے۔ گھر میں فراغت تھی مگر ایسی بھی نہیں کہ جی بھر کے عیاشی کی جاسکے۔

دونوں میاں بیوی اس پر یقین رکھتے تھے کہ اگر ایک روٹی ہو تو آدھی کسی بھوکے کو دے دو۔ آنے والے وقت کے لیے بچا کر نہیں رکھو۔ کہ آگے کا اللہ مالک ہے۔ سو یہ خاموش سا سلسلہ اب عالی شان کی جھنجلاہٹ کا باعث بننے لگا تھا۔ وہ پچھلے دو سال سے بے روزگاری کاٹ رہا تھا کہ اپنی من مرضی کی نوکری نہیں مل رہی تھی خالو کی ریٹائرمنٹ میں ایک دو سال ہی رہ گئے تھے۔

صفی یونی ورسٹی سے آکر کمپیوٹر انسٹیٹیوٹ چلا جاتا وہاں وہ جدید کورسز سیکھ رہا تھا۔ مگر عالی شان، اس کے شکوے اب بڑھنے لگے تھے اپنی بزنس کی ڈگری اسے بے کار لگنے لگی تھی۔ بے روزگاری نے اسے مزید چڑچڑا اور تلخ بنا دیا تھا۔

خالو اسے زیادہ نہیں چھیڑتے وہ اس بات پر یقین کامل رکھنے والے انسان تھے کہ وقت سے پہلے نہیں قسمت سے زیادہ نہیں، سو ان کے ہاں روایتی چخ چخ نہیں تھی۔

گرمیاں اپنے جوبن پر تھیں۔

مہینے میں ایک بار نہانے والی منو اب دن میں دو سے تین بار لازمی نہاتی۔

خالہ کو وہ زیادہ کام نہیں کرنے دیتی تھی مگر فارغ

بیٹھنا انہیں پسند نہیں تھا۔ وہ بہت چاق وچوبند اور تیز دست تھیں ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتیں۔

جب تک وہ نہا کر نماز پڑھ کر فارغ ہوئی خالو بھی باہر سے آچکے تھے۔ اس نے دستر خوان بڑے کمرے میں ہی لگا دیا۔ صفی عموماً یونی ورسٹی کے بعد کم ہی گھر کھانے کے لیے آتا تھا اور عالی شان آج صبح سے ہی وہ کمرے سے نہیں نکلا تھا۔

دستر خوان لگا کر وہ خالہ کے کہنے پر اسے بلانے آئی۔

''کھانا لگ گیا ہے۔ آکر کھالیں۔''

ذرا سا اندر جھانک کر اس نے اطلاع دی۔

عالی شان نے آنکھوں سے بازو ہٹا کر اسے دیکھا۔ سرخ انگارہ سی آنکھیں دیکھ کر وہ ڈر گئی۔

''طبیعت تو ٹھیک ہے نا آپ کی؟''

ڈرتے ڈرتے اس نے پوچھ ہی لیا۔

''کیوں؟ کیا ہوا ہے مجھے مرا نہیں ہوں میں ٹھیک ہوں۔ جاؤ تم۔ آتا ہوں۔'' جواباً جس طرح انگارے چبا چبا کر کہا گیا اس نے بھاگنے میں ہی عافیت جانی۔

''عالی نہیں آیا؟'' اس کے پیچھے دیکھتے خالہ نے پوچھا۔

''جی آرہے ہیں۔'' وہ جواب دے کر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ گئی اور کیا کہتی؟ ''نجانے اسے کیا ہوتا جارہا ہے۔ پہلے تو پھر بھی بات کر لیتا تھا مگر اب تو جیسے خاموش ہی ہوتا جارہا ہے اور اس کی یہ بھید بھری خاموشی میرا دل ہولاتی رہتی ہے۔''

خالو سے کہتی وہ منو کو پہلی بار اتنی پریشان لگیں ورنہ اس نے انہیں ہر طرح کے حالات میں بہت پر امید اور پرسکون دیکھا تھا۔

''عفت بیگم۔ وقت سے پہلے نہیں اور قسمت سے زیادہ نہیں۔ ہمیشہ اس پر یقین رکھا اور محنت جاری رکھی۔ برخوردار کو بھی اس کی تلقین کرتا ہوں مگر بعض اوقات مایوسی کی شدید دھند سامنے رہتی ہے۔ ایسے وقت ایک اچھا راہبر وہی ہوتا ہے جو قافلے کی ہمت بندھائے رکھے پریشان مت ہوں۔ آپ کی تربیت اسے بھٹکنے نہیں دے گی یقین رکھیں کہ۔

پشت ہر تاریک، روشنی است''

(تاریکی کے بعد روشنی ہوتی ہے۔)

خالو بہت پر امید انسان تھے۔ ہر حال میں خوش گماں اور پر یقین۔ ان کی باتیں خاموشی سے سنتی آمنہ نے سوچا۔ اتنے میں عالی شان بھی آ گیا۔

''آئیں یار من۔ ادھر بیٹھیں ہمارے پاس۔''

خالو نے خوش دلی سے عالیان کو اپنے پہلو میں بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے بیٹھ گیا۔ خالو نے سالن اس کی پلیٹ میں ڈالا۔ وہ اسی خاموشی سے کھانے لگا۔

''برخوردار۔ کیا بات ہے؟ آج کل محاذ پر بڑی خاموشی ہے۔''

''جب کوئی سمجھنے والا نہ ہو تو خاموشی ہی بہتر ہوتی ہے ابا۔'' وہ سنجیدہ تھا۔

''تم سمجھاؤ تو یار من۔ ہم کوشش کریں گے۔'' وہ اب بھی اسی شگفتگی سے بولے۔

''ابا! جس سسٹم کا ہم حصہ ہیں نا وہاں، رشوت، سفارش کے سوا کچھ نہیں چلتا۔ یہ ڈگریاں...... ان کی اہمیت صرف کاغذ کے ٹکڑوں کی سی ہے۔ چاہے تو پھاڑ دو اور چاہے تو جلا دو یہ بھی نہ سہی تو پکوڑے ڈال کر کھالو۔''

اسے اتنی تلخی سے بولتے دیکھ کر خالہ کا رنگ بدلنے لگا۔

''اب تو واقعی ڈگریاں جلا کر بیلچے اٹھانے کا وقت ہے۔ آپ نے ناحق ہماری تعلیم پر اتنی محنت کی۔ وقت ضائع کیا۔ کوئی ہنر سکھاتے، محنت مزدوری کرواتے تو اتنے سال ناحق کھپانے کا دکھ تو نہیں ہوتا۔''

''بیٹا جی۔ محنت میں عظمت ہے، مزدوری کرو یا نوکری۔ بات دونوں ایک ہی ہے۔ مزدور اگر تعمیر کرتا ہے تو نوکری کرنے والا بھی کسی معمار سے کم نہیں ہوتا۔ ہر کام کے پیچھے مقصد ایک ہی ہوتا ہے۔ تم

شروعات تو کرو۔ اگر چھوٹی نوکری مل رہی ہے تو اس سے سہی۔ قدم تو اٹھاؤ۔ بارش کا پہلا قطرہ تو دھرتی پر گرنے دو۔ دیکھو پھر...... سیرابی کے عمل کا آغاز کیسے ہوتا ہے۔''

خالو کے لفظ لفظ میں امید تھی۔ حوصلہ تھا۔

دروازے پر ہونے والی دستک کی آواز سن کر آمنہ اٹھی۔

''ابا...... کہنے اور سہنے کے عمل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔'' وہ قائل نہ ہوا۔

''کندن بننے کے لیے سہنا پڑتا ہے۔ خام کو دوام تبھی ملتا ہے۔''

وہ بھی اسی کے ابا تھے۔ ڈٹے رہے۔

''خام کو دوام بخشنے والے ہاتھ آج کل کہاں۔''

وہ قائل نہ ہوا۔

''وہ ہاتھ ہم خود بھی بن تو سکتے ہیں۔

ہمت جواں، حوصلہ بلند تو منزل دور نہیں۔

کیونکہ بدون رنج، گنج میسر نمی شود (کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا پڑتا ہے۔)''

خالہ دونوں کی بحث خاموشی سے سن رہی تھیں۔

☆☆☆

سو قدم بڑھائے جا۔ حوصلہ جوان

رکھ۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔''

اندر آتے صفی نے نعرہ بلند کیا۔ آمنہ کچن سے پلیٹ اٹھالائی۔

''بھئی یہ موٹیویشنل گفتگو کیوں ہو رہی تھی وہ بھی میرے بغیر افسوس صد ہا۔ یہ کوئی اچھی بات تو نہیں۔'' سلام کرنے کے بعد عالی کے برابر بیٹھتے اس نے لاڈ سے شکوہ کیا۔ خالو مسکرا دیے۔

''آیے...... آپ بھی حصہ ڈالیے۔'' عالی نے استہزائیہ لہجے میں دعوت دی وہ مسکرا دیا۔

اتنے حصوں میں بٹ گیا ہوں

میرے حصہ میں کچھ بچا ہی نہیں

''ہوں ابا۔ ٹھیک پڑھاتاں میں نے۔

خاک سب ڈال رہے ہیں ہم پر

ہاتھ کچھ آپ بھی بٹا دیجیے

ابا کے کچھ کہنے سے پہلے عالی کے برجستہ کہنے پر خالہ دہل گئیں۔

''اللہ نہ کرے۔ کیا ہو گیا ہے تمہیں عالی۔ کیسی بدفالیں منہ سے نکال رہے ہو۔''

''موت تو اٹل حقیقت ہے مدر ٹریسا۔ اس سے ڈرنا کیا۔'' وہ لاپروائی سے بولا صفی کو اچھا نہ لگا۔

''مگر اپنے پیاروں کے دلوں سے کھیلنا گناہ ہے سمجھے بھائی میاں......'' خالہ کے چہرے پر لرزتے دکھ کے سائے صفی کو ناگواری سے بولنے پر مجبور کر گئے کچھ کہتے کہتے عالی شان رک گیا۔ خالہ کے تاثرات اسے شرمندہ کر گئے۔

''سوری اماں۔ معاف کر دیں۔'' محبت تو وہ بھی ان سے بہت کرتا تھا۔ خالہ کا پژمردہ چہرہ امنہ کو بھی دکھی کر گیا۔ خالو البتہ خاموش رہے۔ عالی شان پہلے ایسا کڑوا نہیں تھا۔ اسپورٹس میں بہترین۔ پڑھائی میں آگے۔ صفی جیسی شگفتگی مزاج کا حصہ نہ سہی مگر چٹکلے وہ بھی چھوڑا کرتا تھا۔ کرکٹ اس کا جنون تھا۔ قومی ٹیم میں سلیکشن ہو رہی تھی بیس لڑکوں میں اس کا نام ٹاپ آف لسٹ تھا۔ مگر جب اعلان ہوا تو وہ حیرت وصدمے سے بت بنا رہ گیا وہ لڑکا منتخب ہوا جس کی کارکردگی کیمپ میں اوسط سے بھی کم رہی تھی۔ وہ بہترین آل راؤنڈر تھا۔ اندر کے ذرائع سے پتا چلا تھا کہ اس کا نام فائنل ہوا تھا تب وہ انڈر ناٹنٹین میں تھا۔ کوچ بھی سخت مایوس ہوئے۔

''ہمارے ہاں سارا نظام خراب ہے۔ کرپٹ...... جو لڑکا سلیکٹ ہوا ہے وہ سلیکشن کمیٹی کے سربراہ کا بھانجا ہے۔ بات کارکردگی کی بجائے اقربا پروری کی ہے۔'' یہ دھچکا اسے شدید مایوس کر گیا۔

اور یہ صرف پہلی بار نہیں ہوا۔ بعد میں بھی دو تین بار اس کے ساتھ یہی ہوا تو اس نے اپنے جنون کو خیر باد کہہ کر ساری توجہ پڑھائی پر لگا دی۔ ایم بی

اے کی فرسٹ کلاس ڈگری لے کر وہ آنکھوں میں بہت سے خواب لیے نکلا تھا۔ مگر ہر جگہ ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ چھوٹی موٹی نوکری اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ بڑی فرمز میں بغیر کسی سفارش اور تجربے کے نوکری مل نہیں رہی تھی۔ گورنمنٹ جاب کے لیے اس نے ٹیسٹ دیے۔ انٹرویو بھی اچھے ہوئے مگر وہاں بھی سلیکشن میرٹ بجائے رشوت پر ہی ہوئے۔

ان حالات نے اسے شدید ڈیپریسڈ کر دیا تھا حالانکہ خالو کے کئی شاگرد ایسے تھے جن کے ایک اشارے پر اسے نوکری مل سکتی تھی مگر سفارش کروانا خالو کے اصولوں اور وقار کے خلاف تھا تو رشوت دینا عالی کے لیے ہتک اور قسمت کا دروازہ اس پر کھل نہیں رہا تھا۔ یہ امتحان تھا یا آزمائش۔ ورنہ اس کے سارے دوست اچھی جگہوں پر لگ چکے تھے۔ اس کا نصیب ہی یاوری نہیں کر رہا تھا۔ خالو اسے اپنے بل بوتے پر کچھ کرتے دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے ہر وقت حوصلہ دیے جاتے۔ وہ خوش گمان انسان تھے اور مایوسی کو کفر سمجھتے تھے......

☆☆☆

حیدر آباد سے شادی کا کارڈ آیا تھا۔ خالہ کے سگے بھانجے کی شادی تھی سو جانا ضروری ٹھہرا۔

خالہ کا ارادہ پہلے سے جانے کا نہیں تھا مگر وہاں سے بار بار فون آرہے تھے تو انہیں مجبوراً ہامی بھرنی پڑی۔ آمنہ کو اکیلا چھوڑ کر جانا بھی ناممکن تھا۔ خالو وغیرہ کا ارادہ بارات سے ایک دن پہلے آنے کا تھا۔

وہ آمنہ کو لے کر بازار گئیں۔ شادی کی مناسبت سے اس کی خریداری کی آئیں تو شام ڈھل چکی تھی۔ آمنہ کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ نہانے کے فوراً بعد کچن میں جا کر فالسے کا شربت بنا لائی۔ خالو کو ڈرائنگ روم میں دے کر وہ صحن میں آئی صفی کو شاپرز میں جھانکتے پایا۔

''اماں حضور...... کیا پورا بازار خرید لائی ہیں...... واہ یہ گوٹے ستاروں کے جھلملاتے جوڑے، سنہری سینڈلیں۔ کیا کہنے بھئی۔'' وہ جھوم رہا تھا۔

خالہ نے نظر انداز کیا اور آمنہ کو خریداری سمیٹنے کو کہا۔ ''عالی آیا تھا......'' انہوں نے صفی سے پوچھا۔

''جی والدہ...... حضرت تھوڑی دیر پہلے ہی باہر تشریف لے گئے ہیں۔ ان کے جگری یار نظام الدین کا فون آیا تھا۔ فرما گئے ہیں ذرا دیر سے واپسی ہوگی محترم کی۔'' بصد احترام فرمایا گیا۔ سن کر خالہ تخت پر لیٹ گئیں۔ صفی باقی کے بھی شاپر اٹھا کر لے گیا۔ انہوں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ عالی کے ڈھنگ انہیں اندر ہی اندر پریشان کر رہے تھے۔

آمنہ نے اپنے اور خالہ کی جوڑوں کی سلائی مکمل کر لی۔ ہفتے بھر کا کھانا بھی بنا کر فریز کر لیا۔ روٹیاں تندور سے آجاتیں۔ خالو اور صفی کا بیگ بھی اس نے سیٹ کر لیا۔

عالی کا جانے کا قطعی ارادہ نہ تھا مگر خالہ کی ناراضی کی وجہ سے اسے ہامی بھرنی پڑی۔ صفی ہی دونوں خواتین کو کوچ میں بٹھانے آیا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی ہدایات بھی سیل رواں کی طرح جاری تھیں جسے سن سن کر آمنہ کے کان پکنے لگے تھے۔

''اماں کا بہت خیال رکھنا۔ انہیں پریشان مت کرنا (جیسے وہ چھوٹی بچی تھی نا) حالانکہ عقل کی کمی تم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے مگر اندھوں میں کانا راجا کے مصداق فی الوقت تمہیں ہی ذمہ داری دے رہا ہوں والدہ کی۔'' تنگ آکر کہہ ہی دیا اس نے۔ ''اچھا راستے میں کسی سے کچھ لے کر کھانا مت۔ یہ پانی کی بوتل ہے اگر پیاس لگے تو اسی سے پینا۔ غیر ضروری نہ بولنا۔ نہ ہی گھلنا ملنا کسی سے کوئی پریشانی ہو تو مجھے......'' اس نے ہدایات کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ چڑ گئی۔

''اوفوہ صفی! ہم کوئی سات سمندر پار نہیں جا رہے۔ حیدر آباد جا رہے ہیں اور میں کوئی بچی ہوں جو کسی سے بھی ٹافی کی لالچ میں آکر کچھ کھا لوں گی۔ تم بس ہمارا دماغ مزید مت کھاؤ۔''

''ندیدی تو تم سدا کی ہی ہو۔ اسی تناظر میں

سمجھا رہا ہوں۔"

دونوں کی نوک جھونک سنتی خالہ افسوس ہی کر سکتی تھی کہ دونوں کی ایسی ہی فکر اور اکثر پینترا یونہی بدلتی تھی۔ آمنہ جل بھن گئی۔ وہ یہ کیا جتا رہا تھا سب سمجھ گئی۔

بس اب تقریباً ساری ہی بھر گئی تھی۔ ذرا دیر باقی تھی کہ چل پڑتی مگر وہ بدتمیز ارد گرد کا لحاظ کیے بنا اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگوں کی دبی دبی ہنسی اسے مزید شرمندہ کر کے غصہ دلا رہی تھی۔

تم تم صفی کے بچے۔ اللہ کرے تمہاری شادی کسی افریقن بندریا سے ہو۔"

"صفی......بس کرو۔ کیوں بے چاری کو تنگ کیے جا رہے ہو!" اس کی روہانسی شکل دیکھ کر خالہ نے ٹوکا۔ صفی دانت نکالے مزے سے ہنسے جا رہا تھا۔ پھر بس جب اسٹارٹ ہوئی تو وہ لدا پھندا واپس آیا۔ چپس، نمکو، چاکلیٹس سے بھرے بھرے شاپر اسے تھماتا ہاتھ ہلاتا چلا گیا اور منو......منو مسکرا دی۔

وہ ایسا ہی تھا۔ خیال رکھنے والا۔

☆☆☆

ثروت خالہ، عفت خالہ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں ان کی دو بیٹیاں تھیں عندلیب آپا اور عنبرین۔ دونوں شادی شدہ بچوں کی اماں تھیں۔

عمران دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ وہ عالی شان سے سال بھر ہی بڑا تھا۔ ویل سیٹلڈ تھا۔ چونکہ گھر کی آخری اور اکلوتے بیٹے کی شادی تھی سو ثروت، اپنے سارے ارمان نکال رہی تھیں۔

لان میں باڑھ کے اس پار ان کے جیٹھ کا بنگلہ تھا۔ اسی لین میں ثروت خالہ کی دونوں نندوں اور دیور کا گھر بھی تھا۔ سارا خاندان ہی تقریباً ایک ہی جگہ آباد تھا سو رونق بھی جم کر لگی ہوئی تھی۔

خالہ کے دونوں چھوٹے بہن بھائی اپنے خاندانوں کے ساتھ پہلے سے ہی آئے ہوئے تھے۔ بڑے عرصے بعد سب بھائی بہن مل کر بیٹھے تھے۔ منجھلی بہن اسلام آباد میں تھیں ایک بھائی پوسٹنگ کے باعث پشاور میں اور ایک افریقہ سے آئے تھے۔ خالہ زینب سے تعارف کروا کر اسے لڑکیوں کے حوالے کیا اور خود باتوں میں مصروف ہو گئیں۔

وہ لاؤنج میں ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ ڈھولک کم بج رہی تھی اور باتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ سب کی سب لڑکیاں بڑی خوش مزاج اور زندہ دل تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کا تعارف یاد رکھنا بھی کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ آمنہ فی الحال ثروت خالہ کی جیٹھ کی بیٹی مائرہ کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ بھی میزبانی بہت اچھی طرح سے نبھا رہی تھی۔

"آمنہ کون ہے؟ آمنہ حاضر ہو۔ بلاوا آیا ہے۔" وہ ایک شوخ سی بہت خوب صورت سی لڑکی تھی جو لاؤنج میں گلا پھاڑے چیخ رہی تھی۔ آمنہ ہڑبڑا کر کھڑی ہو گئی۔

"جی......میں......میں ہوں آمنہ۔" اس نے قدرے زور سے بول کر متوجہ کیا کہ لاؤنج اس وقت مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔

"اچھا......آپ ہیں آمنہ۔ خوب خوب۔ چلیے۔ آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔" سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے آنے کا اشارہ کرتی وہ تیزی سے دائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کے پیچھے لپکی۔

"میں عائلہ ہوں۔ ثروت پھپھو کی بھتیجی۔ ثروت پھپھو کو تو جانتی ہیں نا۔" رک کر تصدیق چاہی آمنہ نے بے وقوفوں کی طرح سر ہلا دیا۔ پھر تو وہ عفت خالہ کی بھی بھتیجی ہوئی۔

"آیئے......" ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے دروازے کا ہینڈل گھما کر پیچھے مڑ کر اسے کہا اور اندر گھس گئی۔

آمنہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر ان کا سامان پڑا تھا۔

"یہ آپ لوگوں کا کمرہ ہے۔ مطلب فی الحال۔ تم فریش ہو کر میرے ساتھ چلو۔ پھپھو

اے کی فرسٹ کلاس ڈگری لے کر وہ آنکھوں میں بہت سے خواب لیے نکلا تھا۔ مگر ہر جگہ ہی اسے مایوسی کا سامنا کرنا پڑا۔ چھوٹی موٹی نوکری اس کے مزاج سے میل نہیں کھاتی تھی۔ بڑی فرمز میں بغیر کسی سفارش اور تجربے کے نوکری مل نہیں رہی تھی۔ گورنمنٹ جاب کے لیے اس نے ٹیسٹ دیے۔ انٹرویو بھی اچھے ہوئے مگر وہاں بھی سلیکشن میرٹ بجائے رشوت پر ہی ہوئے۔

ان حالات نے اسے شدید ڈیپریسڈ کر دیا تھا حالانکہ خالو کے کئی شاگرد ایسے تھے جن کے ایک اشارے پر اسے نوکری مل سکتی تھی مگر سفارش کروانا خالو کے اصولوں اور وقار کے خلاف تھا تو رشوت دینا عالی کے لیے ہتک اور قسمت کا دروازہ اس پر کھل نہیں رہا تھا۔ یہ امتحان تھا یا آزمائش۔ ورنہ اس کے سارے دوست اچھی جگہوں پر لگ چکے تھے۔ اس کا نصیب ہی یاوری نہیں کر رہا تھا۔ خالو اسے اپنے بل بوتے پر کچھ کرتے دیکھنا چاہتے تھے اسی لیے ہر وقت حوصلہ دیے جاتے۔ وہ خوش گمان انسان تھے اور مایوسی کو کفر سمجھتے تھے......

☆☆☆

حیدر آباد سے شادی کا کارڈ آیا تھا۔ خالہ کے سگے بھانجے کی شادی تھی سو جانا ضروری ٹھہرا۔

خالہ کا ارادہ پہلے سے جانے کا نہیں تھا مگر وہاں سے بار بار فون آ رہے تھے تو انہیں مجبوراً ہامی بھرنی پڑی۔ آمنہ کو اکیلا چھوڑ کر جانا بھی ناممکن تھا۔ خالو وغیرہ کا ارادہ بارات سے ایک دن پہلے آنے کا تھا۔

وہ آمنہ کو لے کر بازار گئیں۔ شادی کی مناسبت سے اس کی خریداری کی آئیں تو شام ڈھل چکی تھی۔ آمنہ کا تھکن سے برا حال تھا۔ وہ نہانے کے فوراً بعد کچن میں جا کر فالسے کا شربت بنا لائی۔ خالو کو ڈرائنگ روم میں دے کر وہ صحن میں آئی صفی کو شاپرز میں جھانکتے پایا۔

''اماں حضور...... کیا پورا بازار خرید لائی ہیں...... واہ یہ گوٹے ستاروں کے جھلملاتے جوڑے، سنہری سینڈلیں۔ کیا کہنے بھئی۔'' وہ جھوم رہا تھا۔

خالہ نے نظر انداز کیا اور آمنہ کو خریداری سمیٹنے کو کہا۔''عالی آیا تھا......'' انہوں نے صفی سے پوچھا۔

''جی والدہ...... حضرت تھوڑی دیر پہلے ہی باہر تشریف لے گئے ہیں۔ ان کے جگری یار نظام الدین کا فون آیا تھا۔ فرما گئے ہیں ذرا دیر سے واپسی ہوگی محترم کی۔'' بصد احترام فرمایا گیا۔ سن کر خالہ تخت پر لیٹ گئیں۔ صفی باقی کے بھی شاپر اٹھا کر لے گیا۔ انہوں نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں۔ عالی کے ڈھنگ انہیں اندر ہی اندر پریشان کر رہے تھے۔

آمنہ نے اپنے اور خالہ کی جوڑوں کی سلائی مکمل کر لی۔ ہفتے بھر کا کھانا بھی بنا کر فریز کر لیا۔ روٹیاں تندور سے آ جاتیں۔ خالو اور صفی کا بیگ بھی اس نے سیٹ کر لیا۔

عالی کا جانے کا قطعی ارادہ نہ تھا مگر خالہ کی ناراضی کی وجہ سے اسے ہامی بھرنی پڑی۔ صفی ہی دونوں خواتین کو کوچ میں بٹھانے آیا تھا۔ ساتھ ساتھ اس کی ہدایات بھی سیل رواں کی طرح جاری تھیں جسے سن سن کر آمنہ کے کان پکنے لگے تھے۔

''اماں کا بہت خیال رکھنا۔ انہیں پریشان مت کرنا (جیسے وہ چھوٹی بچی ہی تو نا) حالانکہ عقل کی کمی تم میں بدرجہ اتم پائی جاتی ہے مگر اندھوں میں کانا راجا کے مصداق فی الوقت تمہیں ہی ذمہ داری دے رہا ہوں والدہ کی۔'' تنگ آ کر کہہ ہی دیا اس نے۔''اچھا راستے میں کسی سے کچھ لے کر کھانا مت۔ یہ پانی کی بوتل ہے اگر پیاس لگے تو اسی سے پینا۔ غیر ضروری نہ بولنا۔ نہ ہی گھلنا ملنا کسی سے کوئی پریشانی ہو تو مجھے......'' اس نے ہدایات کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہ چڑ گئی۔

''اوفوہ صفی! ہم کوئی سات سمندر پار نہیں جا رہے۔ حیدر آباد جا رہے ہیں اور میں کوئی بچی ہوں جو کسی سے بھی ٹافی کی لالچ میں آ کر کچھ کھا لوں گی۔ تم بس ہمارا دماغ مزید مت کھاؤ۔''

''ندیدی تو تم سدا کی ہی ہو۔ اسی تناظر میں

سمجھا رہا ہوں۔''

دونوں کی نوک جھونک سنتی خالہ افسوس ہی کر سکتی تھی کہ دونوں کی ایسی ہی فکراور اکثر پینترا یونہی بدلتی تھی۔ آمنہ جل بھن گئی۔ وہ یہ کیا جتا رہا تھا سب سمجھ گئی۔

بس اب تقریباً ساری ہی بھر گئی تھی۔ ذرا دیر باقی تھی کہ چل پڑتی مگر وہ بدتمیز ارد گرد کا لحاظ کیے بغیر اپنی ہی ہانکے جا رہا تھا۔ آس پاس بیٹھے لوگوں کی دبی دبی ہنسی اسے مزید شرمندہ کر کے غصہ دلا رہی تھی۔

تم تم صفی کے بچے۔ اللہ کرے تمہاری شادی کسی افریقن بندریا سے ہو۔''

''صفی...... بس کرو۔ کیوں بے چاری کو تنگ کیے جا رہے ہو!'' اس کی روہانسی شکل دیکھ کر خالہ نے ٹوکا۔ صفی دانت نکالے مزے سے ہنسے جا رہا تھا۔ پھر بس جب اسٹارٹ ہوئی تو وہ لدا پھندا واپس آیا۔ چپس، نمکو، چاکلیٹس سے بھرے بھرے شاپر اسے تھماتا ہاتھ ہلاتا چلا گیا اور منو...... منو مسکرا دی۔

وہ ایسا ہی تھا۔ خیال رکھنے والا۔

☆☆☆

ثروت خالہ، عفت خالہ کی سب سے چھوٹی بہن تھیں ان کی دو بیٹیاں تھیں عندلیب آپا اور عنبرین۔ دونوں شادی شدہ بچوں کی اماں تھیں۔

عمران دونوں بہنوں سے چھوٹا تھا۔ وہ عالی شان سے سال بھر ہی بڑا تھا۔ ویل سیٹلڈ تھا۔ چونکہ گھر کی آخری اور اکلوتے بیٹے کی شادی تھی سو ثروت، اپنے سارے ارمان نکال رہی تھیں۔

لان میں باڑھ کے اس پار ان کے جیٹھ کا بنگلہ تھا۔ اسی لین میں ثروت خالہ کی دونوں نندوں اور دیور کا گھر بھی تھا۔ سارا خاندان ہی تقریباً ایک ہی جگہ آباد تھا سو رونق بھی جم کر لگی ہوئی تھی۔

خالہ کے دونوں چھوٹے بہن بھائی اپنے خاندانوں کے ساتھ پہلے سے ہی آئے ہوئے تھے۔ بڑے عرصے بعد سب بھائی بہن مل کر بیٹھے تھے۔ منجھلی بہن اسلام آباد میں تھیں ایک بھائی پوسٹنگ کے باعث پشاور میں اور ایک افریقہ سے آئے تھے۔ خالہ زینب سے تعارف کروا کر اسے لڑکیوں کے حوالے کیا اور خود باتوں میں مصروف ہوگئیں۔

وہ لاؤنج میں ڈھولک بجاتی لڑکیوں کے درمیان بیٹھ گئی۔ ڈھولک کم بج رہی تھی اور باتیں زیادہ ہو رہی تھیں۔ سب کی سب لڑکیاں بڑی خوش مزاج اور زندہ دل تھیں۔ اتنے سارے لوگوں کا تعارف یاد رکھنا بھی کسی امتحان سے کم نہ تھا۔ آمنہ فی الحال ثروت خالہ کی جیٹھ کی بیٹی مائرہ کے ساتھ بیٹھی تھی اور وہ بھی میزبانی بہت اچھی طرح سے نبھا رہی تھی۔

''آمنہ کون ہے؟ آمنہ حاضر ہو۔ بلاوا آیا ہے۔'' وہ ایک شوخ سی بہت خوب صورت سی لڑکی تھی جو لاؤنج میں گلا پھاڑے چیخ رہی تھی۔ آمنہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوگئی۔

''جی...... میں ہوں آمنہ۔'' اس نے قدرے زور سے بول کر متوجہ کیا کہ لاؤنج اس وقت مچھلی بازار بنا ہوا تھا۔

''اچھا...... آپ ہیں آمنہ۔ خوب خوب۔ چلیے۔ آپ کو یاد کیا جا رہا ہے۔'' سرتاپا اس کا جائزہ لینے کے بعد اسے آنے کا اشارہ کرتی وہ تیزی سے دائیں جانب مڑ گئی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے وہ اس کے پیچھے لپکی۔

''میں عائلہ ہوں۔ ثروت پھپھو کی بھتیجی۔ ثروت پھپھو کو تو جانتی ہیں نا۔'' رک کر تصدیق چاہی آمنہ نے بے وقوفوں کی طرح سر ہلا دیا۔ پھر تو وہ عفت خالہ کی بھی بھتیجی ہوئی۔

''آئیے......'' ایک کمرے کے سامنے رک کر اس نے دروازے کا ہینڈل گھما کر پیچھے مڑ کر اسے کہا اور اندر گھس گئی۔

آمنہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ اندر ان کا سامان پڑا تھا۔

''یہ آپ لوگوں کا کمرہ ہے۔ مطلب فی الحال۔ تم فریش ہو کر میرے ساتھ چلو۔ پھپھو

ریفریشمنٹ پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔'' وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔ آمنہ یونہی کھڑی تھی۔ ٹانگیں جھلاتے ہوئے محترمہ نے جو اسے اسی طرح بت بنے دیکھا تو حیرت سے بولی۔

''بھئی کھڑی کیوں ہو؟ جاؤ وہ سامنے واش روم ہے۔ فریش ہو جاؤ۔ چینج کرو پھر میرے ساتھ چلو......'' اور وہ جلدی سے بیگ کی طرف بڑھ گئی۔ چینج کر کے وہ نکلی تو وہ وہیں بیٹھی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

''آؤ......'' اسے ساتھ لیے وہ خالہ کے پاس آئی۔ اس کمرے میں چند ہی خواتین تھیں۔ وہ خالہ کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''لیجیے پھپھو! آپ کے سامان کو بحفاظت پہنچا دیا ہے کوئی اور حکم!'' خالہ اس کے انداز پر مسکرائیں۔

''بھئی۔ یہ تو میری بیٹی ہے۔ پیاری سی۔ کوئی سامان تھوڑی ہے۔''

''تو اسے' سامان کون کہہ رہا ہے میں تو آپ کے بیگز کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ بھی بڑی ہوشیار تھی فوراً پینترا بدلا۔

''آپا......! اس سے جیتنا آسان نہیں ہے یہ تو ہر وقت یونہی واہی تباہی بولتی رہتی ہے۔'' وہ اس کی والدہ حاجرہ تھیں۔

''بچیاں تو یونہی رونق لگائے رکھتی ہیں۔ ایسے مت کہا کرو۔''

''ہماری اماں کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے کسی مجسمے میں تبدیل کروا دیں۔ زیادہ ہنسو مت، زیادہ بولو مت۔ تیز مت چلو۔ کھاؤ کم۔ میں کوئی روبوٹ تو نہیں انسان ہوں آخر۔''

☆☆☆

اس کی دوستی پر خلوص اور محبت کرنے والی کئی لڑکیوں سے ہو گئی جن میں عائلہ اور مائرہ سرفہرست تھیں۔

شادی والا گھر تھا تو سر شام لاؤنج میں ڈھولک رکھ کر لڑکیاں بیٹھ جاتیں پھر تو وہ غدر مچتا کہ الامان کیونکہ لڑکے بھی ہلہ بول دیتے، لڑکیاں چیختی رہ جاتیں مگر ڈھولک لڑکوں کے قبضے میں ہوتی پھر تو وہ لے، سر کی ٹانگ توڑی جاتی۔ ہر گانا الٹ پلٹ کر دیتے۔ آمنہ اس شور شرابے کی عادی نہیں تھی۔ نہ ہی ایسی بے تکلفی وہ بہت عجیب سا محسوس کرتی مگر عائلہ برابر مقابلہ کیے جاتی۔ لڑکیوں کی لیڈر تھی آخر لڑکیاں تان اٹھاتیں۔

''ذرا ڈھولکی بجاؤ گوریو۔''

''ہانڈی بھی کھینچ پکاؤ گوریو۔''

''نمک مرچ تو کل بھی تیز تھا۔

آج تو توازن لاؤ گوریو۔'' وہ بے چاری شور مچاتی رہ جاتیں اور لڑکے گانوں کی آڑ میں ان کی خوب شامت لاتے۔

اسی افراتفری میں، ہلڑ بازی میں ساری شام گزر جاتی پھر کوئی نہ کوئی بزرگ آ کر لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگاتے اور لڑکیاں سکھ کا سانس لیتیں۔

☆☆☆

اس دن دوپہر سے ہی بادل گھر آئے تھے۔ شدید گرمی کے بعد دن کو جمع ہوتے بادل دیکھ کر سب نے سکھ کا سانس لیا۔ سہ پہر کو تیز آندھی چلی اور اس کے بعد زوردار بارش شروع ہوئی۔ آمنہ، عائلہ اور عائزہ ٹیرس سے بارش کا نظارہ کرتی رہیں۔ پھر لان میں چلی آئیں۔ زیادہ تر ''عوام'' سو رہی تھی۔ عائلہ چائے پکوڑے بنانے اندر چلی گئی۔ مائرہ اور وہ شیڈ کے نیچے بیٹھی باتیں کرتی، بارش کا نظارہ کر رہی تھیں جب عمران بھائی کسی اجنبی کے ساتھ مین گیٹ سے اندر آتے دکھائی دیے۔ سفری بیگ سے اندازہ ہو رہا تھا کہ مسافر دور سے آیا ہے۔

''واہ......موسم انجوائے ہو رہا ہے۔'' انہیں دیکھ کر عمران بھائی نے خوش دلی سے ہانک لگائی۔ جواباً مائرہ نے دعوت دی۔

''آئیں دولہا میاں! آپ بھی بارش میں غسل کر لیں۔''

"نہیں بھئی شکریہ۔ ہم پہلے ہی کافی نہا چکے ہیں۔" واقعی دونوں کافی بھیگے ہوئے تھے۔

آنے والا اجنبی اس دوران خاموشی سے کھڑا آمنہ کو گھورے جا رہا تھا۔ آمنہ کو محسوس ہوا تو وہ غیر محسوس انداز میں پیچھے ہوئی۔

"کیا پیدل آرہے ہیں؟ یا بھابھی نے وزن گھٹانے کا نسخہ دیا ہے کہ بارش میں بھیگ کر وزن کم کریں۔" مائرہ نے چھیڑا تو عمران مسکرا دیا۔ "ہم ایسے خوش نصیب کہاں جوان کی آواز آج کل سن سکیں وہ تو رستے میں گاڑی خراب ہو گئی۔ پھر یہ طوفانی برستی بارش۔ مشکلوں سے کیب ملی اور گھر پہنچے ہیں۔"

"آیئے آپ بھی شامل ہو جائیں۔" عائلہ نے آکر چائے بڑے ٹیبل پر رکھی اور دعوت دی۔

"ضرور...... چائے کی طلب ہو رہی تھی۔ تم یوں کرو کہ کمرے میں پہنچا دو تو مہربانی ہو گی بلکہ چھوڑو، تم انجوائے کرو۔ میں اندر کسی سے کہتا ہوں۔" وہ اس "گھورو" کو ساتھ لیے اندر روانہ ہوئے تو آمنہ نے کھل کر سانس لیا۔

"عجیب انسان تھا، نہ شرم، نہ لحاظ۔ مسلسل دیکھے جا رہا تھا۔" اسے غصہ بھی آیا۔

اگلے دن موصوف سے ڈرائنگ روم میں سامنا ہوا تو تب بھی انہیں گھورتے ہی پایا۔ وہ فوراً باہر نکل آئی۔ خالہ کسی جاننے والے سے ملنے گئی تھیں۔ آمنہ کا ساتھ جانے کو دل نہیں چاہا تو رک گئی مگر اب اس گھورتی آنکھوں والے موصوف سے اسے الجھن ہو رہی تھی۔ جی چاہ رہا تھا کہ محترم کی طبیعت اچھی طرح صاف کر دے مگر الجھن تھی، وہ یقیناً صرف دوست نہیں تھا ضرور کوئی رشتہ داری بھی تھی تب ہی تو بڑی بے تکلفی سے ادھر ادھر ٹہلتے پائے جا رہے تھے۔ وہ عندلیب آپا کو بتا کر مائرہ کے گھر چلی آئی۔ عائلہ بھی ساتھ تھی۔ لان میں موجود چھوٹے دروازے سے آمد و رفت آسانی سے ہوتی تھی۔

دوپہر کا کھانا بھی انہوں نے ادھر ہی کھایا۔ ان کا راستہ پار کر کے جونہی برآمدے نہیں پہنچی کوئی اس کے سامنے آ گیا اس کی تو چیخ نکل گئی۔ "ہش۔ چیخ کیوں رہی ہو۔ بھئی میں کوئی بھوت تھوڑی ہوں۔" سامنے وہی موصوف کھڑے تھے۔ یہ اچانک کہاں سے نمودار ہوئے تھے۔ آمنہ نے اپنے سرپٹ بھاگتے دل کو بمشکل قابو کیا۔

"تم...... تم آمنہ ہونا۔ آمنہ مبین؟"

کمرے میں آکر اس نے تیزی سے دھڑکتے دل کو قابو کرنے کی کوشش کی۔ منہ ہاتھ دھوئے بھی وہ یہی سوچے جا رہی تھی۔ خالہ کی واپسی بھی اب تک نہیں ہوئی تھی وہ بیڈ پر لیٹ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

☆☆☆

لڑکی چونکہ ثروت خالہ کی نند کی بیٹی تھی اور اس کا گھر بھی اسی لین میں ہی تھا تو ابٹن و مایوں کی رسم میں انہیں بھی شریک ہونا تھا۔ اس دن لڑکوں نے رت جگے کا پروگرام بنایا تھا۔ مایوں سے ایک دن پہلے قرآن خوانی کا اہتمام کیا گیا۔ اگلے دن مایوں تھی اسی مناسبت سے اس نے سی گرین کلر کا خوب صورت سا کرتا شلوار پہنا تھا۔

خالہ چونکہ لڑکیوں کے اتنے میک اپ کی قائل نہ تھیں سو اس کے بالوں کی فرنچ ناٹ مائرہ نے بنا دی۔ عائلہ نے گیندے کے پھول بھی گوندھ دیے۔ وہ منع کرتی رہ گئی۔ ہاتھوں میں چوڑیاں اور آنکھوں میں کاجل لگائے وہ سب سے پہلے تیار ہوئی۔ لڑکیوں کے کمرے میں تو ایک ہڑبونگ مچی ہوئی تھی اور وہ مزے سے بیٹھی ان کی افراتفری دیکھ رہی تھی۔ سب ہی نے اس پر باجماعت رشک کیا جس کی تیاری میں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آیا تھا۔ اس کا قد لمبا اور لمبے سیاہ بال تھے۔ آنکھیں گھور سیاہ اور موٹی موٹی تھیں۔ سنہرا کھلتا رنگ دیکھنے والے کو ایک دم سے تو نہیں مگر آہستہ آہستہ اس کے سحر میں جکڑ کر اسے سراہنے پر مجبور ہو ہی جاتا اور آج اس خصوصی تیاری کے ساتھ وہ بہت پیاری لگ رہی تھی سب ہی نے تعریف کی اور وہ شرمندہ ہوئی

تھی۔

عائلہ کا سرخ و سپید رنگ اس سے زیادہ چمکتا ہوا تھا۔ اس نے ٹوک بھی دیا کہ وہ مسلسل سراہ جو رہی تھی۔ ''بس کرو عائلہ۔ تم تو خود اتنی خوب صورت ہو۔ ایویں میرا دل نہ رکھو۔''

''تو کیا صرف سفید رنگ ہی خوب صورتی کی علامت ہوتی ہے؟''

''ٹھیک کہہ رہی ہو۔ سفید تو گدھی بھی ہوتی ہے اسے حسین کہا جاسکتا ہے۔'' باہر سے آتے آذر نے جملہ اچک لیا۔ عائلہ پرجوش انداز میں اس کی تائید کرتے کرتے ٹھٹک گئی۔

''کیا کہا تم نے...... لنگور...... ٹھہرو تم۔'' وہ چیختی چلاتی برش اس پر پھینک کر اس کے پیچھے لپکی تھی مگر وہ ہنستا ہوا اڑن چھو ہوگیا۔ آمنہ مسکراتی رہی۔

اللہ اللہ کر کے خالو کے شور مچانے پر سب نکلے۔

لڑکی والوں کے ہاں شان دار استقبال ہوا۔ ثروت خالہ کی شادی ایک صاحب حیثیت اور معزز گھرانے میں ہوئی تھی مگر غرور و تکبر ان لوگوں میں نام کا بھی نہیں تھا۔ آمنہ نے دلہن دیکھی وہ بہت خوب صورت اور ہنس مکھ سی تھی۔ قدرے شرماتی، مسکراتی وہ تمام رسموں کو انجوائے کر رہی تھی۔ مایوں کی رسم کے بعد وہ ابٹن کھیلا گیا کہ کوئی بھی اس کی زد سے بچ نہ سکا آمنہ تو اس دوران خالہ کے پہلو سے ہی لگی بیٹھی رہی۔ بڑوں کی مداخلت پر ہی یہ ہڑبونگ ختم ہوئی اور کھانا کھلا۔ وہ اپنے لیے کھانا نکالنے گئی تو وہی چھچھوندر اس کے پاس پھر آ کھڑا ہوا۔

''تم مجھ سے بھاگ کیوں رہی ہو؟ اچھا بے شک بات مت کرو مگر میری تو سن لو۔''

اتنے سارے لوگوں کے درمیان، وہ جس طرح اس کے پہلو میں کھڑا جھک کر بات کر رہا تھا آمنہ کے پسینے چھوٹ گئے۔ پلیٹ ویسی ہی چھوڑ چھاڑ کر وہ جلدی سے واپس مڑی۔ اسے خالی ہاتھ آتے دیکھ کر خالہ نے ٹوکا۔

''تم کھانا نہیں لائیں۔''

''بس خالہ...... ایک دم سے میرا دل گھبرانے لگا تھا۔'' اس کے ماتھے پر چمکتے پسینے اور ہوائیاں اڑے چہرے کو دیکھ کر خالہ کو تشویش ہوئی۔

''کیا ہوا منو، طبیعت اچانک خراب کیسے ہوئی تمہاری۔ اچھا تم ادھر بیٹھو۔ میں تمہارے لیے پانی منگواتی ہوں۔'' اور وہ انہیں منع بھی نہ کرسکی۔ وہ ادھر کھڑے کسی لڑکے کو آواز دینے لگیں۔ گھونٹ گھونٹ ٹھنڈی بوتل پیتے اس کا سرد جسم پر سکون ہونے لگا۔ مائرہ اور عائلہ بھی ادھر آ گئیں۔ عائلہ پھر جا کر اس کے لیے کھانا بھی نکال لائی۔ ان دونوں کے اصرار پر اس نے بے دلی سے تھوڑا سا ہی کھایا۔

ان کی اتنی توجہ اور خلوص کو دیکھتے اس کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ پھر سارے فنکشن وہ خالہ کے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ ان دونوں کو اس نے مطمئن کر کے بھیج دیا کہ اس کی وجہ سے ان کا فنکشن خراب نہ ہو۔ خالہ تو اسے گھر لے کر جانا چاہ رہی تھیں مگر وہ اپنی وجہ سے ان کو پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی، سو انہیں اپنے ٹھیک ہونے کا یقین دلا کر وہ پھر سارا وقت بے دلی سے بیٹھی رہی اور یہ عقدہ تو مہندی کے دن کھلا کہ موصوف، کیوں ہاتھ دھو کر اس کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ آج خالو لوگوں کو بھی پہنچنا تھا اور اتنے دنوں بعد صفی سے ملاقات کا سوچ کر اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔

وہ لڑکیوں کے ساتھ مہندی کے تھال سجا رہی تھی جب ملازمہ اسے خالہ کا پیغام دے گئی۔ لاؤنج میں آئی تو ایک جانا پہچانا سا چہرہ خالہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔

''آؤ آمنہ...... ان سے ملو تمہاری چچی صاحبہ ہیں یہ۔''

وہ انہیں کیسے بھول سکتی تھی۔

اس عورت کے گھر گزارے وہ چند سال کسی بدصورت خواب کی طرح تھے، جہاں تیسرے درجے کی شہری کی سی زندگی گزاری تھی اس نے بچا کچھا کھانے، اترنیں۔ صلواتیں اور کوسنے ہی اس کے

نصیب میں آئے تھے اور وہ بھی یہی جہالت سیکھ رہی تھی۔ اگر وہ عفت خالہ کے پاس نہ آتی تو اب یہی آمنہ کیسی ہوتی۔ یہ سوچ اسے اکثر لرزا دیتی۔

اس نے آہستہ سے انہیں سلام کیا۔

"وعلیکم! ارے یہ منو تو پہچانی ہی نہیں جا رہی۔ ہاہ...... کیسی بدل گئی ہے۔" آج بھی چچی کے لہجے میں اس کے لیے ہلکا سا طنز تھا۔

"یہاں آؤ بھئی۔ ادھر بیٹھو میرے پاس۔ تم تو ایسی گئیں کہ پلٹ کر ہی نہیں دیکھا۔ حالانکہ کتنے سال تمہیں پالا پوسا۔ تمہاری سیوا کی مگر سچ ہے آج کل نیکی یاد کون رکھتا ہے۔"

وہ آج بھی ویسی ہی تھیں۔ بھگو بھگو کر مارنے والی وہ اسی خاموشی سے آ کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

"اماں...... آپ بھی کیا باتیں لے بیٹھی ہیں۔ چھوڑیں پرانے قصوں کو۔" دائیں طرف سے آتی آواز پر اس نے گردن گھما کر دیکھا تو وہی چھچھوندر تھا۔

"بھئی مجھے تو جب عثمان نے بتایا کہ آمنہ بھی آئی ہوئی ہے تو سچ پوچھو مجھے بڑا اشتیاق ہوا کہ دیکھوں تو ذرا میں بھی کہ مبین بڑے ٹھسے سے اسے ہیرا بنوانے لے گیا تھا۔ ہیرا بنی بھی یا کوئلہ کی کوئلہ ہی ہے۔" بظاہر ہنستے ہوئے ان کے الفاظ انتہائی تیکھے تھے۔

آمنہ نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ اچھا یہ مائی صاحب تھے۔

چچا میاں کا بڑا بیٹا جو زیادہ تر پنڈی میں رہتا اور جب بھی گھر آتا تو اپنے بڑے ہونے کا رعب صرف اسی پر جماتا۔ اس سے اپنے کام کروانے کی کوشش کرتا۔ آتے جاتے دھولیں مارتا۔ اس کی جھوٹی شکایتیں لگا کر اکثر چچی سے پٹوانا بھی یہی تھا۔

اسے نجانے کیوں آمنہ سے کوئی پرخاش سی تھی۔ اس کے کتنے نت نئے نام تھے جو اس نے رکھے تھے اور ناہید سے کہہ کر محلے کے بچوں میں یہ مشہور کروا رکھا تھا کہ منو انہیں کچرے کے ڈھیر سے ملی تھی۔ یہ کسی بھنگی کی اولاد ہے جسے ترس کھا کر انہوں نے رکھا ہوا ہے اور پھر سارے بچے اسے منو بھنگن کہہ کر چھیڑتے تو وہ غصے سے پاگل ہو کر انہیں مارنے دوڑتی اور جب ناکام ہو جاتی تو مائی کو کوسنے بیٹھ جاتی۔

کبھی جو یہ چچی سن لیتیں تو پھر اس کی وہ شامت آتی کہ توبہ۔ سب اس پر ہنستے اور وہ دل ہی دل میں سب کو کوسنے دیئے جاتی۔ تب وہ ایسی تھی۔ گنوار غصیلی مگر اب......

اس نے خالہ کو دیکھا جو ان کی کڑوی باتوں کا جواب بھی بہت سکون سے دے رہی تھیں۔

"مبین غرور سے نہیں، بے بسی کی حالت میں اسے لایا تھا۔ جب اپنے ہی مفاد پرست ہو جائیں تو دکھ بھی زیادہ ہوتا ہے اور ہیرا بھی کوئلے سے ہی نکلتا ہے باقی سب کا وارث و مددگار اللہ ہے اسی نے توفیق دی ہے تو اسے زمانے کے قاعدے سکھانے کی کوشش کر رہی ہوں۔"

خالہ کی صاف گوئی پر وہ ناگواری سے پہلو بدلنے لگیں۔ پہلو تو بے چینی سے عثمان بھی بدل رہا کہ اپنی ماں کی زبان کی تیزی سے واقف تھا۔ اسے سخت جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔

"اماں بس کرو نا اب۔" ماحول کی کشیدگی اسے آخر کار تیز بولنے پر مجبور کر گئی۔

"لو میں نے ایسا کون سا بم پھوڑ دیا ہے۔ برسوں بعد ملے ہیں تو گلے شکوے تو ہوں گے۔ تجھے کیوں پیٹ میں مروڑ اٹھ رہا ہے۔ میں نے ایسی کون سی بات کر دی ہے۔" انہوں نے صاحب زادے کو تند نظروں سے گھورا۔

صاحب زادے مزید کچھ کہتے کہتے رک گئے۔ والدہ کو جانتے تھے کہ انہیں کسی کا لحاظ ذرا کم ہی ہوتا تھا۔ اور مزاجاً وہ بھی انہی پر پڑے تھے سو شدید نقص امن کے خطرے کے پیش نظر صبر کے گھونٹ بھر کے رہ گئے (جو کہ کمال تھا)

پھر وہ آمنہ سے مصروف گفتگو ہوئیں اور عثمان

اسے مسلسل پراشتیاق نظروں سے گھورنے میں۔ وہ تو اللہ کا شکر ہوا کہ عائلہ آ کر اس کو لے گئی اور اس کی جان چھوٹی۔ خالو صفی اور عالی کے ساتھ شام کے قریب پہنچے اور عالی کے تاثرات چیخ چیخ کر بتا رہے تھے کہ زبردستی لائے گئے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے چائے وہی بنا کر لائی تھی۔

''واہ کیا خوشبو ہے۔ بھئی اپنی بیٹی کے ہاتھ کی چائے کو ترس گیا تھا میں۔''

خالو کی محبت اس کا سیروں خون بڑھا گئی۔

''اچھا!!! وہ جو میں روز صبح بیڈ ٹی بنا کر دیتا رہا اس کا کوئی ذکر نہیں۔'' صفی نے لاڈ سے شکوہ کیا۔

''بیٹا جی، اسے چائے کے علاوہ باقی سب کہا جا سکتا تھا۔'' اور صفی افسوس سے سر ہلانے لگا۔

''واہ والد محترم خوب پینترا بدلا آپ نے اس وقت تو بڑے اشتیاق سے چائے پی جاتی تھی۔''

''مجبوری کا نام شکریہ۔ تم بھلا ایسی مہکتی چائے بنا سکتے ہو۔'' وہ صفی کو اچھا خاصا زچ کر رہے تھے۔ سب ہی خوب لطف اندوز ہوئے۔

''یاد کیجئے والد بیٹی کی آمد سے پہلے یہی ہاتھ ہوتے تھے جو صبح و شام چائے بنا بنا کر ڈھوتے تھے۔ تب تو بڑی قدر تھی اس کاڑھے کی۔'' وہ باقاعدہ افسردہ ہو گیا (مصنوعی) آمنہ نے اس کی طرف داری کی۔

''خالو، یہ تو اب زیادتی ہے۔ صفی تو بہت اچھی کوکنگ کر لیتا ہے اور چائے بنانا سیکھی ہی میں نے اسی سے ہے۔'' اور خالو مسکرا دیئے۔

عالی شان البتہ اس دوران مارے باندھے بیٹھا چائے جیسے زہر مار کر رہا تھا بعد میں وہ ان کے استری والے کپڑے لے گئی۔

☆☆☆

رات کو مہندی کا فنکشن تھا مگر پرانی روایات کو زندہ رکھتے ہوئے طے یہ پایا کہ پہلے لڑکی والے لڑکے کو مہندی لگانے آئیں گے بعد میں دولہا سمیت سب لڑکی والوں کے ہاں رسم کرنے جائیں گے۔

کھانا ادھر ہی تھا مشترکہ۔ سب بہت پرجوش تھے۔ تیار ہونے کے بعد وہ باہر نکلی تو صفی کا پیغام آ گیا۔ وہ اسے دیکھنے گئی تو وہ تیار کھڑا اس کا منتظر تھا۔

''اچھا ہوا تم آ گئیں۔ جلدی سے مجھے چارجر لا دو کہیں سے۔ میں لانا بھول گیا ہوں اور اب بیٹری ختم ہونے کو ہے۔''

اس نے گھور کر صفی کو دیکھا پھر بادل نخواستہ موبائل تھام لیا۔ واقعی سب ہی کے چارجر ریزرو تھے۔ وہ پریشانی میں سوچ رہی تھی کہ کس سے مانگے جب عائلہ نے جھانکا۔

''تم آج پھر اتنی جلدی تیار ہو گئیں۔ چلو اچھا ہے۔ ذرا پلیز مجھے یہ...... مگر تمہیں لائنر سیٹ کرنا آتا کب ہے۔ ارے بت کیوں بنی کھڑی ہو۔ کیا بات ہے۔''

حسب عادت وہ نان اسٹاپ بولے جا رہی تھی اور پھر اس کی پرسوچ چہرے کو دیکھ کر پوچھ لیا۔

''چارجر چاہیے۔ موبائل چارج کرنا ہے۔''

''لو تو اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے۔ میرے پاس ہے مگر پلیز تمہیں دے تو رہی ہوں مگر خیال رکھنا کوئی پار نہ کر لے۔''

وہی صفی والا جملہ اس نے بھی بولا تو اسے ہنسی آ گئی۔ خالہ اور اپنے مشترکہ کمرے میں اس نے موبائل چارج پر لگا دیا۔ آج سب ہی لڑکوں نے سفید شلوار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ مختلف رنگوں کے پٹکے اوڑھے بھی اچھے لگ رہے تھے۔ عالی شان کو کسی نے زبردستی ہرے رنگ کا پٹکا پہنا دیا مگر ذرا دیر بعد اس نے گول مول کر کے پھینک دیا۔

مہندی میں خوب رونق لگی رہی۔ عمران کی رسم کرنے کے بعد وہ لڑکی والوں کے ہاں پہنچے۔ عمران بھنگڑے ڈالتا آگے آگے تھا اور سب اس کا خوب ریکارڈ بھی لگا رہے تھے مگر وہ ہنستا مسکراتا سب کے جملوں کے جواب دے رہا تھا۔ آج لڑکیوں نے لڑکوں کو آگے نہیں آنے دیا۔ بزرگوں کی مداخلت پر لڑکے شرافت کے جامے میں رہے۔

لڑکی کی رسم کے دوران لڑکوں نے ہلہ بول دیا۔ پھر تو تیل، مہندی اور مٹھائی سے وہ کھیل کھیلا گیا کہ عمران بے چارہ چیختا رہ گیا، کسی نے اس کی ایک نہ سنی۔ اس کی خوب لپائی ہوئی۔

اس سارے ہنگامے میں صفی بھی پیش پیش رہا۔ چہکتا ہوا، جملے کستا ہوا اس نے خوب رونق لگائے رکھی۔ خوش شکل تو دونوں تھے مگر اپنی حاضر جوابی اور خوش مزاجی کے باعث صفی کئی نظروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔

آمنہ اسے دیکھ دیکھ کر دعائیں پڑھ کر دم کرتی رہی۔ وہ اسے بھائیوں کی طرح عزیز تھا۔ پہلے دہی بھلوں، پانی پوری سے تواضع کی گئی۔

عائلہ نے تو خوب ہی چسکے لے لے کر پانی پوری سے انصاف کیا۔ آمنہ نے اس کے اصرار پر معذرت کر لی۔ وہ اتنا زیادہ کھٹا کھا نہیں سکتی تھی۔ بعد میں فروٹ چاٹ۔ منی برگرز، فرائس غرض ایک طویل فہرست تھی جس سے ہر کوئی اپنی مرضی سے لطف اٹھا رہا تھا۔

اس روز بھی عثمان کی گھورتی نگاہیں اس کا پیچھا کرتی رہی تھیں، مگر آج صفی کی وجہ سے اسے بہت تحفظ کا احساس ہو رہا تھا۔ اللہ اللہ کر کے مہندی کا فنکشن اختتام کو پہنچا۔ وہ کپڑے بدل کر لیٹنے لگی تھی جب افتاں وخیزاں آئی۔

”میرا چارجر! میرا چارجر کہاں ہے؟“

”شش خالہ سو چکی ہیں۔“ اسے گھرک کر وہ ساکٹ کی طرف بڑھی مگر چارجر نہیں تھا۔

”یہیں لگا تو چھوڑا تھا۔“

”تو پھر کہاں گیا۔ کیا جادو کے زور سے غائب ہو گیا ہے یا پھر آندھی اڑا کر لے گئی۔“ اس کے بے صبرے پن پر آمنہ گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔ پورا کمرہ اچھی طرح چھان مارا پر اسے نہیں ملنا تھا نہ ملا۔

”ہائے آمنہ، میرا تو اوریجنل چارجر تھا وہ بھی اکلوتا۔“

”ارے بھئی صبر تو کرو۔“ اس کی دہائی پر آمنہ جھنجھلائی۔

”آؤ۔“ کچھ سوچ کر وہ دروازے کی طرف بڑھی۔

”ارے کہاں جا رہی ہو؟ کچھ تو بولو...... کہاں لے جا رہی ہو مجھے۔ اوفوہ ہائے میری ٹانگیں۔“ اس کے پیچھے آتے وہ لگاتار اول فول بولے جا رہی تھی مگر آمنہ بڑے سکون سے لڑکوں کے کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئی۔

”لو بھلا اس وقت ادھر کیا کام ہمارا۔“ جواب دیئے بغیر اس نے دروازہ بجایا۔

”جی فرمائیے۔“ تیسری دستک پر دروازہ کھلا اور ایک صاحب برآمد ہوئے۔ موڈ سخت خراب تھا پر انہیں دیکھ کر دانت باہر نکل آئے۔

”صفی...... سفیان کو بلا دیں۔“ نہایت تحمل سے اس نے کہا۔

”اچھا اچھا سفیان ہیں پر کیوں؟ آپ مجھے بتا دیں کیا کام ہے۔ میں حاضر ہوں۔“ موصوف غالباً حد سے زیادہ خوش اخلاق تھے۔ عائلہ نے بھی جواباً اسی خوش خلقی سے فرمایا۔

”جی وہ ٹوائلٹ کا گٹر بند ہو گیا ہے وہی کھلوانا ہے۔ آئیے ذرا۔ مدد فرمائیے بھائی جان۔“ یہ سن کر بھائی جان کی جان جل گئی۔ دانت اندر اور خود فٹ سے کمرے میں غائب۔ ذرا دیر بعد سفیان آ گیا۔

”خیریت انماطوری ہمشیرہ۔“

(ادھر کیسے بہنا)

”چارجر...... چارجر تمہارے پاس ہے؟

”اچھا تو چارجر چور ہیں موصوف۔“ عائلہ بڑبڑائی کہ آج مہندی کے فنکشن میں دونوں میں خوب ٹاکرا رہا تھا۔ کس کا تھا چارجر کہاں سے آیا تھا وہ چارجر۔ کس رنگ کا تھا وہ چارجر۔“ اس نے عائلہ کو دیکھ لیا تھا اور اب جان بوجھ کر زچ کر رہا تھا۔ عائلہ دانت پیستی آگے آئی۔

”میرا تھا چارجر میرے گھر سے آیا تھا چارجر۔ سفید رنگ کا تھا چارجر۔ اب اگر یادداشت واپس آ

گئی ہو تو برائے کرم دے دیں۔"

"اچھا اچھا آپ کا تھا وہ چارجر جب ہی اس سے سڑے کریلے جیسی مہک آرہی تھی خیر۔ وہ تو شاید میرے پاس ہی ہے۔ ٹھہرو میں لاتا ہوں۔"

دونوں کی گھورتی نگاہوں کی تپش سے ٹپٹا کر وہ اندر مڑا۔ چارجر لا کر شرافت سے تھمایا گیا۔ عائلہ بڑبڑائی گئی۔

"تو ان موصوف کا موبائل چارج کرنا تھا۔ معلوم ہوتا تو چارجر کے بجائے اپنا پرانا جوتا دیتی تب انہیں پتا چلتا کہ سڑے ہوئے کریلے جیسی مہک کس سے آرہی ہے۔" وہ لڑکیوں کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

آمنہ اپنے کمرے میں جانے لگی تو عثمان ٹکرا گیا۔ ہلکی سی داڑھی اور اسٹائلش سے ہیئر کٹ کی وجہ سے وہ ماضی کے اس گھونچو اور مریل عثمان سے قطعاً مختلف لگتا تھا، جس کے سانولے چہرے پر آمنہ کو دنیا جہاں کی خباثت برستی نظر آتی تھی۔ آمنہ نظر انداز کر کے آگے بڑھتی گئی۔ وہ پھر سامنے آ گیا۔

"آج تو بہت حسین لگ رہی تھیں تم۔ مجھے تو یقین ہی آرہا...... کہ تم وہی منو ہو میرا دل تو چاہ رہا تھا کہ صرف تمہیں ہی دیکھتا رہوں۔" اس کے ستے جملے، نثار ہوتی نگاہیں آمنہ گھبرا سی گئی دل میں غصے کے ابال اٹھنے لگے۔

"آمنہ......" یہ جانی پہچانی آواز۔ آمنہ کے ساتھ عثمان نے بھی مڑ کر دیکھا۔ عالی شان کڑے تیور لیے کھڑا تھا۔

"تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ رات بہت ہو گئی ہے۔ لٹیرے ایسے وقت میں تاک میں رہتے ہیں۔" اس کا چبھتا لہجہ اور کٹیلی نگاہیں عثمان پر تھیں۔ آمنہ سرپٹ بھاگی۔ عثمان پہلے تو گھبرایا پھر جلدی سے وہ بھی مڑ گیا۔ عالی مٹھیاں بھینچے کھڑا رہا۔

☆☆☆

بارات کو ساری لڑکیاں ہی تقریباً پارلر چلی گئیں۔ عائلہ نے زبردستی کر کے آمنہ کو بھی ایک نیو ڈشیڈ کی لپ اسٹک لگادی۔ پھر کچھ سوچ کر کلر ڈارک کر دیا۔

"واہ دیکھو تو ذرا خود کو۔ کتنی حسین لگ رہی ہو۔" اس کے سراہنے پر آمنہ نے آئینے میں دیکھا۔ اسے اپنا آپ بہت عجیب لگا۔ یہ چہرہ اس سادہ سی آمنہ کا چہرہ تو نہیں تھا۔ آئینہ بھی گواہی دے رہا تھا کہ دوست خوب صورت لگ رہی ہے آگے کو کھلی ہوئی لٹیں۔ پیچھے کھلے ہوئے بال۔ ایک آبشار تھا جو اس کی پشت پر بہہ رہا تھا۔

عائلہ نے خالہ سے خصوصی اجازت لی تھی۔ اور اب اس کی اتنی تعریفوں پر وہ بے یقین سی گھبرائی ہوئی کھڑی تھی۔ خالہ نے جب اسے دیکھا تو ٹھٹکیں تو وہ بھی۔ اسے ساتھ لگا کر انہوں نے پیار کیا اور نظر کا دم پڑھ کر پھونکا۔ چچی کو بھی یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ وہی آمنہ تھی۔ اس کا یہ روپ آنکھوں کو خیرہ کر رہا تھا۔ تعریف تو اس کی ہر کسی نے کی اور جی بھر کے کی۔ مزہ تو تب کرکرا ہوا جب وہ چھچھوندر عثمان اپنی نثار ہوتی نگاہیں اس پر جمائے ہر جگہ اس کے پیچھے پیچھے پہنچنے لگا۔ وہ اس سے بچ بچا کر سائیڈ پر چلی گئی۔ جب ایک فلیش سا چمکا۔

"قسم سے ان کالی گھٹاؤں میں چھپ جانے کو جی چاہ رہا ہے۔ ہائے۔" پاس سے گزرتے یہ سرگوشی اس کو ساکت کر گئی۔ واپس مڑی تو عالی شان کھڑا خشمگیں نگاہوں سے اسے گھور رہا تھا۔

"کیا ضرورت تھی اتنا بننے سنورنے کی؟ کیا تمہاری شادی ہے یا لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کا شوق چرایا ہے تمہیں بھی۔" اس کے ترش لہجے اور سخت جملوں پر آمنہ کو دھچکا لگا۔

"ہٹاؤ یہ رنگ اور روغن اور سمیٹو بالوں کو اور خبردار جو اب میں نے تمہیں یوں بنے سنورے دیکھا۔ جان نکال دوں گا تمہاری سمجھیں۔" وہ کبھی اس سے اس لہجے میں نہیں بولا تھا۔ آمنہ کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"سنائی نہیں دے رہا تمہیں۔ جلدی کرو۔" چبا

چبا کر بولتے اس نے جیب سے رومال نکال کر زور سے اس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ آمنہ نے میکانکی انداز میں ہونٹ صاف کیے۔

"اور اب ان جنجالوں کو باندھو اور آگے سے انہیں کھولنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" درشت لہجے میں حکم دیتا وہ اس کے دھواں دھواں ہوتے چہرے کو اگنور کر کے چلا گیا۔ پہلے عثمان کا گھٹیا انداز پھر عالی شان کی تندی اور ترش روی۔

وہ تیزی سے ایک تاریک کونے میں جا کر رونے لگی۔ بالوں کو سمیٹ کر اسی رومال سے باندھ دیا تھا پھر سارے فنکشن میں وہ اسی کونے میں رہی۔ سب کا پرزور اصرار بھی اسے ٹس سے مس نہ کر سکا۔ دل پر ایک عجیب بوجھ آ گرا تھا۔ رخصتی کے بعد کی رسموں میں وہ سر درد کا بہانہ بنا کر شریک نہ ہوئی۔ کپڑے بدل کر وہ اندھیرے کمرے میں لیٹ گئی۔ دل اس وقت بہت اداس ہو رہا تھا۔

☆☆☆

"ابا...... میرے ابا کہاں ہیں آپ۔" دوپہر کو سبھی اس کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ خالہ اس کی وجہ سے فکر مند تھیں۔

"نظر لگ گئی ہے منو کو۔ کل لگ بھی تو بہت پیاری رہی تھی۔" وہ خالو سے مخاطب تھیں جو اس کا حال پوچھنے آئے تھے۔

"صرف کل...... زیادتی ہے بھئی۔ ہماری بیٹی تو ہے ہی پیاری۔"

خالو کی محبت پر اس کا دل [illegible] آیا۔ عائلہ جو چائے لے کر ابھی آئی تھی روٹھ گئی کہ اس کی تعریف تو کی نہیں گئی۔

"جائیں پھپھو، میں آپ سے سخت ناراض ہوں۔ کیا میں آپ کو پیاری نہیں لگتی؟"

"میری والدہ جھوٹ نہیں بولتیں لہٰذا پوچھنے سے گریز کرو کہ جواب دل توڑ سکتا ہے۔" صفی کے جملے پر وہ انگارے چبانے لگی۔

"کیوں بھلا؟ کیا میرے چار ہاتھ ہیں یا ماتھے پر ایک آنکھ۔ یا لولی لنگڑی ہوں میں۔"

"صفی۔" خالہ نے اسے تنبیہ کی پھر عائلہ کو پیار کرنے لگیں اور وہ ان کے گلے لگے ان کے کان میں نجانے کیا منمنائے جا رہی تھی جبکہ عائلہ کی اماں پیچ و تاب کھا کر رہ گئیں کہ صاحب زادی کی زبان کے آگے خندق بھی گویا۔

سب ہی آئے نہ آیا تو عالی شان...... نجانے اسے کیا ہو گیا تھا۔ کیا اسے اپنے سخت جملوں کا رتی بھر بھی احساس نہ تھا۔ کیا وہ اسے نہیں جانتا تھا کہ وہ کس کردار کی ہے۔ یہ باتیں سوچ سوچ کر دل پر بوجھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ وہ تو ولیمے پر جانا بھی نہیں چاہ رہی تھی مگر خالہ کے خیال سے اٹھ گئی۔

شوق سے خریدا گیا فراک اب اسے بہت اوور لگ رہا تھا پھر اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ عالی شان کے رویے کی وجہ سے کر بہت زیادہ حساس ہو رہی ہے۔ وہ کون ہوتا ہے مجھ پر پابندی لگانے والا یا مجھے اس طرح ڈانٹنے والا۔ غصے کی ایک تیز لہر سی اٹھی اور وہ کپڑے اٹھا کر ڈریسنگ میں چلی گئی۔ آج اس نے لپ اسٹک لگائی نہ ہی بال کھلے رکھے۔ عائلہ نے اس کا خوب صورت جوڑا بنا دیا۔ اس میں بھی وہ بہت اچھی اور منفرد لگ رہی تھی۔

سفیان اس کا بہت خیال رکھ رہا تھا۔ اس کے احساس، اس کی محبت پر اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ دل فخر و انبساط سے بھر گیا۔ وہ دانستہ عائلہ اور مائرہ کے ساتھ ساتھ ہی رہی۔ اس گھورو کو وہ کوئی موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔

"یار...... یہ عالی شان کیا ہنستا مسکراتا نہیں۔" کئی کزنز نے اس کے بھینچے لب دیکھ کر استفسار کیا وہ کیا کہتی۔

"لگتا ہے کسی نے ہونٹ ایلفی سے چپکا دیے ہیں۔"

"بہت مغرور ہے شاید۔"

"ہاں بھئی۔ حسن تو مغرور ہی اچھا لگتا ہے۔" کوئی بولی۔

"یہ سفیان بھی تو ہے۔ ہینڈسم ہے گڈلکنگ بھی ہے مگر کیسا زندہ دل اور چلبلا ہے۔"
وہ لڑکیوں کے گروپ میں خاموشی سے ان کے تبصرے سنتی رہی۔
"سفیان تھوڑی ہے وہ تو۔ چھچھورا ہے۔" عائلہ کا کہنا اسے برا لگا۔
"کیوں ایسا کون سا چھچھورپن دیکھ لیا ہے تم نے۔"
"تم تو اس کی ہی طرف داری کرو گی کہ بہن ہو اس کی۔"
"اچھا اگر یہ بہن ہے تو تم بھی تو بچپن کی منگیتر ہو۔" کسی نے انکشاف کیا اور آمنہ ہکا بکا رہ گئی۔
"کیا مطلب ......؟" اس نے اسلام آباد والے ماموں کی عینی سے پوچھا۔
"مطلب؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ چچی نے اس کے بچپن میں ہی کہہ دیا تھا کہ وہ عائلہ سفیان کو ہی دیں گی۔ پھپھو نے بھی کوئی اعتراض نہیں کیا۔ بڑوں کے درمیان زبانی کلامی بات ہے باقاعدہ منگنی نہیں ہوئی مگر لگتا ہے اب آفیشلی کچھ ہو جائے گا کہ سب ہی یہ بات جانتے ہیں۔"
ایسے زوردار انکشاف پر آمنہ نے عائلہ کو چٹکی کاٹی۔ وہ غصے سے دانتوں میں نیا دوپٹہ چبائے جا رہی تھی۔
"لو اویں خواہ مخواہ۔ بچپن کی ایک بات تھی کوئی پتھر پر لکیر تو نہیں...... تم لوگ تو بس۔"
کئی لڑکیوں کو تو یہ بات اب معلوم ہوئی پھر جو اس کا ریکارڈ لگا کہ بس۔
"اچھا بچو جی، جبھی موصوف کو دیکھ کر زبان میں کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔"
"جھوٹی۔" وہ مکر گئی صاف۔
"ادھر سے موصوف بھی صرف انہیں ہی چھیڑتے ہیں اور مسکرائے جاتے ہیں۔"
"زچ بھی اسے ہی کیا جاتا ہے۔"
"ہائے...... کیا رومانٹک سچویشن ہے۔"

"چھپی رستم نکلیں تم۔" سب ہی اس طرح طرح کے جملے بول کر سنا کر لطف لے رہی تھیں البتہ وہ اس سے لپٹ گئی۔
"مجھے تو یہ جان کر اتنی خوشی ہو رہی ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ اگر ایسا ہو جائے تو کتنا اچھا ہو گا عائلہ۔" اس کے لپٹنے پر عائلہ نے بمشکل مسکراہٹ چھپائی اور قدرے بے نیازی سے بولی۔
"تم بھی کن کی باتوں میں آ رہی ہو۔ بھئی وہ تو مذاق میں یونہی ایک بات ہوئی تھی۔ رات گئی بات گئی۔"
"مگر میں ضرور دعا کروں گی کہ ایسا ہی ہو۔ میرا بھائی ہیرا ہے ہیرا کسی خوش نصیب کو ہی اس کا ساتھ ملے گا اور وہ تم کیوں نہ ہو۔"
اور اس بار عائلہ اپنی مسکراہٹ چھپا نہ سکی۔
تقریب سے واپسی پر اس نے خالہ سے پوچھ لیا۔ وہ سن کر مسکرائیں۔
"صرف زبانی بات ہوئی تھی طے یہ پایا تھا کہ اس بات کو زیادہ پھیلایا نہیں جائے گا جب وقت آیا اور بچوں کی منشاء ہوئی تب باقاعدہ رسم کر دیں گے۔ اکثر بچپن میں باندھے گئے رشتے پائیدار نہیں ہوتے۔ ایک فریق کی بھی مرضی نہ ہو تو پرانے رشتوں میں بھی دراڑیں پڑ جاتی ہیں۔"
بات ان کی سولہ آنے درست تھی۔ اگلے دن ان سب کی واپسی تھی مگر ثروت خالہ نے بصد اصرار انہیں روک لیا کہ چوتھی کی رسم کے بعد ہی جائیں۔ عفت خالہ یوں بھی اب کہیں زیادہ آتی جاتی نہیں تھیں۔ بڑے عرصے بعد وہ گھر سے یوں نکلتی تھیں تو اب بہن بھائیوں کے اصرار میں چھپے مان و محبت کو دیکھتے وہ رک گئیں۔
عالی شان اور خالو تو صبح ہی نکل گئے۔ سفیان کی واپسی ان کی ساتھ طے پائی۔ اس دن زیادہ تر مہمان چلے گئے۔ گھر ایک دم خالی خالی ہو گیا۔
دولہا دلہن بھی رسم کے لیے دلہن کی طرف چلے گئے۔ چچی اور عثمان بھی جانے والوں میں شامل تھے

آمنہ نے شکر ادا کیا۔ اب بس چند قریبی عزیز بچے تھے یا ثروت خالہ کی بیٹیاں۔ اتنے دنوں کے ہنگاموں کے بعد یہ سکوت عجیب لگ رہا تھا۔

''آمنہ سنو!'' شام کو وہ دونوں لان میں ٹہل رہی تھیں جب عائلہ نے رازداری سے اسے مخاطب کیا۔ اس نے استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

''یہ جو عثمان تھا۔ تمہارا چچازاد۔ یہ کچھ زیادہ ہی تمہارے پیچھے نہیں پھر رہا تھا۔'' اس کا دل ایک لمحے کو دھڑکا اگر عائلہ جیسی پرواہ لڑکی نے یہ نوٹس کیا تھا تو نجانے اور کس کس نے دیکھا ہوگا۔

''کیا مطلب......؟'' وہ انجان بنی۔

''مطلب یہ کہ موصوف کی نگاہوں کے زاویے تم پر ہی فکس تھے۔ جہاں تم وہاں اس کی نگاہیں۔ اور شاید تمہیں علم نہ ہو اس نے اپنے موبائل سے تمہاری تصویریں بھی لی تھیں تمہاری بے خبری میں۔'' یہ سن کر وہ جامد ہوگئی۔

''تم ...... تم یہ کیسے کہہ سکتی ہو۔'' گم صم، پست آواز میں وہ پوچھ رہی تھی۔

''میں نے عالی شان کو اس سے الجھتے دیکھا تھا۔ شاید وہ انہیں ڈیلیٹ کرنے کو کہہ رہا تھا مگر وہ ڈھیٹ بنا انکاری ہوگیا اوپر سے وہ اس کی اماں۔ وہ بھی کود پڑیں درمیان میں۔ معاملہ بہت بڑھ جاتا اگر صفی آکر مداخلت نہ کرتا۔''

''یہ سب کب ہوا تھا؟'' وہ مضطرب ہوگئی تھی۔

''بارات کے دن جب تمہاری طبیعت خراب ہوگئی تھی۔'' اتنا کچھ ہوگیا تھا اور اسے پتا ہی نہیں چلا۔ شاید تب ہی عالی شان اس سے اتنا روکھا ہو رہا تھا۔ دل نے اس کے سارے قصور معاف کرنے چاہے مگر اس کے دل میں ایک ہلکا سا شکوہ ضرور ابھرا۔ وہ تو اس معاملے میں بے خبر تھی، بے قصور تھی پھر اسے کیوں ......؟

ان کی واپسی، ہوگئی جہاں بہت خوب صورت واقعات یادداشت کے حصے بنے وہاں چند تلخ یادیں جملے اور کچھ اندیشے بھی ساتھ ساتھ آئے تھے۔

روزمرہ کے معمولات پھر سے شروع ہوگئے۔ وہی صبح، وہی شام اور ہلکے پھلکے اوپر نیچے ہوئے دو واقعات سے بچی۔

عالی شان نے خالو سے مطالبہ کیا تھا کہ وہ اپنے باغات بیچ کر اسے کاروبار کرنے کے لیے سرمایہ دیں۔ وہ اب نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اپنے ایک دوست کے ساتھ مل کر پارٹنرشپ پر اپنا ذاتی کاروبار شروع کرنا چاہ رہا تھا۔

''ابا۔ اس ملک میں وہی کامیاب ہے جو اپنا کاروبار کرے۔ یہ نوکریاں، غلامی ہیں جب جی چاہا رکھ لیا۔ جب جی چاہا نکال باہر کیا اور میں اب مزید یہ ذلت سہہ نہیں سکتا۔ اپنے ذاتی سرمائے سے بزنس کرنا چاہتا ہوں۔'' خالو بڑی خاموشی سے اسے سن رہے تھے اور خالہ تعجب سے۔

''وہ باغ اتنے سالوں سے کیا دے رہے ہیں۔ آپ انہیں بیچ دیں۔ مجھے روپوں کی ضرورت ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں سارے پیسے واپس لوٹا دوں گا اور اگر آپ اپنی گریجویٹی کے پیسے۔''

''عالی شان کیا یہ گھر بھی بیچ نہ دیں۔'' خالہ نے بے اختیار ناراضی سے اس کو کاٹا۔

''اماں میں یہ کب کہہ رہا ہوں مگر......''

''اگر سب کچھ تمہارے ہاتھوں میں تھما دیں اور کل کو تمہارا سرمایہ ڈوب جائے تو کیا سفیان کی حق تلفی نہیں ہوگی۔'' وہ کھرے لہجے میں دوٹوک بولیں۔

''سفیان سے میں خود بات کرلوں گا مجھے یقین ہے اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''پر مجھے ہے اعتراض عالی! تمہیں جس چیز کا تجربہ نہیں تم اس میں سارا سرمایہ کس برتے پر جھونک رہے ہو۔''

''اماں، بجائے میری ہمت بندھانے کے آپ پہلے سے ہی میرا حوصلہ توڑ رہی ہیں۔ ہر کام نیا ہوتا ہے۔ کرنے سے ہی تجربہ آتا ہے بغیر مجھے پرکھے آپ کیسے میری ناکامی کا سوچ رہی ہیں۔''

''یعنی تمہارے تجربات کے لیے ہم سب کچھ

داؤ پر لگا دیں۔" ان کا لہجہ قدرے سخت ہو گیا جو کہ ان کا مزاج نہ تھا۔ سخت اور تلخ تاثرات عالی شان کے چہرے پر ابھرے۔ خالو ماں، بیٹے کی بحث بہت خاموشی سے سن رہے تھے۔ بولے کچھ نہیں۔

"ساری زندگی آپ نے لوگوں کے ساتھ کیا۔ ان پر احسانات کیے۔ ان پر لگایا اور جب آج۔ آپ کا اپنا بیٹا اگر کچھ مانگ رہا ہے تو آپ سو سو اعتراض اٹھا رہی ہیں۔" خالو کے لیے چائے لاتی آمنہ ٹھٹک سی گئی۔

"لوگوں کے بچوں کو پالتے، پڑھاتے آپ کو کبھی اعتراض نہیں ہوا۔ آپ نے اپنی سو ضرورتیں پس پشت ڈالیں اور انہیں پورا کیا اور جب اپنی اولاد کو دینے کی باری آئی تو تاویلیں دی جا رہی ہیں۔" خالو کو جلدی سے چائے تھما کر وہ پلٹ گئی۔ عالی شان کے لفظوں نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔ اس کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ وہ یقیناً منو کی بات کر رہا تھا۔

"تو اب انہیں میرا یہاں رہنا بھی گوارا نہیں۔ میرے کھانے پینے کا حساب کیا جا رہا ہے۔" بے جان ہو کے وجود کو گھسیٹتے وہ کچن میں پڑے اسٹول پر بیٹھ گئی۔ کچن کی گرمی جیسے کسی چیز کا احساس بھی اسے نہیں ہو رہا تھا۔ اتنے سالوں سے وہ کس حق سے وہاں رہ رہی تھی؟ کس برتے پر؟ ابا کی خالہ زاد کے گھر رہنے کا کوئی جواز بنتا تھا کیا؟ سوالات در سوالات اس کے ذہن میں کھلبلی مچا رہے تھے۔

ابا اسے اپنے ساتھ کیوں نہیں لے گئے۔ اب تو ان کو شادی کیے بھی تین سال ہو گئے تھے۔ ان کا وہاں گھر تھا پھر کیوں اس کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کندھوں سے اتار کر کسی اور پر لاد رکھا تھا۔ اب سے پہلے اسے اپنا آپ اتنا ارزاں نہیں لگا تھا۔ خالہ کی تربیت نے اسے بہت مضبوط بنایا تھا مگر اس وقت اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ اطلاعی گھنٹی کی آواز پر وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔ گھر میں پھیلی خاموشی بتا رہی تھی کہ کچھ دیر پہلے ہونے والا معرکہ شاید ختم ہو چکا تھا اور وہ خود...... پسینے اور آنسوؤں کے سمندر میں نہائی ہوئی تھی۔

شام کا وقت تھا خالہ کسی گہری سوچ میں ڈوبی لیٹی ہوئی تھیں۔ خالہ کے مہمان آئے ہوئے تھے۔ ان کی تواضع کے بعد وہ شربت کا گلاس خالہ کو دے گئی۔ موبائل فون کی بجتی گھنٹی کی آواز اس نے سنی تھی یقیناً خالہ نے فون اٹھا لیا تھا۔ کافی دیر بعد وہ کچن سمیٹ کر باہر نکلی تو بھی خالہ تخت پر دراز کسی گہری سوچ میں ہی غرق تھیں۔ اس نے انہیں متوجہ کرنے سفیان کی بھیگی ہوئی شرٹ دھونے لگی۔ مغرب کی اذان ہوئی تو خالو مہمانوں کو رخصت کر کے اندر آئے۔ وہ بھی نماز کے لیے اٹھ گئی۔ گھر میں دوپہر سے ایک جامد گہرا سناٹا پھیلا ہوا تھا۔ خالو چپ تھے تو خالہ فکر مند۔

عالی شان اس وقت کا نکلا ابھی تک گھر نہیں آیا تھا۔ صفی بھی یونی ورسٹی کے لیے نکلا ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔ دل تو اس کا بھی بوجھل اور اداس تھا۔ رات کا کھانا آج خالہ نے جلدی کھا لیا۔ اس نے صحن میں چارپائیاں بچھا کر بستر لگا دیئے۔ خود وہ بڑے صوفے میں رسالہ ہاتھ میں لیے بے دلی سے صفحے پلٹ رہی تھی۔ خالہ، خالو کے ساتھ نجانے کون سے راز و نیاز کر رہی تھیں باوجود کوشش کے اس کے پلے ایک لفظ نہ پڑا۔ رات کی رانی اور موتیے کی مہک اس ساکن فضا کو مہکا رہی تھی۔ ساون کا مہینہ تھا اور فضا میں حبس بڑے طمطراق سے براجمان تھا۔ ایسا ہی حبس اسے اپنے اندر بھی محسوس ہو رہا تھا۔

صفی کا فون آیا تھا اسے آنے میں دیر ہو جائے گی اور عالی شان! اس کا کچھ اتا پتا نہ تھا۔ خالہ گولی کھا کر لیٹ گئیں۔ تھوڑی دیر گزری کہ دونوں سو گئے۔ وہ رسالہ بند کر کے کیاری کے پاس رکھے مونڈھے پر آ بیٹھی۔ یہ گھر۔ اس کے مکین اسے کتنے عزیز ہو گئے تھے اسے خبر ہی نہ ہو سکی۔ یہ اس کے محسنوں کا گھر تھا جہاں اس کی شخصی تعمیر و تربیت کی گئی۔ جہاں اسے مان ملا۔ محبت و عزت ملی۔ اس نے کیاری میں کھلے

پھولوں کو ہلکا سا چھوا۔ کئی پل اسے یاد آنے لگے وہ اپنی سوچوں میں گم تھی تب ہی ہلکا سا کھٹکا ہوا۔

دروازے پر یقیناً کوئی تھا۔ ہلکی سی دستک پر اس نے اٹھ کر گیٹ کھولا۔ صفی تھا۔ دبے قدموں اس کے ساتھ چلتا وہ برآمدے تک آیا۔

''اوفوہ۔ آج تو بہت تھک گیا ہوں۔ ابا، اماں سو گئے؟ چلو اچھا ہوا۔ کھانے میں کیا ہے۔ ابھی تک کچھ نہیں کھایا۔ جلدی سے کھانا گرم کرو۔ آنتیں قل پڑھ رہی ہیں میں بس ابھی نہا کر آیا۔''

وہ کتابیں رکھنے اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔

آمنہ باورچی خانے میں چلی آئی جب تک وہ ٹرے بنا کر نکلی وہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس پہر ہلکی ہلکی ہوا چلنی شروع ہو گئی تھی۔ موتیے کی مہک سارے میں پھیل گئی۔ سبزے کی باس سانسوں کو مہکانے لگی تھی۔

''اماں ابا کچھ جلدی ہی سو گئے ہیں اور بھائی میاں۔ بھائی میاں کہاں ہے۔ لگتا ہے ان کی سواری باد بہاری ابھی تک دولت کدے پر نہیں آئی۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے جا رہا تھا۔

''صفی! حیدر آباد میں بارات والے دن کیا ہوا تھا؟''

اس کے غیر متعلق سوال پر وہ چونکا۔

''سوال چنا۔ جواب گندم۔ خیر است منو...... بارات کے دن نکاح ہوا تھا اور کیا ہونا تھا۔ ہاں رخصتی بھی ہوئی تھی۔''

''اس روز عثمان اور عالی شان کے درمیان کیا ہوا تھا۔'' اس کی غیر سنجیدگی کو نظر کرتی وہ انتہائی سنجیدہ تھی۔ صفی نے بغور اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں۔''

''جھوٹ مت بولو صفی۔ مجھ سے مت چھپاؤ۔ میری وجہ سے کوئی جھگڑا ہوا تھا ان میں۔'' پانی کا گلاس منہ سے لگا کر اس نے سارا ختم کیا پھر قدرے پرسکون ہو کر تصحیح کی۔

''تمہاری وجہ سے نہیں۔ اس کی غیر اخلاقی حرکت پر۔''

''کیا حرکت کی تھی۔ میری تصویریں کھینچی تھیں میری بے خبری میں۔'' اب کہ صفی تردید نہ کر سکا۔

''یہ سب پوچھنے کا کیا مقصد ہے تمہارا۔''

''میری ذات کے بارے میں معاملہ ہو اور میں بے خبر رہوں۔ تم خود کو میرا بھائی کہتے ہو۔ دوست ہونے کا دعوہ کرتے ہو تو خدارا کھل کر بتاؤ ہوا کیا تھا۔'' اب کہ اس کے لہجے میں بہت خفگی تھی۔ صفی چند لمحے جانچتی نگاہوں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بتانے لگا۔

''عثمان تمہاری بے خبری میں مسلسل تمہاری تصویریں کھینچ رہا تھا۔ عالی بھائی نے اسے یہ کرتے دیکھ لیا اور اس کا موبائل چھین کر وہ تصویریں ڈیلیٹ کر دیں اس بات پر عثمان کی بھائی میاں سے تلخ کلامی ہو گئی۔ وہ تمہاری یا چاہے کسی بھی لڑکی کی تصاویر یوں بغیر اجازت کے کھینچے۔ بات بہت بڑھ جاتی اگر میں اور شانی (کزن) بیچ میں نہ آتے۔ ادھر سے آپ کی چچی صاحبہ بھی بیٹے کی حمایت میں آ گئیں۔ نجانے کیسی عجیب و غریب خاتون ہیں بجائے اپنے بیٹے کو ملامت کرنے یا بات ختم کروانے کی کوشش کرتیں وہ الٹا بڑھ چڑھ کر اس کی حمایت کر رہی تھیں۔ خیر معاملہ تو وہیں ختم ہو گیا تھا مگر بھائی میاں بہت غصے میں تھے۔'' وہ تو سنا کر چپ ہو گیا مگر آمنہ کی مسلسل خاموشی پر اسے محسوس ہوا کہ آمنہ ہرٹ ہوئی ہے۔

''منو۔ تم ہمارے گھر کی عزت ہو۔ تمہیں کوئی میلی نگاہ سے دیکھے یا غلط کہے تو یہ ہماری غیرت پر تازیانہ ہے۔ تمہیں ہم نے کبھی خود سے الگ نہیں سمجھا۔'' اس کے لہجے میں سچائیاں بول رہی تھیں۔ مگر دوپہر کو سنے گئے وہ جملے۔

''تم ایسا سمجھتے ہو شاید مگر عالی شان کو میرا ادھر رہنا پسند نہیں ہے۔''

''یہ خیال کیسے آیا تمہاری عقل شریف میں بھائی کو بھلا کیا اور کیوں کر اعتراض ہو سکتا ہے۔ کیا انہوں نے تمہیں کبھی جتایا ہے۔'' وہ یقین کرنے کو تیار

نہیں تھا۔

"براہ راست تو نہیں مگر ان کی چند باتوں کا مفہوم کچھ ایسا ہی تھا۔"

"ارے واہ...... اب یہ مورنی بھی سمجھ دار ہو گئی ہے۔ لفظوں سے مفہوم اخذ کرنے لگی ہے۔" اس نے قدرے طنز سے دیکھا۔ مورنی تو وہ اسے چڑ کر اس کے بھدے پاؤں کی وجہ سے کہا کرتا تھا۔

"میں بھائی میاں کو اچھی طرح جانتا ہوں آمنہ وہ بھی اتنے کم ظرف نہیں ہو سکتے۔" وہ بحث کر سکتی تھی مگر چپ رہی وقت ثابت کر چکا کہ کون کم ظرف ہے اور کتنا۔ اس نے ایک جملے میں بات ختم کی۔

سفیان نے افسوس سے سر ہلایا اور طنزیہ کہا۔

جزاک اللہ کہ چشم حاد کر دی (خدا آپ کو جزائے خیر دے کہ آپ نے ہماری آنکھیں کھول دیں)

☆☆☆

عالی شان دو تین دن سے لیٹ آ رہا تھا سفیان کو معلوم تھا کہ وہ، کس دوست کی طرف ہے وہ اکثر ادھر ہی چلا جاتا وہ چھت سے کپڑے اتارنے آئی تھی۔ سفیان بھی وہیں تھا آج صبح سے ہی بادلوں نے ڈیرا ڈال رکھا تھا۔ ہوا بند تھی اور فضا میں حبس بھرا تھا۔ صفی فون پر مصروف تھا۔ وہ تیزی سے کپڑے اتارنے لگی۔

"ارے سنو...... مورنی!" مورنی اس کی چڑ بنا رکھی تھی اس نے بقول اس کے۔ منو سرتاپا بدل گئی ہے مگر اس کے پیر اب بھی ویسے ہی ہیں بھاری مردانہ بلکہ مزدورانہ۔

"سنا ہے نیہرے جوڑا آ رہا ہے تمہارا" کپڑے اتارتے اس نے پلٹ کر تابھی سے اسے دیکھا۔

"مطلب۔"

"وہ بھئی مطلب کا تو نہیں پتا مگر آپ کے مستقبل قریب کے سسرالی بہ نفس نفیس تشریف لا رہے ہیں۔ ڈھول تاشے لے کر کہ بنو کو لے کر ہی جائیں گے۔"

وہ کبھی بھی سنجیدہ نہیں ہوتا تھا وہ ہنوز اسے دیکھتی رہی۔

"ارے ایسی قاتل نگاہوں سے کیا دیکھ رہی ہو۔ فون آیا تھا ملتان سے۔ آپ کی چچی محترم نے رشتہ ڈالا ہے ڈالا کیا ہے بس زبردستی کی دھونس جما رہی ہیں۔ حق جتا رہی ہیں آپ پر۔" یہ انکشاف کس قدر ہولناک تھا وہ گم صم ہی کھڑی رہ گئی۔ وہ اب آ کر بقیہ کپڑے تار سے اتار رہا تھا۔

"والدہ تو شاکڈ ہیں ہی والد محترم بھی انگشت بدنداں ہیں کہ چہ ماجرا است۔" (یہ کیا معاملہ ہے) اس کے بت بنے وجود میں حرکت ہوئی۔

"یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے۔" وہ بڑبڑائی مگر صفی کے تیز کانوں نے جھٹ سن لیا۔

"ہونے کو تو کیا نہیں ہو سکتا ڈیئر۔"

وہ فوراً پلٹی اور دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترنے لگی۔ صفی ہیں ہیں۔ کرتا رہ گیا پھر آہ بھرتے بقیہ سارے کپڑے اتارنے لگا۔ صفی کی اطلاع درست تھی۔ اس شادی میں اس کے ایک سے زیادہ رشتے آئے تھے مگر خالہ نے سب کو سہولت سے ٹال دیا کہ فی الحال اسے ابھی پڑھنا ہے مگر چچی کا دھونس بھرا انداز۔ وہ کسی صورت ٹلنے کو تیار نہیں تھیں۔ آمنہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

خالہ سے پوچھنے کی ہمت ہی نہ ہوئی نہ ہی نوبت آئی کہ اگلے دن ہی چچی، عثمان بمع زبیدہ کے آن دھمکیں۔

خالہ ان سے اچھے طریقے سے ملیں حالانکہ سامنے والوں کے انداز و اطوار قطعی دوستانہ اور مہذبانہ نہیں تھے۔

ہر چیز کو تولتی نگاہوں سے دیکھتی چچی صاحبہ اور دیدے گھما گھما کر بولتی زبیدہ عرف زوبی۔ عثمان کی عیار آنکھیں بھی ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔

خالہ کے اشارے پر وہ تواضع کے لیے کچن میں گھس گئی۔

سہ پہر کے چار بجنے والے تھے۔

گھر میں آج سبزی بنی ہوئی تھی۔ اس نے

فریزر سے چکن نکالا چڑھایا۔ فٹافٹ کباب فرائی کیے۔ روٹیاں پکا کر وہ سلاد رائتہ بنانے لگی تھی جب زبیدہ بھی چلی آئی۔

''ایسی کون سی جادو کی چھڑی مل گئی ہے تمہیں۔ تم تو بالکل ہی بدل گئی ہو منو۔''

چمکتا گھر۔ اس کا نکھرا ستھرا سراپا۔ کچن میں اس کی پھرتیاں۔ وہ سخت متاثر ہوئی۔

''صرف محبت وخلوص کا جادو۔'' اس کا انداز جتاتا ہوا نہیں تھا۔ مگر وہ برا مان گئی۔

''تو کیا ہم تم سے محبت نہیں کرتے تھے۔ یاد کرو بچپن میں ہم مل کر کتنا کھیلتے تھے۔ تم، میں، مانی، جانی۔''

''کھیلتے تم لوگ تھے میری حیثیت تو ایک بارہویں کھلاڑی کی سی ہوتی تھی۔'' وہ اب چکن چیک کر رہی تھی۔

''تم تو لگتا ہے بھول گئی ہو۔ آٹھ سال تمہیں رکھا۔ تحفظ دیا۔ اماں نے ہمارے منہ کا نوالہ بھی چھین کر تمہیں کھلایا۔''

اسے جھوٹ بولنے اور ڈھٹائی میں کمال حاصل تھا۔ آمنہ جانتی تھی سو تحمل سے یہ سب سنتی رہی۔

''تو کیا قیمت وصول کرنا چاہتے ہو ان آٹھ سالوں کی۔''

''ہائیں کیا کہا تم نے، لو ہم تمہیں اتنے گھٹیا لگتے ہیں کیا۔ یا بیوپاری تاجر ہیں۔''

وہ ناراض ہو گئی۔ آمنہ نے پرواہ نہیں کی اور پھر سے ٹرے سجانے لگی۔

''اتنا غرور اچھا نہیں ہوتا۔ تم تو شاید مجھ سے بات کرنا بھی پسند نہیں کر رہیں۔''

''ایسی بات نہیں ہے زبیدہ! مجھے کس چیز کا غرور ہوگا (جو خود کسی دوسرے کے در پر پڑی ہوئی ہے) وہ بات کرنے کا سوال تم نے کچھ پوچھا نہیں ہے صرف احسان جتا رہی ہو اور اس کا جواب صرف شکریہ ہوتا ہے۔'' اس کے اکھڑے تیور دیکھتی آمنہ نے نرمی سے جتا دیا پھر اس نے صفی کو فون کیا۔

''تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ آ جاؤ فوراً۔''

ایک جملہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا اور واقعی۔ صفی جلد آ بھی گیا۔ پھر باقی کا سارا وقت اس نے سکون سے کمرے میں گزارا۔

صفی عثمان کو انگیج رکھے ہوئے تھا اور زبیدہ اس کا دماغ کھاتی رہی۔

رات کھانے کے بعد خالہ نے کینیڈا فون ملایا۔ پہلے تو چچی نے لمبے چوڑے گلے شکوے کیا۔ ان کی بے اعتنائی کا رونا رویا۔ اپنے احسان یاد کروائے اور آخر میں۔

''اب میں کچھ نہیں سننے والی۔ بس آمنہ آج سے میری ہے۔'' ان کا حق جتاتا انداز۔

ابا کو بتانے کے لیے کافی تھا کہ ابا کچھ بھی بھولے نہیں تھے پر زندگی کے اتنے روپ دیکھ چکے تھے کہ اب انہیں ہر طرح کی صورت حال میں بھی ضبط کا دامن ہاتھ سے جانے نہیں دیتے تھے۔

''بھابھی بیگم آمنہ ابھی پڑھ رہی ہے جب تک اس کی تعلیم مکمل نہیں ہو جاتی میں اس طرح کا کوئی سلسلہ شروع نہیں کرنا چاہتا۔ ہاں، جب بھی سوچا تو آپ کے عثمان کو بھی نظر انداز نہیں کروں گا۔''

''لو بھلا یہ کیا بات ہوئی۔ منگنی کر دینے میں کوئی حرج نہیں۔ بچی پڑھائی کرتی رہے گی۔ شادی سال دو سال بعد کر لیں گے۔'' وہ ٹلنے کو تیار نہ تھیں۔

''میرا فیصلہ حتمی ہے۔ اگر آپ کو بہت جلدی ہے تو آپ عثمان کی بات دوسری جگہ ٹھہرا دیں مگر میری طرف سے ابھی معذرت۔''

ابا کے دو ٹوک انداز پر وہ زیادہ واویلا نہ کر سکیں۔ ان کے قطعیت بھرا انداز وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

عالی شان ویسے بھی آج کل گھر نہیں آ رہا تھا۔

☆☆☆

چچی بیگم، دو دن رہ کر زبیدہ کے ساتھ واپس چلی گئیں۔ ساتھ اسے بھی دعوت دے گئیں۔ عنقریب زبیدہ کی شادی ہونے والی تھی اس میں شرکت کا

اصرار کر کے گئی تھیں۔

عثمان رک گیا تھا کہ بقول اس کے اسے کراچی میں کچھ کام تھا۔ فضا میں آج کل حبس بہت بڑھ گیا تھا۔ سمندر کی طرف سے سر شام چلنے والی ہوائیں بھی لگتا تھا رک گئی ہوں۔

یہ دم سادھی فضا آمنہ کے دل کی اداسی مزید بڑھا گئی۔ ایسا موسم تو اس نے اس شہر میں کبھی نہیں دیکھا تھا یا شاید۔ ساون اس دفعہ اس کے اندر اتر آیا تھا۔ گہرے ساکت بادل۔ منجمد ہوا اور حبس۔ ایسا موسم ہی دل میں بھی چھایا ہوا تھا۔ اس کا دل گھبرانے لگتا۔

پتا چلا عالی شان شہر سے باہر گیا ہوا ہے۔ وہ آج لوٹا تھا۔ آگے سے عثمان کو دیکھ کر اس کے نقوش تن گئے۔

''یہ یہاں کیا کر رہا ہے؟''

صفی نے سارا سیاق وسباق بتا دیا۔

''اچھا تو اب یہ اپنی دال گلانے آئے ہیں۔''

وہ طنزاً مسکرایا۔

''اس کی تو گلتی نظر نہیں آ رہی۔ آپ ہی کوشش کر لیں۔'' صفی کے ذو معنی لہجے پر اس نے ناگواری سے سر جھٹکا۔

''فضول بکواس مت کرو۔''

''اس میں فضول بات کیا ہے۔ چراغ لے کر ڈھونڈیں گے تب بھی ایسا سورج نہیں ملے گا۔'' اب کہ عالی شان نے سختی سے دیکھا۔

''میرے سر میں بہت درد ہو رہا ہے بہتر ہوگا۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔''

بے مروتی سے کہتے وہ واش روم میں گھس گیا۔ وہ کندھے اچکاتا چلا گیا۔

☆☆☆

رات کھانے کے وقت عالی شان عثمان کو مکمل نظر انداز کیے خاموش رہا۔ آمنہ تو جلدی ہی اٹھ گئی کہ بھوک بھی روٹھ گئی تھی جیسے۔

کھانے کے بعد خالو عالی شان کو لیے واک پر نکل گئے۔ یقیناً اب وہ اتنے دنوں کا احوال پوچھیں گے۔ وہ کام سمیٹ کر خالہ کی چارپائی پر آ بیٹھی اور ان کے سر پر مالش کرنے لگی۔

کچھ دنوں سے وہ بہت مضمحل رہنے لگی تھیں۔ ان سات سالوں میں، آمنہ نے انہیں اس قدر تھکا ہوا نہیں دیکھا تھا یقیناً یہ ساری پریشانی عالی کی وجہ سے تھی۔ صفی کو دیر سے آنا تھا۔ عثمان چھت پر تھا سو امن تھا۔

''خالہ، کیوں پریشان ہوتی ہیں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔''

اس کی تسلی پر وہ مسکرائیں۔

''آپ تو بہت بہادر اور مضبوط ہیں۔ اتنا مایوس میں نے آپ کو کبھی نہیں دیکھا۔ آپ مجھے یہ سکھاتی آئی ہیں کہ مایوسی امید کو کھا جاتی ہے۔ امید ہی ہمیں آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتی ہے۔ تو اب آپ ہی امید چھوڑ رہی ہیں۔''

اس کے مالش کرتے ہاتھ انہوں نے محبت سے تھامے۔

''میں مایوس نہیں ہوں منو! بس سوچتی ہوں میری تربیت میں کم ہمتی اور مایوسی کا درس تو شامل نہیں تھا پھر عالی شان کیوں تلخ ہوتا جا رہا ہے۔''

''وہ بھی ٹھیک ہو جائیں گے خالہ۔ اکثر ہمیں رستے نہیں ملتے اور اگر رستہ مل بھی جائے تو رہ نما نہیں ملتا۔ میں کیا تھی؟'' اس کا درد اس کے لہجے میں جھلکنے لگا۔

''ایک بے مایہ بیکار سا وجود۔ جس کے ہونے نا ہونے سے کسی کو فرق نہیں پڑتا تھا مگر مجھے آپ کی صورت میں ایک مخلص رہ نما ملا تو منزل تک پہنچنے میں آسانی ہونے لگی ہے۔''

''کوئی بھی بے کار یا بے مایہ نہیں ہوتا منو۔ یہ لوگوں کے بنائے ہوئے رواج اور پیمانے ہیں جو کیسے کیسے نگینوں کو رول دیتے ہیں اور رہ گئیں تم۔ تمہاری قدر کوئی میرے دل سے پوچھے۔ تم نے بیٹی کی کمی پوری کر دی ہے اور اب اتنے سکھ دے رہی ہو

کہ ہر وقت دل سے دعائیں نکلتی ہیں تمہارے لیے۔“
خالہ کی محبت پر اس کی آنکھیں نم ہوگئیں وہ بے ساختہ ان سے لپٹ گئی۔ وہ اس کے بالوں میں محبت سے ہاتھ پھیرے جا رہی تھیں اور کتنے عرصے بعد بے قرار دل کو قرار آ رہا تھا۔ کتنے بوجھ ہلکے ہو گئے تھے۔ کتنے ابھی باقی تھے۔

☆☆☆

خالو لوگ کب آئے اسے خبر ہی نہ ہوئی وہ خالہ سے لپٹ کر سو گئی تھی پر سکون اور میٹھی نیند۔
عثمان تاک میں تھا کہ کب موقع ملے اور منو سے بات کرے اور یہ سنہری موقع اسے دوپہر کو مل گیا جب خالہ خالو آرام کرنے لیٹ چکے تھے صفی اور عالی گھر پر نہیں تھے، وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے لگی تھی کہ ایک دم اس نے ہاتھ رکھ کر روک لیا۔
”بات سنو آمنہ، میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا خدارا پلیز۔“ اس کا لہجہ ملتجی تھا۔ کچھ سوچ کر آمنہ نے آر یا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔
”باہر آئیے۔“ وہ دروازہ چھوڑ کر باہر نکل آئی۔ برآمدے میں رکھی کرسیوں پر بیٹھ کر اس نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔
”فرمائیے۔“
”آمنہ گو کہ بات بہت طویل گہری ہے پر میں تمہارا زیادہ وقت نہیں لوں گا تم بہتر جانتی ہو ہمارے گھر کا ماحول کیسا ہے اماں کی بد سلیقگی کی چھاپ گھر کے چپے چپے سے لے کر دونوں بہنوں تک پر گہری ہے۔ ناہید جیسے تیسے بیاہی گئی پر سسرال میں اس کا گزارا مشکل سے ہو رہا ہے۔
زبیدہ بھی ابھی سے اسی کے نقش قدم پر چل رہی ہے۔ بڑے بھائی کی شادی اماں نے اپنی بھتیجی سے کروا دی اور وہ بھی اماں کی کاپی ہے۔ بد زبان اور پھوہڑ۔ آئے دن گھر میں اماں اور بھابھی کے معرکے ہوتے ہیں اور ان معرکوں میں زبیدہ بھی پیش پیش رہتی ہے۔ غرض وہ گھر، وہ ماحول اس سے میرا دل اوب گیا ہے۔

اور میں نے یہ سب دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا تھا کہ میں کسی ایسی لڑکی سے شادی کروں گا جو ہر لحاظ سے مکمل ہو گی۔ جو گھر کو گھر بنانے کے فن میں طاق ہو۔ جو محبتوں رشتوں کی قدر کرنا جانتی ہو اور پھر تمہیں دیکھا، پرکھا۔ تو یوں لگا کہ میری تلاش ختم ہو گئی ہو۔
تمہاری نیک فطرت، سلجھے ہوئے انداز دیکھتے ہی دیکھتے میں تمہاری محبت میں گرفتار ہو گیا۔ تمہاری جیسی لڑکیاں ہی ہوتی ہیں جو گھر کو جنت بناتی ہیں۔ میں گارنٹی دیتا ہوں تمہیں۔ بہت خوش رکھوں گا۔
میں یوں بھی پنڈی میں جاب کرتا ہوں۔ آفس کی طرف سے گھر بھی ملا ہوا ہے۔ میں تمہیں اس گھر میں کبھی نہیں رکھوں گا جہاں سے تمہاری تلخ یادیں وابستہ ہیں۔ یا جہاں تمہیں تکلیف ہو۔ تم مجھے ایک موقع دو کہ تمہاری محبت اب میری رگ رگ میں دوڑنے لگی ہے۔
ہو سکے تو میرے بارے میں ایک بار ضرور سوچنا۔ میں تمہارے جواب کا منتظر رہوں گا۔“
اپنی بات مکمل کر کے اور اس کا جواب سنے بغیر وہ تیزی سے پلٹ گیا۔ آمنہ وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ کئی سوالات لیے۔

☆☆☆

صفی کی زبانی اسے علم ہوا کہ ایک باغ تو خالو کب کا بیچ چکے تھے۔
ان کی یتیم بھانجیوں کی شادی تھی سو باغ بیچ کر اس رقم سے انہوں نے یہ فریضہ سر انجام دیا تھا۔ خالو جیسے دیالو اور درویش صفت انسان سے یہی توقع کی جا سکتی تھی۔ دوسرے باغ کی آمدنی سے ان کی تعلیم اور کئی دوسرے اخراجات پورے ہو رہے تھے بقول صفی کے عالی شان آج کل بہت مایوس ہو رہا تھا۔
آمنہ اس مسئلے پر سوچنے لگی۔ ہر طرف ہرنے والے بند در نجانے قدرت کی کیسی آزمائش تھی۔ اس امتحان میں نجانے وہ کامیاب ہوتا ہے یا نہیں۔

☆☆☆

عثمان کا انداز بہت مہذب و محتاط تھا اس لیے منو

قدرے مطمئن تھی۔ آتے جاتے اس کی نگاہیں اپنے سوال کا جواب مانگتیں۔ منو گومگو کا شکار تھی۔ موسم کا وہی حال تھا بند ہوا اور روز چھانے والے بادل جو برس کے نہیں دے رہے تھے۔ اس وقت وہ اسٹور روم میں کچھ چیزیں رکھنے آئی تھی۔ جس کی وجہ سے اس نے کونے والی کھڑکی کھول دی۔

"تمہارا مقصد کیا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آمنہ تمہارے لیے ایک بلینک چیک ہے۔ اس سے شادی کر کے تم اسے کیش کروانا چاہتے ہو۔ بینک بیلنس، چچا کی طرف سے ملنے والی مراعات اور چونکہ وہ اس سال آمنہ کو اپنے پاس بلانے کا ارادہ رکھتے ہیں پھر تو لازمی ہے اس کا شوہر بھی جائے گا۔ تمہارا پلان فول پروف ہے۔ ایک دم مکمل مگر میں ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" یہ آواز...... یہ سو فیصد عثمان کی تھی۔ آمنہ ٹھٹک گئی وہ کس سے مخاطب تھا؟

"اوہ تم تو نجومی ہو تمہیں یہ سب کیسے پتا چلا؟" یہ عالی تھا۔ اس کی آواز میں کچھ عجیب سا تاثر تھا۔ آمنہ سمجھ نہ سکی۔

"میں یونہی ادھر نہیں رکا ہوا۔ میں سارے حالات کو پرکھنا چاہتا تھا۔ منو معصوم ہے تم اسے اپنے مفاد میں استعمال کرنا چاہتے ہو اس کی معصومیت کا فائدہ اٹھانا چاہتے ہو مگر ایسا نہیں ہوگا۔ میں آمنہ سے سچی محبت کرتا ہوں۔ بے غرض اور مجھے آمنہ سے جڑے ان مادی، فوائد سے کوئی غرض نہیں۔ اس کا ساتھ، اس کی ہمراہی یہ ہی میرے لیے اعزاز ہوگا۔"

"پھر تو تم بازی لے گئے دوست......"

خالہ کی آواز پر آواز آرہی تھی چاہتے ہوئے بھی وہ عالی شان کی پوری بات سن نہ سکی اور باہر نکل گئی۔ الجھنوں میں اضافہ ہو گیا تھا۔ عالی شان اس سارے قصے میں کہاں سے آ گیا؟ کیا عالی نے خالہ سے اس طرح کوئی بات کی ہے؟ یا واقعی عالی اسے اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ دل اس بات کی تردید کر رہا تھا مگر کوئی بات ایسی تھی جو چبھ رہی تھی بری طرح سے۔ کچھ بھی واضح نہیں تھا۔ اسے صفی کا انتظار تھا اور رات کو وہ اس کے سر ہو گئی۔

"بھئی میں کچھ نہیں جانتا۔" اس نے جان چھڑانی چاہی مگر وہ ٹلی نہیں بالآخر صفی کو ہار ماننی پڑی۔

"ہاں اماں کی خواہش ہے کہ تم ہمیشہ ادھر۔ اسی گھر میں رہو تو اس کی ایک ہی صورت ہے یا تو میں تم سے لاحول ولا۔ بھئی میں تو تمہیں بہن سمجھتا ہوں مگر بھائی میاں وہ راضی ہیں۔" ایک دھماکہ سا ہوا اور اس کی ذات کے پرخچے اڑ گئے۔

"تو عالی وہ اسے واقعی اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہے۔" دل اعتبار کرنے کو تیار نہ تھا مگر حقیقت کچھ اور تھی۔

"عالی شان کیسے مانے؟" اسے اپنی آواز کسی گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔

"لو...... یہ تو خود بھائی میاں کی خواہش تھی۔ ویسے چھپے رستم نکلے مجھے کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔"

وہ اب شوخی سے جملے کس رہا تھا اور منو کے آس پاس تو اتنا شور تھا کہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔

☆☆☆

رات سونے کے لیے لیٹی تو دل خود بخود عالی اور عثمان کا موازنہ کرنے لگا۔ عالی شان ہر لحاظ سے شان دار تھا۔ دوسری طرف عثمان کے پلڑے میں محبت تھی۔ بقول عثمان کے۔ یہ گھر، اس کے مکین غرض ہر چیز ہی اسے عزیز تھی۔ دوسری طرف وہ گھر تھا جہاں اس نے کم مائیگی میں وقت گزارا تھا بقول عثمان کے اسے وہاں نہیں رہنا پڑے گا مگر خود عثمان اور اس سے جڑی تلخ یادیں......؟

اور پھر یہ گھر...... اس نے اردگرد نظر دوڑائی۔ فضا میں رات کا سکوت پھیلا ہوا تھا۔ موتیا اور رات کی رانی کی مہک ہر سو پھیل کر سانسوں کو مہکا رہی تھی۔ اس نے کنارے لگے جامن کے پیڑ کو دیکھا جس پر رنگ برنگی مٹی کے آب خورے اس نے صفی کی مدد سے لٹکائے تھے۔ چاند کی مدھم روشنی میں ہر چیز خواب ناک لگ رہی تھی۔ دن بھر کے حبس کے بعد شام کو

دھیمی دھیمی ہوا چلنی شروع ہوئی تھی جواب بادلوں کو گگن پر دوڑائے پھر رہی تھی۔ تارے بادلوں کی گدگدی سے لطف اندوز ہوتے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے۔

اس نے پہلو میں موجود خالہ کے خوابیدہ وجود کو محبت وعقیدت سے دیکھا۔ یہ بولتا سکوت اس کی رگ وپے میں عجیب سی سنسنی دوڑانے لگا تھا۔ نیند آنکھوں سے دور تھی۔ پیاس محسوس ہونے پر وہ پانی پینے اٹھی۔

پانی پی کر وہ سیڑھیوں پر آ بیٹھی۔ چلتی پون اسے کسی راز دار سہیلی کی طرح کان میں سرگوشیاں کرتی محسوس ہوئی۔ وہ آنکھیں موندے گھٹنوں پر سر جھکائے اس ماحول کا لطف لے رہی تھی کہ چھت پر کسی کے بولنے کی آواز سن کر وہ چونک اٹھی۔

اس وقت اوپر کون تھا۔ اس نے سوئے ہوئے دونوں نفوس پر ایک نظر ڈالی۔ صفی کی چارپائی خالی تھی۔ عالی شان تو آج کل دیر سے ہی گھر آتا تھا اور عثمان شاید شام سے ہی کہیں گیا ہوا تھا۔ تو پھر اس نے تجسس سے سوچا پھر دبے قدموں سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ آخری سیڑھی پر پہنچ کر اس نے محتاط انداز سے آگے ہو کر ذرا سا جھانکا۔ اندھیرے میں ایک چنگاری سی چمک رہی تھی کوئی اس کی جانب پشت کیے بازو منڈیر پر ٹکائے کھڑا تھا۔

"نہیں یار اتنے دنوں سے یہاں ٹکا ہوا ہوں۔ اب تو تنگ آ گیا ہوں۔ ہاں بڑے نخرے ہیں سالی ...... (گالی) کے کتنا یقین دلاؤں۔ قسمیں کھا کھا کر میرا پیٹ بھر گیا ہے مگر (گندی گالی دی) اس کا دل نہیں بھرا۔ ہاں ...... تو جانتا ہے میرے لیے یہ سب کتنا مشکل ہے۔ نہیں اب تو مقابل ایک اور امیدوار ہے۔ ٹکڑا سا۔ کزن ڈیئر نہیں۔"

وہ رکا۔

"ہاں ہے تو ہیرو جیسا شان دار...... پر کنگلا سالا نہیں یار۔ تیرا یار بھی کسی سے کم نہیں۔" (قہقہہ) ہاں بس ایک دفعہ یہ لاٹری میرے نام کھل جائے تو سمجھو عیش ہی عیش تیرے بھائی کے۔ (قہقہہ) گھر کے حالات تیرے سامنے ہیں۔ وہ کمینہ بھائی جان ابا کی دکان ڈبو کر خود سسرال والوں کی بغل میں گھس گیا۔ دوسرے کو آوارہ گردی سے فرصت نہیں۔ کھانے کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ ابے یار انہیں کیا پتا چلنا ہے۔ اماں اور میں نے وہ جھوٹی شان بیان کی ہے کہ مت پوچھ...... بس اب فکر نہیں۔ اس بڈھے نے بڑا مال جمع کیا ہوا ہے ایک دفعہ رشتہ ہو جائے پھر سب میرا ہاہاہا۔ نا بھئی پھر اس ملک میں کون بے وقوف رہتا ہے۔ ہاں ڈائریکٹ کینیڈا۔ سب کچھ اس بے وقوف منو کا ہی ہے پھر سمجھو تیرے بھائی کا (قہقہہ) چل باقی باتیں بعد میں ٹھیک......"

اور وہ خاموشی سے پلٹ گئی۔ واقعی فطرت نہیں بدلتی۔

☆☆☆

دوپہر کو ابا کا فون آیا وہ اس مہینے پاکستان آ رہے تھے مع اپنی بیوی کے یہ سن کر وہ پرسکون ہو گئی۔ ابا نے اس سے بہت دیر بات کی تھی اور آج کھل کر اپنی خواہش کا اظہار بھی کیا اور اس کی رائے اور رضا بھی جاننی چاہی۔

اس نے بہت واضح انداز میں ابا کو بتا دیا تھا کہ وہ کیا سوچتی ہے۔ صفی آج جلدی گھر آ گیا تھا اور اب کچن میں کھڑا اس کے ساتھ کام کرواتا مسلسل اس کا سر کھا رہا تھا۔

اسے بہت تجسس تھا کہ منو کی اپنے ابا سے اتنی دیر کیا باتیں ہوئیں۔

"بھئی تمہیں کیوں بتاؤں؟ تمہیں اس سے کیا۔ میرے ابا ہیں کیا میں ان سے باتیں نہیں کر سکتی۔" بڑے عرصے بعد وہ پرانے موڈ میں تھی کہ دل نے فیصلہ جو کر لیا تھا۔

"واہ صاحب۔ کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے۔" اس نے آہ بھری۔

"اچھا سنو۔ ایک زبردست خبر ہے۔ تمہارے لیے بہت خاص۔" اس نے سلاد کاٹتے سسپنس پھیلایا۔

"سناؤ۔" ایپرن سے ہاتھ پونچھنے کے بعد وہ

شامی کباب کا آمیزہ لے کر بیٹھ گئی۔

"ایسا روکھا پھیکا انداز۔ لڑکی! تم مجھے بہت مایوس کر رہی ہو۔"

"خیر آخر کو میں تمہارا سہیلا ہوں اور زیادہ دیر تمہیں تکلیف میں نہیں رکھ سکتا کہ تجسس سے تمہارے پیٹ میں مروڑ تو اٹھنے شروع ہو گئے ہوں گے۔ ہاں تو بات یہ ہے کہ بھائی صاحب کو شاندار سی نوکری ملنے والی ہے۔" اس خبر پر بھی وہ بے نیاز ہی رہی۔

"جانتی ہوں۔" یہ بھی ابا سے ہی اسے پتا چلا تھا کہ پچھلے دنوں گھر سے غیر حاضری اسی انٹرویو کے سلسلے میں تھی۔ وہ اسلام آباد ان کے ہیڈ آفس انٹرویو دینے گیا تھا۔ وہ چیخا۔

"کیا تمہیں کس نے بتایا؟ بھائی میاں نے؟"

فوراً مشکوک بھی ہوا اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ کام میں بری طرح مصروف نظر آ رہی تھی۔ اسی دوران عثمان بیگ اٹھائے چلا آیا۔

"میں جا رہا ہوں۔" اس کا انداز شکستہ تھا آمنہ نے سر اٹھا کر بڑے اعتماد سے اسے دیکھا۔

"خدا حافظ۔"

وہ چند لمحے اسے دیکھتا رہا پھر پلٹ گیا۔ صفی نے گہری نظروں سے دونوں کے انداز ملاحظہ کیے۔ کچھ تو ہوا تھا۔ یہ کایا پلٹ کیسی؟

اور وہ کباب بناتے اسے بتائے گی۔ صبح عثمان کو اپنا فیصلہ سنا کر اور اسے اس کے ارادوں کے بارے میں اسے آئینہ دکھا گئی تھی اس کا پر اعتماد انداز عثمان کو بتا گیا کہ اس کی دال یہاں نہیں گلنے والی، یہ منو وہ پرانی منو نہیں تھی جو ظلم سہہ کر سوائے بددعائیں دینے اور کوسنوں کے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

وہ بولنا سیکھ گئی تھی۔ صفی نے سراہا تو وہ کھل کر مسکرا دی۔

☆☆☆

بادل گھر گھر کے آ رہے تھے۔ ہوا بند تھی۔ موسم ویسا ہی تھا۔ بند اور گھٹن زدہ نجانے اس بار یہ حبس کب ختم ہو گا اور یہ بادل برسیں گے بھی یا یونہی چلے جائیں گے۔ ہونہہ بے فیض کہیں کے۔ خالہ صفی کے ساتھ کسی کی عیادت کو نکلی تھیں۔

اندر اٹھتے جوار بھاٹے نے اس سے ایک فیصلہ کروا لیا تھا۔ دل کی گھٹن، تیز بارش سے ہی ڈھل سکتی تھی اور اب بس بہت ہو گیا تھا۔ اس نے بات کرنے کی ٹھان لی۔ وہ جانتی تھی کہ ابا ہر مہینے اس کے لیے اچھی خاصی رقم بھیجا کرتے ہیں جو خالہ جا کر بینک میں اس کے اکاؤنٹ میں جمع کروا آتیں۔ اس کا رہنا، کھانا پینا، تعلیم غرض اس کی جملہ ضروریات خالہ خود پوری کیا کرتی ہیں۔ وہ صرف اسے بیٹی کہتی نہیں تھیں بلکہ سمجھتی بھی تھیں۔ اب تک اس کے اکاؤنٹ میں خاصی رقم جمع ہو چکی ہو گی۔ اس نے ابا سے مزید رقم منگوانے کا بھی سوچ لیا تھا۔

خالہ عصر کو نکلی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد عالی شان بھی آ گیا۔ گھر پر سوائے خالو کے کوئی نہیں تھا وہ حسب معمول ڈرائنگ روم میں کتابوں میں سر دیے بیٹھے تھے یہی موقع تھا اس سے بات کرنے کا۔

"مجھے آپ سے ضروری بات کرنی ہے۔" وہ بھی جوتے اتار رہا تھا جب وہ اس کے سر پر پہنچ گئی۔

"کیا ضروری بات ...... اس وقت میں بہت تھکا ہوا ہوں، بعد میں کر لینا۔" بے مروتی سے کہتے ہوئے وہ جوتے بیڈ کے نیچے گھسانے لگا۔

"مگر مجھے ابھی اور اسی وقت کرنی ہے چاہے آپ کا دل نہ چاہے چاہے آپ کے سر میں درد ہو۔"

یہ انداز ...... یہ انداز اس منو کے تو نہ تھے۔ ذرا اک لمحے بھر کو بغور دیکھا پھر بے نیازی سے سر جھٹکتے اٹھ کھڑا ہوا۔

"بدتمیزی اور زبردستی۔ یہ مجھے پسند نہیں۔ جلدی بولو۔" جیسے کہہ رہا ہو جلدی ٹلو۔ اسے غصہ آنا چاہیے تھا مگر اس وقت اس کے اندر اتنا حوصلہ، اتنا ٹھہراؤ نجانے کیسے آ گیا تھا۔

"آپ کو اپنا بزنس شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی نا۔ تو آپ مجھ سے لے لیں پیسے۔ بینک میں میرے پیسے پڑے ہیں اگر کمی بیشی

ہوتو میں ابا سے مزید منگوالوں گی۔"

"اے اے ٹھہرو۔ کیا میں تمہیں بے غیرت نظر آتا ہوں یا بھکاری۔" اس کا منہ غصے سے لال ہوا تھا۔

"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔ اتنے سالوں سے آپ کے گھر رہ رہی ہوں۔ کھاپی رہی ہوں۔ خالو، خالہ کے مجھ پر کئی احسانات ہیں ان کا بدلہ میں چاہ کر بھی نہیں اتار سکتی مگر اتنا ضرور چاہوں گی کہ میری ذات کو اپنے مفاد کے لیے استعمال نہ کیا جائے میں۔"

"رکو...... ٹھہرو تم۔" وہ ایک دم طیش میں آگے بڑھا۔ جھٹکے سے سامنے کھڑی منو کو کھینچ کر سامنے بٹھایا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟ تم یہاں رہنے کی قیمت دینا چاہتی ہو کیسے؟ مجھے؟ تو مجھے ہی کیوں۔ جاؤ جاکر انہیں یہ لغویات کہو۔ میرا دماغ خراب کرنے کی ضرورت نہیں۔"

اس کی لال انگارہ آنکھیں۔ تنے ہوئے نقوش اور ماتھے پر پھڑکتی رگ، ایک لمحے کو آمنہ ڈرسی گئی مگر جانتی تھی اگر آج نہ بولی تو زندگی بھر یہ خلش اس کو ستاتی رہے گی کہ اسے محبت کے بجائے مراعات کے بدلے قبول کیا گیا ہے۔ اپنی ذات کی یہ بے توقیری اسے کسی صورت گوارا نہیں تھی اس لیے جب بولی تو لہجہ متوازن مگر چبھتا ہوا تھا۔

"بات تو آپ ہی سے ہوگی کیونکہ اپنے فائدے کے لیے میری ذات کی نفی۔"

"کیا مفاد مفاد کی رٹ لگا رکھی ہے کون سے فائدے لینا چاہ رہا ہوں میں تم سے۔" اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ ضبط کرتے اس نے پوچھا۔

اسے عثمان اور عالی کی وہ آدھی ادھوری گفتگو یاد تھی۔ جو دل و ذہن پر بوجھ بنی ہوئی اسے بے چین کرتی تھی۔

"وہ مجھے علم ہے کہ خالہ کی خواہش ہے کہ میں اور آپ......" ایک پل کو اسے عجیب سا لگا اپنے منہ سے یہ سب کہنا اس کی اچانک چپ پر عالی شان نے گہرے انداز سے اسے دیکھا۔

"کیا میں اور تم......"

عالی شان کا گھمبیر انداز۔ منو کو گھبراہٹ ہونے لگی۔ ماتھے پر ابھرتی پسینے کی ننھی ننھی بوندیں اس کی تیز نگاہوں سے چھپ نہ سکیں۔ ایک گہرا سانس بھرتے اس نے اپنے اشتعال پر قابو کیا اور جب بولا تو لہجہ قدرے ہموار تھا۔

"تمہیں یہ کیوں لگا کہ میں تمہیں اپنے مفادات کے لیے استعمال کرنا چاہتا ہوں۔ میں مانتا ہوں پچھلے کچھ عرصے سے میں گرداب میں پھنسا ہوا ضرور ہوں مگر اتنا بے ضمیر اور بے غیرت نہیں کہ اپنے گھر میں رہنے والوں سے اس کا خراج وصول کروں۔ شاید کبھی میری کسی بات سے تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہو کہ مجھے تمہارے یہاں رہنے پر اعتراض ہے مگر یقین جانو، میں نے کبھی تمہیں ہم سے الگ نہیں سمجھا۔ دکھ تو مجھے ابا کی قربانیوں اور نیکیوں کے رائیگاں جانے کا تھا جو سب کے ساتھ وہ بلا امتیاز بنا کسی صلے کی توقع میں کرتے رہے ہیں۔ تم سے پہلے بھی اس گھر میں کئی لوگ آکر رہے اپنی غرض پوری کی اور چلتے بنے۔ میں نے دیکھا یہ سب تب شعور نہیں تھا مگر وقت کے ساتھ تلخ تجربات نے لوگوں کے اصل چہرے دکھائے تو تلخ ہوتا گیا مگر تمہارے لیے نہیں کبھی نہیں۔"

اس نے سر اٹھا کر سامنے بیٹھے عالی شان کو دیکھا۔ اس کی آنکھیں اس کا چہرہ سب گواہی دے رہے تھے اس کے سچے ہونے کی۔ حبس دھیرے دھیرے کم ہونے لگا تھا۔

"رہی بات تمہاری اور میری۔ تو تمہارے ابا نے ہی یہ اماں سے کہا تھا کہ ان کی خواہش ہے تم ہمیشہ یہاں ہی رہو۔ دوسرے معنوں میں وہ تمہیں اسی گھر میں مستقبل میں بھی ہنستا بستا دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ وقت مناسب نہ تھا اس بات کے لیے۔ اماں نے انہیں تسلی دے دی۔ مجھ سے بھی ماموں کی خواہش کا ذکر کر کے واضح الفاظ میں اپنی پسندیدگی بھی بتا دی تب مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا۔ یہ بات صرف ابا، اماں اور میں جانتا ہوں اور تمہیں بھی اس

لیے بتا رہا ہوں کہ یہ فیصلہ آج کل کا نہیں دو سال پہلے کا ہے۔"

اس انکشاف پر وہ منہ اٹھائے اسے دیکھتی رہ گئی یعنی کہ۔

"البتہ تمہیں کوئی اعتراض ہے تو بے شک یہ تمہارا حق ہے۔ تمہاری مرضی و خواہش کے بغیر ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تم تسلی رکھو اور رہی میری امداد کرنے کی بات تو آئندہ ایسی بات زبان پر لانا بھی مت۔ یہ میری غیرت پر تازیانہ ہے جو آج میں نے سہہ لیا مگر آئندہ ...... آئندہ بہت بری طرح پیش آؤں گا۔ سمجھیں؟ چلو بھاگو۔"

آخر میں اس کا سنگین لہجہ سن کر وہ فوراً اسے پیشتر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ دل میں موجود سارے ابہام، خدشے جیسے ہوا ہو گئے۔ سارا منظر روشن ہو گیا تھا۔ وہ باہر نکلی تو فضا میں گرد محسوس ہو رہی تھی آسمان کے مغربی کنارے سرخ رنگ میں نہائے ہوئے تھے۔ اتنے دنوں کے انتظار کے بعد لگتا تھا کہ آج ساون برس کے رہے گا۔

"یقیناً آندھی آنے والی ہے۔" گہری ہوتی ہوا اور اندھیرے کو دیکھتے اس نے سوچا اور جلدی جلدی صحن میں رکھی چیزیں کھینچ کر برآمدے میں لانے لگی۔ اٹھا پٹخ کی آوازوں پر عالی شان بھی باہر نکل آیا۔ وہ تخت پر بچھی چادر اور گاؤ تکیہ اٹھا رہی تھی کہ تخت برآمدے میں لا سکے اسے تخت کھسکاتے دیکھ کر وہ آگے بڑھ کر اس کی مدد کرنے لگا۔

اسی دوران مٹی سے بھرا ایک ریلا آیا تھا وہ جلدی سے بھاگ کر کمروں کی کھڑکیاں دروازے بند کرنے لگی۔ ہوا منہ زور تھی۔ گرد سے بھری۔ اس کی آنکھیں جلنے لگیں۔ کسی نے پیچھے سے آ کر کھڑکی کنڈی کر دی۔ آنکھیں مل کر اس نے مڑ کر دیکھا۔ عالی شان اسی بے نیازی کے ساتھ باقی کھڑکیاں دروازے بند کر رہا تھا۔ وہ تیزی سے باہر نکلی۔ پودوں کی نازک بیلیں ٹوٹ ٹوٹ کر زمین پر گر رہی تھیں۔

"اف یہ آندھی بھی نا آتی ہے تو ساتھ میں کیسی کیسی مصیبتیں ڈال رہی ہے۔"

اس نے جھنجھلا کر انہیں نرمی سے پکڑا اور باندھنے کی کوشش کرنے لگی مگر منہ زور ہوا کے سامنے اس کی کوشش ناکام ہو رہی تھی۔ وہ اڑتے آنچل کو سنبھالتی بیلیں باندھنے کے چکر میں ہلکان ہو رہی تھی کہ وہی محافظ خاموشی سے آگے بڑھا۔ اس کے دیوہیکل وجود کے سامنے ان آندھیوں کی کیا مجال تھی۔

منو کو یکایک تحفظ کا احساس ہوا۔ ایک خوب صورت احساس ہاں یہی مضبوط ہاتھ اسے چاہیے تھے۔ یہی قوی بازو اسے ہر مشکل سے نکال سکتے تھے۔ اس نے نہایت آسانی سے ان نازک بیلوں کو مضبوطی سے باندھا تھا آندھی ہلکی ہونے لگی تھی کیونکہ بادل آج دھرتی کی پیاس بجھانے کے حق میں تھے۔ آسمان سے گرتی بوندیں لگا تاروں جیسے ایک دھند کی چادر جیسی ہی تن گئی ہو۔ وہ ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"آپ کا شکریہ عالی شان! مجھے میری ذات کا مان بخشنے کے لیے۔"

دھیمے سے کہتی وہ مسکرائی عالی شان نے برستی بارش کے پس منظر میں کھڑی مسکراہٹ اور آنسوؤں کے سنگم لیے اس لڑکی کو بہت حیرت و محبت سے دیکھا جو کسی قوس قزح کا حصہ لگ رہی تھی رنگین، بلند اور شفاف۔

"یاد رکھو منو! تم میرے لیے بہت قیمتی ہو۔ پاکیزہ اور نایاب۔ کبھی خود کو بے مایہ مت سمجھنا۔"

اعتراف کا لمحہ تھا جو عالی شان جیسے مضبوط شخص کو بھی اپنی گرفت میں لے گیا۔ اس کی پلکیں جھک گئیں۔ خالو کی آواز آئی تھی۔ منو نے چپکے سے وہ اعتراف دل کے بند خزانے میں رکھ لیا۔ وہ قیمتی تھا بہت قیمتی۔

آمنہ اندر کی جانب بڑھی۔ اس کے پیچھے کھڑے بارش میں بھیگتے عالی شان نے بالوں سے پانی جھٹکا اور قدم بڑھائے۔ بارش بہت تیز تھی۔ ہر شے پر پڑی دھول اب دھل جائے گی۔ حبس ختم ہو گیا تھا اور موسم بدلنے والا تھا۔

☆☆

عقیلہ ہاشمی

مصنوعی پھوار

"شفق! لڑکی والے بس پہنچنے والے ہیں، تمہیں یاد ہے نا، ملنی مبشرہ بھابھی کی ہی کروانی ہے۔"

انصر نے ایک بار پھر سے آکر اس کو یاددہانی کرائی تو وہ غصے سے بولی۔

"ہاں بھئی ہاں۔ اچھی طرح یاد ہے مجھے۔"

بنی سنوری شفق کا اس وقت، موڈ خراب کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا لیکن شوہر کا ہر کام میں ٹانگ اڑانا اس کا اچھا بھلا موڈ آف کرنے کے لیے کافی تھا۔

"مجھے یاد بھی ہے اور سارے انتظامات بھی کر کے رکھے ہیں۔ آپ ایک بات کے پیچھے نہ پڑ جایا کریں۔ جائیں کوئی اور کام دیکھیں ملنی کی ٹینشن نہ لیں۔ وہ میں دیکھ لوں گی۔"

اس نے ٹیبل پر پڑے ملنی کے کپڑوں اور مٹھائی کے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اسے تسلی دی۔

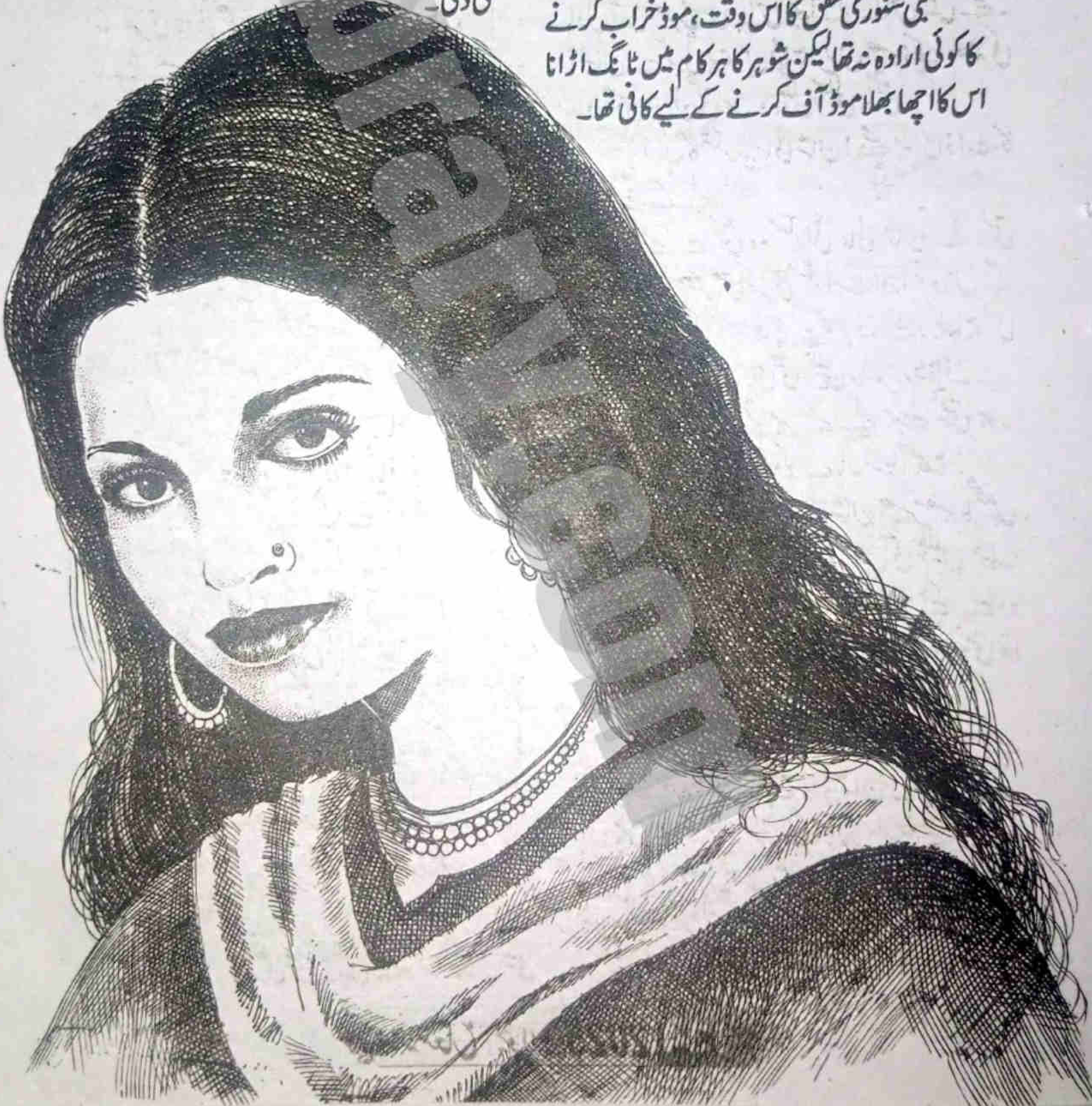

"ٹھیک ہے۔ مبشرہ بھابھی کو بھی ڈھونڈ کے رکھو ورنہ ٹائم پر انہیں پورے ہال میں ڈھونڈتی پھرو گی۔"

جاتے جاتے بھی وہ اسے مشورہ دینا نہ بھولا تھا۔

"اللہ میری توبہ، ایک تو یہ بندہ، عورتوں کے خالص معاملات میں بھی مداخلت سے باز نہیں آتا۔"

اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ جاتے ہوئے اسے گھور کے رہ گئی۔ ایسا کمپیوٹر جیسا دماغ پایا ہے اس بندے نے مجال ہے جو کوئی بات اس کے دماغ سے ڈیلیٹ ہوتی ہو سارا کچھ میمری کارڈ میں سیو کر کے رکھتا ہے۔ شوہر کے جاتے ہی اس نے سکھ کا سانس لیا۔

"دیکھا آپ نے خالہ کیسے یہ مجھے انگلیوں پر نچاتے ہیں۔ میری تو زندگی عذاب کر رکھی ہے، بیٹے کی شادی پر بھی کوئی کام اپنی مرضی سے کرنے کی اجازت نہیں۔ چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھائی کو فون ملا دیتے ہیں۔" انصر کے جاتے ہی اس نے قریب کھڑی عصمت خالہ سے گلہ کیا۔

"ہاں بیٹا، دیکھ رہی ہوں سب۔ دیکھ بھی رہی ہوں اور دکھی بھی ہو رہی ہوں۔"

خالہ نے انتہائی رنجیدہ لہجے میں بھانجی کا درد بانٹنے کی کوشش کی۔

"ظہور بھائی کا بیٹا ہے۔ بالکل باپ کی کاپی ہے جب جب اسے دیکھتی ہوں تو میری آنکھوں کے آگے ظہور بھائی کا جابر چہرہ آجاتا ہے کیسے انہوں نے عظمت کی زندگی اجیرن کر رکھی تھی۔ ساری زندگی تمہاری ساس بیچاری نے سکھ کا سانس نہ لیا۔ وہی حال اب تمہارا ہو رہا ہے۔"

عصمت خالہ رشتے میں انصر کی چچی بھی لگتی تھیں ان سے بہتر اس کے خاندان کو کون جانتا تھا۔ وہ جھٹ سے ماضی کے دریچوں سے مثال ڈھونڈ لائیں۔

"ثمرہ بتا رہی تھی یہ ملنی والے معاملے کو لے کر تمہارے گھر میں باقاعدہ جھگڑا چل نکلا تھا۔"

شفق کی ایک بہن عصمت خالہ کی بہو تھی اس لیے اس کے گھر کے کی ہر خبر سے خالہ پہلے سے آگاہ تھیں۔

"ہاں خالہ۔ آپ کو بتایا تو ہو گا ثمرہ نے انصر نے تو میری ناک۔"

وہ ابھی خالہ سے اور باتیں بھی شیئر کرتی لیکن کسی طرف سے اسے آواز آئی۔

"شفق! ادھر آؤ۔"

انصر کی زیادتی کا قصہ وہیں چھوڑ کر وہ بلانے والے کی طرف چل دی۔

"ہائے بے چاری میری بھانجی۔ کیسے ظالم بندے کے پلے باندھ دی بھائی صاحب نے۔ میں تو اس وقت بھی انہیں سمجھاتی ہی رہ گئی یہ نادانی نہ کرنا۔ ظہور بھائی کا بیٹا ہے۔ مجھ سے بہتر انہیں کوئی نہیں جانتا لیکن نہیں میری بہن گوری چمڑی پر فدا ہو گئی اور اب دیکھو بچی کا کیا حال کر رکھا ہے۔"

عصمت خالہ اب ساتھ بیٹھی کبریٰ باجی سے حال دل شیئر کرنے لگیں۔

"ثمرہ بتا رہی تھی پچھلے ایک مہینے سے انصر اور اس کے درمیان نئی کولڈ ٹینشن بنی رہی۔ اب ثمرہ سے تو اس کے گھر کے حالات پوشیدہ نہیں، دونوں بہنیں گھنٹوں کے حساب سے باتیں کرتی ہیں۔ کھانے پینے سے لے کر کپڑے لتے تک سب میری بہو کو پتا ہے اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔"

انصر کی ہٹ دھرمی کے ساتھ ساتھ، خالہ نے اپنی بہو کے متعلق بھی بتا دیا جس کے فون کا بیلنس بہن سے باتیں کرنے میں صرف ہوتا تھا۔

"انصر بضد ہے لڑکی والوں کے ریسپشن پر جو ملنی ہو گی وہ اس کی بھابھی مبشرہ کرے گی اور شفق کا کہنا ہے کہ ملنی اس کی بہن صائمہ کرے گی۔"

خالہ کی زبان قینچی کی طرح شفق کے گھر کے حالات شیئر کرتے چلی جا رہی تھی۔

"اور شفق کو منظور بھی کیوں کر ہو جس جیٹھانی کے ساتھ اس کا اتنا بیر چل رہا ہو بھلا وہ اسے کیسے اتنی

عزت دے سکتی ہے ابھی پچھلے سال مبشرہ نے بھی تو لڑکے کی شادی کی تھی اس نے تو تب اسے کسی کام میں نہ پوچھا تھا۔ وہ بھی غیروں کی طرح ہال میں گئی تھی وہیں سے کھانا کھا کر واپس چلی آئی تھی۔

☆☆☆

وہ ابھی کرسی پر آ کر بیٹھی تھیں کہ اپنے پیچھے بیٹھی خواتین کے درمیان، ہونے والی گفتگو میں اپنا نام سن کر ان کے کان کھڑے ہو گئے۔ یہ عصمت خالہ کی آواز تھی جو ان کے خلاف زہر اگل رہی تھیں۔

"بڑی ہی کوئی چتر اور چالاک عورت ہے یہ مبشرہ۔ دور بیٹھ کر بھی دیور کو قابو میں کر رکھا ہے۔ بے چاری شفق کو چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے بھی منت سماجت کرنی پڑتی ہے شوہر کی۔"

اپنے بارے میں عصمت خالہ کی لگائی بجھائی سن کر ان کا غصے سے برا حال ہو گیا۔ چہرہ تو پہلے ہی عارف کی باتوں سے سوجا ہوا تھا جو وہ پورے راستے سناتے ہوئے آئے تھے۔ اب رہی سہی کسر عصمت خالہ نے پوری کر دی تھی۔

"اے بہن ملنی نہ ہو گئی محاذ جنگ ہو گیا، یہ تو خالص عورتوں کے معمولات ہوتے ہیں بھلا انصر کیوں ٹانگ اڑا رہا ہے ان باتوں میں۔"

کبریٰ باجی کا بھی خیال تھا کہ ملنی کا معاملہ خالص شفق کو ہی نپٹانے کا حق ہے۔

"یہی تو کہتی رہی شفق۔ آپ ان باتوں میں نہ آئیں۔ میں بیٹے کی شادی کر رہی ہوں مجھے پتا ہے کس سے ملنی کرانی ہے۔ اس کا ارادہ اس بار اپنی بہن صائمہ کو ملنی پر کھڑا کرنے کا تھا لیکن نہیں انصر بھی اپنے نام کا ایک ہی پیدا کیا ہے ماں نے، ابھی بھی اسے پکا کر کے گیا ہے ملنی مبشرہ ہی کرے گی۔"

عصمت خالہ کا سنانے کا اسٹائل ایسا تھا جیسے خود انصر کا یہ فعل اس کا بھی سینہ چھلنی کر گیا ہو۔

مبشرہ جو ابھی تک اپنی پیٹھ پیچھے ہونے والی باتوں کو بڑے ضبط سے سن رہی تھیں اب ان کا ضبط جواب دے گیا تھا۔ ان کا دل چاہا اپنی سیٹ سے اٹھیں اور اٹھ کر پہلے تو عصمت خالہ کا منہ نوچ لیں پھر جا کر شفق کے کان کھولیں جس کی حمایت میں وہ بے لاگ بولے جا رہی تھیں۔

"ویسے ایک بات کہوں آپا! بنتی تو ملنی مبشرہ کی ہی ہے۔ بزرگوں کے بنائے رسم رواج کو فالو کرنا پڑتا ہے ملنی پر ہمیشہ اپنے ہی خاندان کی کوئی دیورانی یا جیٹھانی میں سے بڑی عورت کھڑی ہوتی ہے اور انصر کی بڑی بھابھی ہونے کے ناتے مبشرہ ہی ملنی کر سکتی ہے۔"

یہ ہوئی ناں بات مسرت خالہ کے جواب نے ان کا غصہ تھوڑا ٹھنڈا کیا۔

جس نے بڑے اچھے طریقے سے عصمت خالہ کو بزرگوں کی بنائی روایات سمجھانے کی کوشش کی۔

"اے چھوڑو یہ رسم ورواج۔ یہ ساری باتیں پرانی ہو چکی ہیں۔ آج کل تو وہی رشتہ دار ہے جو آپ کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑا ہوتا ہے مبشرہ اور عارف نے کبھی عید، شب قدر پر بھی آ کر ان کا حال نہیں پوچھا اور اب جب سمدھن کے سامنے بڑی عورت کھڑی کرنی ہو تو مبشرہ کھڑی ہو جائے کیوں؟"

خالہ نے جھٹ سے مسرت کے مشورے کو رد کر ڈالا۔

"کیسے رسم ورواج اور کیسا بزرگوں کا پاس، شفق ٹھیک کہہ رہی تھی۔ صائمہ اس کی جان سے عزیز بہن ہے۔ اس کے بچوں پر جان نچھاور کرتی ہے۔ اب شادی کو ہی دیکھ لو پورا لاکھ روپیہ سلامی دی ہے اس اکیلی نے۔ اور تم لوگوں نے دیکھا ہی ہوگا کیسے کل بارات میں اس کے بیٹے اور شوہر نے پیسہ لٹایا ہے کہاں تھے کل عارف اور مبشرہ؟"

خالہ کی بات بھی ٹھیک تھی آج کل زمانے کے معیار بدل چکے تھے پیسے والا آپ کا رشتے دار ہوتا ہے اور پیسے کی ہی سلامی ہوتی ہے۔ کبری باجی کے ساتھ مسرت بھی خاموش ہو گئی۔

عصمت، شفق کی خالہ تھیں، ان کی اطلاع بالکل مصدقہ تھی اس نیوز چینل کی طرح جس کی

خبروں پر آنکھیں بند کر کے یقین کر سکتے ہوں خیر یہ کوئی اتنی بڑی بات نہ تھی اگر شفق کے دل میں ان کے لیے لاوا بھرا تھا تو ان کے دل میں اس سے کہیں بڑا لاوا دہک رہا تھا۔ انہوں نے بھی ذرا ذرا سی بات پر عارف کے کان کھائے تھے۔

"دیکھا آپ کے بھائی نے ایک بار بھی فون کر کے ہمیں کسی کام میں نہیں پوچھا، کارڈ چھپ گئے دینے تک کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ایسا کہیں ہوتا ہے سگے بھائی کو کارڈ واٹس ایپ کیا جا رہا ہے۔"

انصر نے کارڈ واٹس ایپ کیا تو وہ شروع ہو گئی۔

"بھئی کیا ہو گیا مشرہ۔ ایک تو تم عورتیں چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنا لیتی ہو۔ کال کی تھی اس نے مجھے کہہ رہا تھا بھائی صاحب ٹائم نہیں مل رہا اتنے کام پڑے ہیں کرنے والے آپ بھابھی کو لے کر ڈھولکی پر آیئے گا۔"

عارف نے بھائی کی مجبوری بیان کی تو وہ جھٹ سے بول پڑیں۔

"کس خوشی میں۔ وہ کارڈ دینے نہیں آیا اور ہم ڈھولکی پر چل پڑیں۔ آپ مانیں یا نہ مانیں شفق چاہتی ہی نہیں کہ ہم اس کے گھر آئیں۔ یہاں تک آتے اس کے پاؤں میں مہندی لگی ہے تو ہم کیوں جائیں ڈھولکی پر۔ ڈھولکی پر جاتی ہے میری جوتی۔"

کارڈ کا تو بس بہانہ تھا جانے کو دل کس کا کر رہا تھا۔

"حد ہوتی ہے جیلسی کی بھی۔ تم دونوں کی جنگ میں پستے تو ہم دونوں بھائی ہیں ناں اور تمہیں پتا نہیں میں نے ہی اسے کہا تھا کارڈ نہ چھپوائے۔ ایک ہی کارڈ سب کو واٹس ایپ کر دے۔ بھئی اب کہاں زمانہ ہے کارڈ چھپوانے کا لوگ سارا کچھ موبائل پر ہی کر لیتے ہیں کارڈ اب کون پڑھتا ہے۔ شادی پر اور اتنے خرچے ہوتے ہیں کارڈ پر پیسے ضائع کرنے سے بہتر ہے کوئی اور کام کر لے"

عارف صاحب کی بات پر وہ اور زیادہ بھڑک اٹھیں۔

"واہ۔ واہ عارف صاحب خوب اچھا مشورہ دیا بھائی کو اپنے گھر میں تو یہ فارمولا نہیں اپنایا تھا۔ تب تو کارڈ بھی چھپوائے تھے اور خاندان بھر کے نام بھی لکھے تھے کارڈ میں۔ یاد ہے بھائی بہنوں کے سارے بچوں کے نام لکھوائے تھے آپ نے، بلکہ خود کارڈ چھاپنے والے بندے نے آپ سے کہا تھا بھائی صاحب کوئی نام رہ گیا ہو تو وہ بھی بتا دیں یہاں دو لیے کا نام کاٹ کر اس کا نام شامل کر دیتا ہوں۔ اس شفق کے چھوٹے والے کا نام مس ہو گیا تھا تو کتنا

خواتین ڈائجسٹ میں راحت جبیں کے قسط وار چھپنے والے خوب صورت ناولز

زرد موسم

تتلیاں پھول خوشبو

پاکستان میں کہیں بھی بذریعہ فون منگوائیں

منگوانے کا پتہ: مکتبہ عمران ڈائجسٹ 37، اردو بازار، کراچی

فون نمبر: 021-32216361

جھگڑا کھڑا کیا تھا انصر نے کچھ یاد ہے۔"
انہوں نے بھی شروع دن سے گھر میں مسئلہ کھڑا کر رکھا تھا۔ آج بھی گھر سے نکلتے نکلتے جان بوجھ کر دیر کروا دی تھی۔
"کہاں ہو بھئی ابھی تک تم پارلر سے واپس نہیں آئیں۔ یہاں ہم سب تیار کھڑے ہیں ایک بس تمہارا ویٹ ہو رہا ہے۔"
عارف نے کوئی چوتھی مرتبہ فون کیا تھا تو وہ پارلر سے واپس آئی تھیں۔
"آپ نے تو ایسے جلدی مچا رکھی ہے جیسے وہاں ریسیپشن پر ہمیں ہی کھڑا کیا جائے گا۔ کوئی نہیں پوچھنے والا۔ خود ہی آگے آگے ہوتے رہنا۔ شفق نے تو کل بھی ہمیں منہ نہیں لگایا تھا۔"
ان کا میک اپ تو سارا ہو گیا تھا بس پلکیں رہ گئی تھیں، عارف کا چوتھی مرتبہ فون آیا تو ڈر کے مارے آئی لیشیز ہاتھ میں پکڑ کر لے آئی تھیں۔ اب گاڑی میں پلکیں لگاتے ہوئے وہ عارف کو خوب سنا رہی تھیں۔
"بس کر دو مبشرہ۔ میرے مظلوم بھائی کا پیچھا چھوڑ دو وہ تمہیں ریسیپشن پر کھڑا بھی کر دے تو تم اور کوئی بات نکال لو گی۔ تمہاری فرمائشیں تو میں پوری نہ کر سکا وہ بے چارا کیا چیز ہے۔"
عارف نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے جھنجھلا کر ان سے منہ بند کرنے کی التجا کی۔
"آپ کا سارا زور نا ایک مبشرہ پر ہی چلتا ہے۔ ڈنڈا لے کر صبح سے میرے پیچھے پڑے ہیں۔ ڈھنگ سے میک اپ بھی نہیں کروانے دیا۔ فون پر فون کر کے کان کھا مارے۔ وہ پارلر والی لڑکی بھی مجھ رہی ہو گی میں کسی موبائل کمپنی میں ملازم ہوں جو مجھے اتنے فون آتے ہیں۔"
ان کا اور عارف کا برابر کا جوڑ تھا وہ ایک سناتے تو ان سے دو سن لیتے دونوں ایک دوسرے کو سناتے یہاں تک پہنچے تھے۔ آتے ہی مہمانوں سے کھچا کھچ بھرے ہال میں جگہ ڈھونڈتے ہوئے عصمت خالہ کی باتیں سن لیں۔
"بڑی ہی ڈھیٹ ہے یہ مبشرہ بھی دیور جوتی میں ڈال کر عزت دے گا تو بھی لے لے گی۔ میں اگر اس کی جگہ ہوتی تو کبھی بھی اس طرح کی ملنی نہ کرتی، شفق تو شوہر کی مجبوری میں اس سے ملنی کروائے گی ورنہ اس کا دل تو نہیں مان رہا۔"
عصمت خالہ کبریٰ اور مسرت کو ساری باتیں بتا کر اپنی کرسی سے اٹھ گئی تھیں لیکن ان کی باتیں مبشرہ کے کانوں سے ہوتی ہوئی سیدھی سینے میں جا چبھی تھیں۔ وہ یہ تو جانتی تھیں شفق انہیں پسند نہیں کرتی لیکن یہ نہیں جانتی تھیں اس کے دل میں ان کے لیے اتنی نفرت بھری ہو گی۔ خالہ جا چکی تھیں اور وہ سر جھکائے سوچ رہی تھیں اب انہیں کیا کرنا چاہیے کیا جوتی میں ڈال کر ملنے والی عزت لے لینی چاہیے یا پھر ان لوگوں کے سامنے، اپنی بچی کھچی عزت سمیٹ کر یہاں سے چلتا بننا چاہیے وہ ابھی سوچ میں ڈوبی تھیں کہ انصر انہیں ڈھونڈتا ہوا وہاں آ گیا۔
"ارے بھابھی آپ یہاں بیٹھی ہیں میں کب سے آپ کو ڈھونڈ رہا ہوں۔ چلیں لڑکی والے آ گئے ہیں۔ چلیں وہاں ریسیپشن پر چلیں۔"
ان کا چہرہ عصمت خالہ کی تلخ باتوں سے زرد پڑ گیا تھا۔ انہیں لگا انصر کی خوامخواہ کی دی عزت پر ان کا کوئی حق نہیں۔ وہ شفق کے منع کرنے کے باوجود زبردستی انہیں ملنی پر کھڑا کر دے گا، اس سے ان کی عزت افزائی تو نہ ہو گی الٹا ان لوگوں کے سامنے جگ ہنسائی ضرور ہو گی، جو ابھی کانوں میں ایک دوسرے کو ان دونوں دیورانی جیٹھانی کی باتیں سنا رہی تھیں۔
"اٹھیں نہ بھابھی۔ کیا سوچ رہی ہیں۔"
انہیں سوچ میں ڈوبا دیکھ کر انصر نے ان کا کندھا ہلایا۔ "ہاں۔ ہاں۔"
وہ جیسے گہری سوچ سے چونکتے ہوئے بولیں۔
"چلو۔"
سوچوں میں ڈوبتی ابھرتی وہ کرسی سے اٹھی تھیں کہ چکرا کر رہ گئیں۔
"ارے بھابھی، کیا ہوا؟"
ان کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا تھا یا پھر انہوں نے دیور کو یہ شو کیا تھا۔ وہ چکرا کر زمین پر گر گئیں۔

انصر کے ساتھ کئی اور لوگ انہیں اٹھانے آگے بڑھے۔
انصر کہہ رہا تھا "اٹھاؤ یار، انہیں جلدی سے برائیڈل روم میں لے جاؤ اور عارف بھائی کو اطلاع کرو۔"

اسے شاید ریسپشن پر بلایا جا رہا تھا لڑکی والے آچکے تھے، وہاں ملنی کے لیے شفق اپنے برابر میں صائمہ کو کھڑا کر چکی تھی۔

لوگ انہیں سہارہ دے کر برائیڈل روم میں لے آئے تھے پانی پی کر انہیں ہوش آگیا تھا۔ ان کے بیہوش ہونے کا سن کر عارف بھی وہاں آگئے۔

"مبشرہ بھابھی، اب کیسی طبیعت ہے آپ کی" تھوڑی دیر میں شفق پھولوں کے گل دیتے کے ساتھ چہکتی ہوئی برائیڈل روم میں داخل ہوئی تھی۔

"انصر نے مجھے بتایا کہ آپ بے ہوش ہوگئی ہیں تو میری تو جان ہی نکل گئی، میں تو فوراً دوڑ کر آپ کو دیکھنے آنے والی تھی لیکن وہ لڑکی والے آچکے تھے ان کا ریسپشن چھوڑ کر بھلا کیسے آسکتی تھی۔"

ہاتھ میں مصنوعی پھولوں کا گچھا پکڑے اس کا لہجہ بھی بناوٹی۔

"آپ بے ہوش ہوگئیں تو پھر مجھے صائمہ کو آپ کی جگہ پر کھڑا کرنا پڑا ورنہ آپ تو جانتی ہیں ملنی کرنے کا حق تو صرف آپ کا تھا۔"

اس کی باتوں سے انصر کے ساتھ ساتھ قریب کھڑے عارف بھی متاثر نظر آرہے تھے۔ آج وہ چپ چاپ سر جھکائے اس کی چکنی چپڑی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ ان باتوں کے پیچھے چھپی نفرت دیکھ چکی تھیں۔

"اس بار تو صائمہ نے ملنی کردی ہے اگلی بار فرحان کی شادی پر آپ نے ہی ملنی کرنی ہے۔"

انہیں مصنوعی پھول دیتے ہوئے اس نے شوہر اور جیٹھ کے سامنے چھوٹے بیٹے کی شادی پر انہیں مصنوعی عزت دینے کا لارا بھی دے ڈالا۔

وہ حیران تھیں کیسے اس نے منافقت کا سہارا لے کر شوہر اور جیٹھ پر اپنی دھاک بٹھالی تھی۔ ایسے ہی لوگ اس دنیا میں کامیاب ہوتے ہیں مبشرہ بیگم۔ انہوں نے جیسے خود کو آگاہ کیا آپ کی طرح کے پھٹے ڈھول خرچہ کر کے بھی دنیا سے عزت نہیں سمیٹ پاتے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ بھابھی ہماری بڑی ہیں۔ ساری ملنیاں یہی کریں گی ان شاء اللہ۔"

انصر خوش دلی سے بولا۔

"ویسے ہوا کیا تھا بھابھی کو؟"

شفق اس گھڑی کا قرض نہیں چکا پا رہی تھی جس میں وہ لڑکھڑا کر زمین پر گری تھیں۔ اس کا دل تو چاہتا تھا کاش زمین بوس ہی ہو جاتیں۔

"کچھ نہیں بس بیگم صاحبہ نے صبح سے کچھ کھایا پیا نہیں تھا۔ میں کہہ بھی رہا تھا ناشتہ کرلو لیکن۔ انہیں پارلر والی ہی نہیں چھوڑ رہی تھی اور اب دیکھا یہاں آکر بی پی لو ہوگیا۔ چکرا کر گر گئیں۔"

عارف کے بتانے کی دیر تھی۔ انصر بھی جھٹ سے بولا۔

"بھائی صاحب، پارلر کی بات نہ کیجیے گا ادھر بھی یہی حال ہے۔"

وہ بھی تین دنوں سے پارلر اور پارلر والیوں کے ظلم کا شکار ہو رہا تھا بھلا کہاں چپ رہ سکتا تھا۔

"چلیں۔ باہر اب کھانا شروع ہوگیا ہے چل کر سب کے ساتھ کھانے میں شامل ہوں۔"

انصر نے ان دونوں سے باہر چلنے کا کہا تو وہ ہاتھ میں پکڑے مصنوعی پھول صوفے پر رکھ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ وہ جانتی تھیں ان مصنوعی پھولوں کی اتنی ہی زندگی تھی جیسے شفق نے انہیں بنا خوشبو کے یہ پھول دیے تھے ایسے ہی ان کا رشتہ بھی بنا خوشبو کے ساری زندگی ساتھ چلنے والا تھا۔ شفق نے انہیں مصنوعی پھول دیے تھے تو انہوں نے بھی اپنی عزت بچانے کے لیے چکرا کر گرنے کا ڈرامہ کیا تھا۔ وہ اگر انہیں ملنی پر کھڑا کرنے کی روادار نہ تھی تو وہ بھی بھیک میں ملنے والی عزت لینے کی روادار نہ تھی۔ حساب برابر۔

اس کے دیے مصنوعی پھولوں کو وہیں چھوڑ کر اب وہ سب کے پیچھے پیچھے کھانا کھانے برائیڈل روم سے باہر چلی آئیں۔

☆☆

ماہنامہ کرن

جولائی 2025ء کے شمارے کی ایک جھلک

- مشہور ڈرامہ نگار "ثمینہ طاہر بٹ" کا "بہو سے ساس تک" کا سفر،
- اداکار "سید حارض الدین احمد" کہتے ہیں "میری بھی سنیے"،
- "تاش گھر" ایمل رضا کا سلسلے وار ناول،
- "ادھورے رشتے" ثنا صادق کا مکمل ناول،
- "تنوا کر دل و جاں ہم" اُمِ طیفور کا مکمل ناول،
- "نخلِ وفا" فرح بخاری کا ناولٹ،
- "قیس جنگل میں اکیلا ہے" منشا محسن علی کا ناولٹ،
- طیبہ ہاشمی، مونا نقوی اور صباحت رفیق چیمہ کے افسانے اور مستقل سلسلے،
- "کرن کتاب"

دلچسپ معلوماتی مضامین اور مزے دار کھانوں کی ترکیبوں کے ساتھ،

جولائی 2025ء کا شمارہ شائع ہوگیا

عیشہ حسین

دل اور سات سمندر

وہ سبز رنگ کا کام دار لباس پہنے منہ پھلائے بادلوں کی اوٹ میں چھپے چاند کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی اپنی کزن سے ایک چھوٹی سی بات پہ بحث ہوئی تھی اور اب وہ مہندی کا فنکشن چھوڑ چھاڑ کر باہر سیڑھیوں پہ بیٹھی تھی۔ تب ہی ایک ادھیڑ عمر کا آدمی اس کے قریب آ کر بیٹھا تھا اور جیب سے ایک سونے کا بریسلیٹ نکال کر اس کی جانب بڑھایا۔

"یہ کیا ہے؟" زنجیر تھام کر اسے دیکھتے ہوئے سترہ سالہ لڑکی نے ناراض لہجے میں پوچھا۔

"ایک بریسلیٹ بس!" اس کے چچا نے مسکرا کر کندھے اچکائے تھے "تمہیں اپنے اندر نرمی لے کر آنا چاہیے۔ زندگی مشکل ہے اور اس میں سمجھوتا کرنا پڑتا ہے۔ بہت سی چیزوں کو معاف کر کے آگے بڑھنا پڑتا ہے۔ انسانوں کی ایک غلطی پہ ان کو اپنی گڈ لسٹ سے نکال نہیں دیتے بلکہ ان کی اچھائی یاد کر کے ان کو مارجن دیتے ہیں۔ بات چیت سے مسئلے حل کر کے صلح کرنا ایک ایسا آرٹ ہے جو تمہیں بہت نفع دے گا صفیہ۔"

"میرے لیے معاف کرنا مشکل ہے۔" وہ بریسلیٹ کلائی میں پہنی ناک سکوڑ کر بولی تھی۔ بادلوں کی اوٹ سے نکلے پورے چاند کی روشنی میں سنہری دھات چمک رہی تھی۔

"لیکن یہ تمہاری زندگی آسان بنا دے گی۔" اس کے چچا اس کا سر تھپک کر اٹھ گئے تھے۔ اور اس نے سنہری دھات کی ٹھنڈک کو اپنی کلائی پر محسوس کیا تھا۔

"اور اگر کوئی ایسی غلطی ہو جسے معاف نہ کیا جا سکے تو؟" اس سوال پر جیسے ٹھنڈی ہوا، سیاہ رات اور پورے چاند نے رک کر دلچسپی سے اسے دیکھا تھا۔

"تو یہ دیکھنا غلطی کیوں اور کیسے کی گئی تھی۔ حالات کیا تھے۔" اس کے چچا پلٹ کے مسکرائے تھے اور ساتھ ہی کلائی کی جانب اشارہ کیا تھا جس میں وہ سنہری بریسلیٹ چمک رہا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی۔

صلح...... یہ صلح کی کہانی تھی۔

جس کا رنگ اگر زمرد جیسا سبز نہیں تو درختوں کے پتوں اور ہریالی جیسا سبز ضرور تھا کیونکہ اس میں تحفظ اور سکینت کی ٹھنڈک تھی۔

☆☆☆

ہمیں لگتا ہے کہ زندگی بدلنے میں وقت لگتا ہے لیکن حقیقتاً بدلاؤ بس ایک لمحے کا محتاج ہے۔ صفیہ اپنے کمرے کی بالکونی میں کھڑی تھی۔ اس نے آف وائٹ گھیر دار سلک کی کام دار فراک پہن رکھی تھی اور کندھے پہ میرون کام دار دوپٹا تھا۔ اس کے عقب میں دکھتا کمرا سفید اور سرخ گلابوں سے سجا تھا۔ پریشان چہرا لیے وہ اندھیرے میں کھڑی تھی۔ سوچوں میں گم وہ چونکی تھی جب سامنے پورچ میں سفید لینڈ کروزر رکی تھی۔ گاڑی کا دروازہ کھلا تھا اور آذر درانی باہر آیا تھا۔ نکاح کے بعد وہ اسے آج دیکھ رہی تھی۔ تین دن سے وہ یہاں موجود تھی لیکن اس آدمی کا کوئی اتا پتا نہیں تھا۔ اس کے تنے اعصاب ڈھیلے ہوئے تھے۔ اس پورے گھر میں بس وہی مانوس لگتا تھا۔

آذر بنگلے کے اندر آنے کے بجائے دائیں طرف بڑھا تھا۔

کچھ سوچ کر وہ باہر آئی۔ گھر میں چہل پہل جاری تھی۔ ملازم گھوم پھر رہے تھے۔ وہ گھر کے باقی افراد کے ساتھ کسی دعوت میں جانے کے لیے تیار تھی۔ داخلی دروازے سے باہر آکر وہ اسی جانب بڑھی تھی جہاں وہ گیا تھا۔ وہ ایسے بغیر بتائے کیسے اتنے دن کے لیے غائب ہوسکتا تھا؟

صفیہ کو غصہ آیا تھا۔ گھر میں پوچھنے پہ بھی کسی نے اسے تسلی بخش جواب نہیں دیا تھا۔ اور اس نے ایک بار بھی اس کی کال نہیں اٹھائی تھی۔ بنگلے کے ساتھ ایک انیکسی بنی تھی۔ ایک طرف سے سیڑھیاں اوپر کھلی چھت پہ جاتی تھیں۔ آخری سیڑھی پہ ملازم بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اس کو آتا دیکھ کر وہ جیسے حواس باختہ ہوا تھا۔

"بی بی! آپ؟"

"آذر اوپر گئے ہیں؟" اس نے سوالیہ نظروں سے سیڑھیوں کو دیکھا۔

"نن...... نن...... نہیں...... تو" وہ ہکلایا تھا۔

"میں نے خود دیکھا ہے۔ پیچھے ہٹو۔" وہ برہم ہوئی تھی۔ کچھ وہ پہلے ہی زندگی سمیت ہر چیز سے بیزار تھی اوپر سے اس نے کھڑکی سے کسی لڑکی کو اوپر جاتے دیکھا تھا۔

"صاحب نے منع کیا ہے بی بی۔" ملازم نے ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھی۔

"مطلب وہ اوپر ہی ہیں۔ ہٹو سامنے سے۔"

وہ فراک سنبھالتی آگے بڑھی اور ملازم کو بادل نخواستہ ہٹنا پڑا تھا۔ اوپر کھلی سی چھت تھی اور میز کرسیاں رکھی گئی تھیں اور عقب میں خالی جگہ تھی۔ وہ اس طرف آئی تھی۔ آگے بڑھتے ہوئے اس کے قدم جیسے زمین نے جکڑے تھے۔ سامنے منظر ایسا تھا کہ اسے لگا تھا آسمان ٹوٹ کر اس کے سر پہ آن گرا تھا۔

گیسٹ روم کی دیوار کے ساتھ آذر کھڑا تھا۔ اور اس کے ساتھ...... صفیہ کوشش کے باوجود بھی سانس اندر نہیں کھینچ سکی تھی۔ اس کے ساتھ علیشا کھڑی تھی۔ نیلی آنکھوں والی وہ لڑکی جو اس کے پاگل چھوٹے بھائی کی بیوی تھی۔ دونوں اتنے قریب کھڑے تھے کہ اس کو سمجھنے میں چند لمحے لگے تھے۔ آذر اس سے کوئی بات کرتا اس کے منہ پہ دھواں چھوڑ رہا تھا۔ اس کی نظروں کا ارتکاز محسوس کرکے دونوں نے بیک وقت پلٹ کر اس طرف دیکھا تھا۔ علیشا بوکھلا کر پیچھے ہونے لگی تھی اور آذر نے صفیہ کو گھورتے ہوئے اسے مزید قریب کیا تھا۔

"آذر......" علیشا نے اسے گھورا تھا۔ "وہ دیکھ رہی ہے۔"

وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ اس کا سانس اپنے چہرے پہ محسوس کررہی تھی۔

"تو......" آذر کی نظریں صفیہ پر گڑی تھیں۔ جو اسے پلکیں جھپکے بنا شاک سے دیکھے جارہی تھی۔ اس کے کندھے سے میرون بھاری دوپٹا سرک کر زمین پہ جا گرا تھا اور آنکھوں میں اکٹھی ہوتی نمی نے منظر کو دھندلا کردیا تھا۔

وہ الگ نہیں ہوئے تھے، صفیہ کو نظریں جھکانی پڑی تھیں۔ اس نے بڑی دقت سے سانس اندر کھینچا تھا۔

"بیوی ہے تمہاری۔" علیشا شرارتی انداز میں ہنستے ہوئے اس سے الگ ہوکر آگے بڑھی تھی۔

"اچھی لگ رہی ہو!" اس کے قریب سے گزرتے ہوئے علیشا نے سرگوشی کی تھی اور اس کے چہرے پہ آئی لٹ کو نرمی سے چھوا تھا۔ صفیہ نے پلکیں جھپکائیں اور نمی اب اسے اپنے گالوں پہ بہتی محسوس ہوئی تھی۔ سرخ کام دار لباس پہنے علیشا کسی دلہن کی طرح سج سج چلتی سیڑھیوں کی جانب بڑھی تھی۔ اس کے جانے کے بعد آذر نے سگریٹ زمین پر پھینکا اور جوتے سے مسل کر اس تک آیا تھا۔

"یہاں کیا کررہی ہو؟" وہ اس کے عین سامنے آکے رکا تھا۔

"یہ سب کیا تھا۔" صفیہ نے گیلی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"برے شوہر کو کیسے ڈیفائن کروگی؟" وہ بے تکلفی سے سوال پوچھ رہا تھا۔ اس نے جواباً بس شاک اور حیرت سے اس کا وجیہہ چہرہ دیکھا تھا۔ جو اپنی ساری خوب صورتی کھو چکا تھا۔

"براشوہر وہ ہوتا ہے جو ہاتھ اٹھائے؟ گھر سے باہر دوسری عورتوں سے غلط تعلقات رکھے؟ شراب وغیرہ پیے؟ رائٹ؟"

آذر نے اس کا گال تھپتھپایا کے تائیدی نظروں سے اسے دیکھا اور وہ جیسے ہوش میں آئی تھی۔ اس کا لمس پہ جسم ناگوار لگا تھا۔ وہ پہلے چند قدم پیچھے ہٹی اور جھک کر اس کے قدموں سے اپنا دوپٹا اٹھا پھیلا کر سراثبات میں ہلایا اور۔ ماؤف ہوتے دماغ سے غیر ارادی طور پر جہاں آذر نے چھوا تھا وہاں سے گال کو دوپٹے سے رگڑا تھا۔

"یہ ساری خامیاں ہیں میرے اندر صفیہ جمال، میں ایک برا مرد ہوں۔ میں یہ سب کچھ کرتا ہوں۔ اور تم بس ایک سیاسی بیوی ہو۔ نام کی بیوی، میں نے تمہیں پناہ دی ہے۔ گھر دیا ہے، کھانا دیا ہے پیسے دیے ہیں۔ بدلے میں تم میری زندگی میں کسی قسم کی کوئی مداخلت نہیں کروگی۔ تمہارا کام مجھے بس ایک نارمل فیملی کا کور اپ دینا ہے۔ گھر سنبھالنا اور میرے ساتھ فنکشنز پہ جا کر مسکرا کر تصویریں کھنچوانا ہے۔ اوکے؟"

وہ تمسخرانہ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جواب نہ ملنے پہ ایک نظر غلط اس پہ ڈال کر وہ آگے بڑھ گیا تھا۔ وہ وہیں بت بنی کھڑی رہی تھی۔ پیچھے ملازم سیڑھیوں پہ کھڑا وضاحتیں دے رہا تھا۔ رات کی سیاہی جیسے صفیہ کے نصیب میں گھل رہی تھی۔

"بس ایک کام تھا تمہارا جمعہ خان۔" آذر کی برہم آواز آئی تھی۔

"صاب جی! میں نے روکا تھا۔ پر بی بی جی نے بات ہی نہیں سنی۔" وہ منمنایا تھا۔

اسے برا بھلا کہتا آذر آگے بڑھ گیا تھا اور پھر خاموشی چھا گئی تھی۔ چچا کی موت سی ایس ایس میں تیسری بار ناکامی اور آذر سے شادی! اس پہ آسمان جیسے ٹکڑوں میں ٹوٹ کے گرا تھا۔ اس نے دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کیں اور سیڑھیوں کی جانب بڑھی۔ تیز تیز چلتی اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ صد شکر کہ کسی سے سامنا نہیں ہوا تھا۔ وہ شیشے کے سامنے کھڑا کف بند کر رہا تھا۔ اس نے صفیہ کی سرخ ہوتی آنکھیں دیکھی تھیں اور طے نہیں کر پایا تھا وہ غصے سے سرخ تھیں یا تکلیف سے۔ اندر کہیں صفیہ پہ اسے ترس آیا تھا لیکن پھر یاد آیا تھا وہ فاروق درانی کا انتخاب تھی۔ وہ یہ ڈیزرو کرتی تھی۔

"چلیں؟" آذر نے ابرو اچکائے اور صفیہ کو اس کی سب سے بڑی خوبی کا اندازہ ہوا تھا۔ وہ توہین کرنے میں ماہر تھا۔

"سیاسی بیوی...... مائی فٹ!" آئینے میں اسے دیکھتے وہ رندھے گلے کے ساتھ غصے سے پھنکاری تھی اور زیورات نوچ کر اتار رہے تھے۔ آذر نے آنکھوں میں استہزا لیے اسے دیکھا اور مونچھوں سے جھلکتے اس کے ہونٹوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ پھیلی تھی۔

"جیسی تمہاری مرضی!" وہ قریب سے گزر کر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اس کے جاتے ہی صفیہ نے بالوں کو گول مول جوڑے میں باندھا اور بیڈ کے نیچے سے سوٹ کیس باہر نکالا۔ پھر الماری سے کپڑے نکال کر اس میں پھینکتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ بے آواز روئے جا رہی تھی۔ اسے بس صبح ہونے کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆

صفیہ جمال نے ناپ تول کر دیکھا تھا سب سے بھاری وزن اپنے کہے الفاظ کا ہوتا تھا۔

وہ ایک درمیانے درجے کے گھر کے لاؤنج میں سر جھکائے بیٹھی تھی۔ قریب ہی سوٹ کیس رکھا تھا اور خاموش لاؤنج میں اس کی چچی کی آواز گونج رہی تھی۔

"تم اسے نہیں چھوڑ سکتیں اور نہ ہی تم ایسے یہاں رہ سکتی ہو۔" اس کی ساری روداد سن کر انہوں نے بس اتنا کہا تھا۔

"جس طرح آئی ہو، ایسے ہی واپس چلی جاؤ صفیہ۔" وہ سرد لہجے میں بولی تھیں۔

"پر...... چچی...... میں...... اتنی ذلت کے ساتھ کیسے؟" اس نے روئی روئی آنکھوں سے ان کو دیکھتے ہوئے لب کاٹے تھے۔

"زندگی ذلت ہی ہے صفیہ۔" وہ زچ ہو کر بولی تھیں۔

"میں نے اور تمہارے چچا نے تمہیں اپنی بیٹی کی طرح پالا ہے۔ کبھی کوئی فرق نہیں کیا۔ اپنی بیٹی سے پہلے تمہاری شادی کی۔ لیکن اب بس...... میں اور کیا کروں تمہارے لیے؟ ایک بات لکھ کر رکھ لو۔ تمہارے چچا مر چکے ہیں۔ وہ پرانی زندگی اب ختم ہو چکی ہے۔ میرے ہاتھ دیکھو۔"

انہوں نے ہاتھ جوڑ کر اسے دکھائے تھے اور وہ بے بسی سے ان کو دیکھے گئی تھی۔

"مجھے نیہا کی شادی کرنی ہے۔ تم طلاق لے کے گھر بیٹھو گی تو اس کی شادی متاثر ہو گی۔ اور چلو بالفرض تم نے طلاق لے لی۔ آگے کیا کرو گی؟ میں نیہا کے ساتھ رہوں گی۔ تم یہاں اکیلے کیسے رہو گی؟ حالات دیکھے ہیں؟ اور میں اب تمہاری ذمہ داری نہیں اٹھا سکتی۔ سکت نہیں ہے اب مجھ میں۔" وہ روہانسی ہوئی تھیں۔

"وہ جیسا بھی ہے۔ عزت، روٹی اور چھت تو دے رہا ہے نا۔ اس کا باپ تمہارے باپ اور چچا کا دور کا رشتہ دار اور دوست تھا۔ وہ تمہارے ساتھ کچھ الٹا سیدھا نہیں کریں گے۔ اور ہو سکتا ہے وہ بدل جائے۔" اس کی چچی کا لہجہ اب سمجھانے والا ہو گیا تھا۔

"فطرت نہیں بدلتی۔" اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"وہ ایک برا مرد معاشرے کے باقی برے مردوں سے بچالے گا صفیہ! تو تم اب فیصلہ کر لو۔ اس ایک برے مرد کے ساتھ رہنا ہے یا معاشرے کے سارے برے مردوں کو برداشت کرنا ہے۔ کیونکہ حقیقت یہی ہے۔" وہ سخت لہجے میں بولی تھیں۔

"مما...... آپ......" نیہا نے صفیہ کا اترا چہرہ دیکھ کر مداخلت کی کوشش کرنا چاہی تھی لیکن اس کی ماں نے ہاتھ اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا اور جواب طلب نظروں سے صفیہ کو دیکھا تھا۔

سامنے صوفے پہ بیٹھی صفیہ نے ایک نظر نیہا کو دیکھا پھر اس کے عقب میں دیوار پہ لگی فیملی فوٹو کو جس میں وہ چاروں تھے۔ چچا اور چچی صوفے پر بیٹھے تھے اور ان کے قدموں میں بیٹھی ہوئی نیہا اور صفیہ تھیں، اس نے فیصلہ کر لیا تھا وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور واش روم میں آئی۔ نل کھول کر اس نے موبائل تھامے ہاتھ کو سنگ مرمر کے سنک پر رکھا تھا اور دوسرا ہاتھ منہ پہ رکھ کر اپنے رونے کی آواز کو دبایا تھا۔ وہ ہچکیوں کے ساتھ رو رہی تھی۔

آتے ہوئے رئیسہ بھابھی نے اسے روکا تھا وہ آذر کے کزن کی بیوی تھیں۔ ان کے الفاظ پانی کی دھار کے ساتھ فضا میں گونجتے تھے۔

"تم اپنے آپ کو مزید ہلکا کرو گی صفیہ۔ اس سب کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔" آنسو مزید روانی سے بہے تھے۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ عورتیں کیسے ایسے چیپ مردوں کے ساتھ رہ لیتی ہیں۔ چھوڑ کیوں نہیں دیتی ہیں ان کو۔ جو دھوکا دے اس کو دفع کرو اور آگے کا سوچو۔ میں تو کبھی ایسے مرد کو برداشت نہیں کروں گی۔ لعنت بھیجوں گی اور آگے کا سوچوں گی۔"

کئی سال پہلے کہے اس کے اپنے الفاظ ہنٹر کی طرح لگے تھے۔ موبائل سامنے شیلف پہ رکھ کر اس نے منہ پہ پانی کے چھینٹے مارے اور نل بند کیا تھا۔ پھر موبائل اٹھا کر آذر کا نمبر ملایا تھا۔

کال ملا کر اس نے آئینے میں اپنے پژمردہ چہرے کو دیکھا بیل جا رہی تھی۔ عزت نفس، وقار، خواب، خواہشیں، امیدیں اور بڑے بڑے دعوے اسی نل کے پانی کے ساتھ گٹر میں بہہ گئے تھے۔ کال نہیں اٹھائی گئی تھی۔ اس نے موبائل کان سے ہٹایا اور پھر سے کال ملائی تھی۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔ تیسری بیل پہ بھی جب کال نہیں اٹھائی گئی تو اس نے آذر کے سکریٹری کا نمبر نکال کر کال ملائی تھی۔ دوسری بیل پہ کال اٹھالی گئی تھی۔

"آذر کے سکریٹری بات کر رہے ہیں۔" ہیلو کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"جی آپ کون؟" حیرت سے پوچھا گیا تھا۔

"میں آذر کی بیوی ہوں۔ ان سے بات ہو سکتی

ہے؟'' وہ بھیگے لہجے میں بولی تھی۔

''ایک منٹ......'' دوسری طرف چند لمحے کی خاموشی کے بعد کہا گیا تھا۔

آذر اپنے آفس میں کسی میٹنگ میں مصروف تھا۔ سامنے میز پہ پڑے اس کے موبائل پہ کال آرہی تھی۔ تین دن تک جب وہ غائب رہا تھا تب بھی اسے اس نمبر سے کال آئی تھی اور پتا چلا تھا یہ صفیہ کا نمبر تھا۔

اس کے موبائل پر پھر سے کال آئی تھی۔ سب نے ایک ساتھ موبائل کی جلتی بجھتی اسکرین کو دیکھا۔ آذر نے موبائل الٹ کے رکھ دیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد میٹنگ ختم ہوئی تھی اور سکریٹری دستک دے کے اندر آیا تھا۔

''سر......'' سکریٹری نے متفکر نظروں سے آذر کو دیکھا۔ ''ارجنٹ ہے۔ دو منٹ بات سن سکتے ہیں؟''

''کیا ہے؟'' آذر نے سر کے خم سے اسے اندر آنے کی اجازت دی تھی۔

''بھابھی کی کال ہے۔ وہ شاید رو رہی تھیں اور آپ سے بات کرنے کا کہہ رہی تھیں۔'' سب لوگوں کے باہر نکلتے ہی اس کے سکریٹری نے بولنا شروع کیا تھا اور فون اس کی جانب بڑھایا تھا۔

''پوچھو، کیا کام ہے؟'' آذر نے دراز سے سگریٹ نکالا۔

''میں......؟'' وہ حیران ہوا تھا سگریٹ منہ میں دبائے اسے لائٹر سے جلاتے آذر نے اثبات سر ہلایا تھا۔

''بھابھی! سر پوچھ رہے ہیں کیا کام ہے۔ وہ دراصل بزی ہیں۔'' سکریٹری کی صفائی پیش کرتی مدھم آواز گونجی تھی۔ دوسری جانب صفیہ ان کی گفتگو کسی حد تک سن چکی تھی۔

''مجھے گھر واپس آنا ہے۔ آذر سے کہو، ڈرائیور بھجوا دیں۔'' وہ آنکھیں بند کر کے ضبط سے بولی تھی۔ یہ اس کی پوری زندگی میں بولے گئے سب سے بھاری الفاظ تھے۔

''بھابھی کہہ رہی ہیں کہ واپس آنا ہے ڈرائیور بھجوا دیں۔'' سکریٹری نے ماؤتھ پیس کان سے لگائے کہا تھا۔

''پوچھو، گئی کیسے تھیں؟ جیسے گئی تھیں ویسے واپس بھی آجائیں۔'' آذر نے سگریٹ کا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا اور محظوظ سے لہجے میں بولا تھا۔

(سیاسی بیوی...... مائی فٹ) اس کے کانوں میں صفیہ کے الفاظ گونجے تھے۔

سکریٹری نے متذبذب نظروں سے اسے دیکھا اس کی سمجھ میں نہیں آیا تھا، کیا کہے اور کیسے کہے؟ تب ہی کان سے لگے فون میں صفیہ کی آواز گونجی تھی۔

''اپنے سر سے کہو۔ میں ٹیکسی سے یہاں آئی تھی۔ واپس ٹیکسی سے ان کے محل میں جاؤں گی تو ان کے اونچے شملے پہ داغ لگ جائے گا۔ ورنہ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔'' دوسری جانب وہ اس کی بات سن کر اونچی آواز میں بولی تھی۔

آذر کے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی تھی۔ رسی جل گئی تھی پر بل نہیں گئے تھے۔ سکریٹری نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔ اتنا تو وہ جان چکا تھا کہ وہ صفیہ کی آواز سن چکا تھا۔ اس کی آواز اسپیکر سے باہر آرہی تھی اور سکریٹری بالکل اس کی میز کے قریب کھڑا تھا۔

''کہو چار بجے تک آجائے گا ڈرائیور۔'' آذر نے سگریٹ ایش ٹرے میں جھاڑا اور سیدھا ہو بیٹھا تھا۔

''بھابھی! چار بجے تک پک کر لے گا ڈرائیور۔'' سکریٹری کے کہنے کی دیر تھی کہ دوسری جانب کھٹاک سے کال کاٹ دی گئی تھی۔

''سر! ڈرائیور کو کال کر کے چار بجے کا کہوں؟'' سامنے کھڑے نوجوان نے بے اختیار سوال کیا تھا۔ پتا نہیں کیوں اسے آذر کا رویہ برا لگا تھا اور اس لڑکی پہ ترس آیا تھا۔

''اونہوں!'' آذر نے فائل کھولتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ ''میں خود چھ بجے تک پک کر لوں گا۔''

اس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر وہ خاموش ہو گیا اور باہر نکل گیا تھا۔ یہ آذر درانی کا پرسنل میٹر تھا۔

''اکڑ توڑنے کے لیے انتظار کروانا ضروری ہے۔'' آذر نے سوچا تھا۔ وہ لڑکی فاروق درانی کا انتخاب

تھی۔ فاروق درانی...... جس نے اس کی ماں کو بہت اذیتیں دی تھیں۔ پر کیا صرف فاروق درانی نے اسے اذیتیں دی تھی؟ اس کے اندر کسی نے سوال کیا تھا۔

☆☆☆

اس کی روانی سے بہتی زندگی درہم برہم ہوئی تھی۔ جب ہارٹ اٹیک سے اچانک اس کے چچا وفات پا گئے تھے۔ اس کے بعد فاروق درانی نے رشتہ مانگا تھا اور چچی نے ہاں کہہ دی تھی۔ صفیہ ستائیس سال کی تھی اور آذر تقریباً چالیس سال کا تھا۔ آج کے دن اپنی عزت نفس اور وقار اس کے قدموں میں ڈالے وہ اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھی تھی۔ وہ لوگ فنکشن سے باقی سب کی نسبت جلدی واپس آ گئے تھے۔ گاڑی پورچ میں رکی اور ایک نوکر بھاگتا ہوا آیا تھا۔

"صاحب جی! وہ عثمان جی کو پھر سے دورہ پڑا ہے۔ اور ان کو چوٹ بھی لگی ہے۔"

آذر جواب دیے بغیر باہر نکلا اور بنگلے کے ایک طرف بنی انیکسی کی جانب بڑھا تھا۔ صفیہ نے فرنٹ سیٹ کا دروازہ بند کیا چند لمحے رک کر سوچا اور پھر اسی طرف آئی تھی۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ عثمان نوکر سے ہاتھا پائی کر رہا تھا۔ وہ اس بے لگام عورت کے شوہر کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔

"عثمان......" آذر نے نرمی سے اسے پکارا۔ اس کی آواز سن کر عثمان رکا تھا۔

"ہاتھ مت لگاؤ مجھے۔" وہ غرایا تھا۔ صفیہ نے وہ پچیس چھبیس سال کا نوجوان، بڑھی ہوئی داڑھی، سرخ آنکھیں اور آذر جیسے نقوش اس پہ سر سے خون نکل رہا تھا جو لکیر کی صورت کن پٹی سے بہتا گردن تک آیا ہوا تھا۔

"پیچھے ہٹو!" آذر نے نوکر کو جانے کا اشارہ کیا اور اس کے نزدیک آیا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟" وہ نرمی سے اسے کندھوں سے پکڑ کر بٹھاتے ہوئے بولا تھا۔

"ان سے کہیں، مجھے ہاتھ نہ لگائیں۔" وہ ناراض لہجے میں ہانپتے ہوئے بولا۔

"اچھا بھئی...... نہیں لگائیں گے۔" آذر نے ایک طرف رکھا رومال اٹھایا تھا۔ دروازے میں کھڑی صفیہ کو یقین نہیں آیا تھا۔ یہ وہی بداخلاق انسان تھا جس کے ساتھ وہ اتنے دنوں سے رہ رہی تھی۔

"چوٹ کیسے لگی؟" رومال اس کے ماتھے پہ رکھے آذر اس کے ساتھ بیٹھا اور پوچھا۔ اس سوال پہ اس کی آنکھوں کے بدلتے تاثرات صفیہ نے واضح محسوس کیے تھے۔ وہ چپ رہا تھا۔

"ادھر آؤ صفیہ! یہ رومال دبا کر رکھو۔ میں فرسٹ ایڈ کٹ لے کے آیا۔" آذر نے دروازے میں کھڑی صفیہ کو بلایا تھا۔

"میں......؟" اس کی آنکھیں حیرت سے پھیلی تھیں۔

"تمہارے علاوہ یہاں کوئی اور ہے؟" وہ ابرو اچکا کر بولا تھا۔

"کون ہو تم؟" اس کے جانے کے بعد عثمان نے سنبھلے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا۔

"آذر کی بیوی۔" اس نے تھوک نگلا اور ڈرتے ڈرتے بولی تھی۔

"پیچھے ہٹو!" وہ تحکم سے بولا تھا اور صفیہ چپ چاپ پیچھے ہٹ گئی تھی۔

اس نے خاموشی سے ارد گرد دیکھا ایک طرف دیوار پہ اس کی شادی کی تصویر لگی تھی، ساتھ ہی فریم ہوئی ڈگریز بھی ٹنگی تھیں وہ اور علیشا مسکرا رہے تھے۔ صفیہ نے ان تصویروں کو دیکھا تھا۔

"یہ تم ہو؟ اور یہ تمہاری ڈگریز ہیں؟" اس کی آواز میں بے یقینی تھی۔

"نہیں ڈگریز خرید کے لگائی ہیں اور ساتھ یہ میرا بھوت ہے۔" وہ تپے ہوئے لہجے میں بولا تھا۔

"اس میں غصہ کرنے والی کیا بات ہے؟" صفیہ نے پلٹ کر ایک نظر غلط اس پہ ڈالی تھی۔

"تم وہی ہو نا، جو سی ایس ایس ایگزام میں تین دفعہ فیل ہوئی ہو؟" وہ بہتے خون سے بے پروا اس کی پشت کو گھورتے ہوئے بولا۔ سیاہ ستاروں سے بھری

ساڑھی اور کمر پر گرے گھرے بھورے لمبے بال......
اسے وہ پہلی نظر میں ہی اچھی لگی تھی۔

"تمہیں کیسے پتا؟" صفیہ نے سینے پہ ہاتھ باندھے ذرا سا رخ موڑ کے اسے دیکھا۔ سیاہ ساڑھی پہ گردن سے چپکا سبز نگینے جڑا سنہری سیٹ اس کی خوبصورتی میں اضافہ کر رہا تھا۔

"ملازم بات کر رہے تھے۔" وہ کندھے اچکا کر بولا۔

"پاگل لگتے نہیں ہو ویسے!" صفیہ نے سر سے پیر تک ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"ہوں بھی نہیں۔" وہ دو بدو بولا تھا۔

"زخم کو کور کرو، تمہارے بھائی نے دیکھا تو مجھ پہ غصہ ہوگا۔" عثمان نے ایک نظر اسے دیکھا وہ ضدی تھا، بات نہیں مانتا تھا۔ لیکن اس نے جھک کر رومال اٹھا کر زخم پہ رکھ لیا تھا۔ اتنے میں آذر فرسٹ ایڈ باکس لیے چلا آیا۔

"ہاتھ مت لگائیں مجھے۔" آذر جو اس کے زخم کی طرف ہاتھ بڑھا رہا تھا، اس کی آواز پہ رکا تھا۔ قریب کھڑی صفیہ دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

"تو زخم کی ڈریسنگ کیسے کروں؟" آذر نے غصہ کیے بغیر اس کی آنکھوں میں دیکھتے تکان سے سوال کیا تھا۔

"اس سے کہیں، یہ لگا دے۔" عثمان ایسے ہی ڈھٹائی سے بولا تھا اور صفیہ کے قدم تھمے تھے۔

"صفیہ......" آذر اسے پکار کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ہاتھ سے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔ تھوک نگل کر وہ آکر اس کے سامنے بیٹھی اور فرسٹ ایڈ باکس کھولا۔ آذر قریب ہی سینے پہ ہاتھ باندھے کھڑا ہو گیا تھا۔

"پیاری لگ رہی ہو۔" وہ روئی پہ دوا لگائے اس کا زخم صاف کر رہی تھی جب اس نے انگریزی میں کہا تھا۔ صفیہ نے قریب کھڑے آذر کو دیکھا اور آذر نے چونک کر عثمان کو دیکھا تھا۔

"تھینکس!" بال ایک ہاتھ سے کان کے پیچھے اڑس کر اس نے دوا اٹھائی تھی۔ کلائی میں پہنی سونے کی چوڑیاں کھنک رہی تھیں۔

"سی ایس ایس میں فیل کیوں ہوئی تھیں؟" وہ آذر کو ایسے نظر انداز کر رہا تھا جیسے وہ وہاں موجود ہی نہیں تھا۔

"پتا ہوتا تو پاس نہ ہو جاتی۔" صفیہ انہماک سے زخم پہ دوا لگا رہی تھی۔

"اسی لیے تو پوچھ رہا ہوں۔ پاس ہونے کا پریشر تھا یا فیل ہونے کا ڈر؟" وہ مسلسل اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔ پاس کھڑے آذر نے حیرانی سے اسے دیکھا تھا۔ اس نے ایک عرصے بعد ایسے بات کی تھی۔

"پاس ہونے کا پریشر!" صفیہ کھڑی ہوئی تھی اور پھر سوچ کے بولی۔

"گڈ!" عثمان مسکرایا تھا۔ آذر کو پتا نہیں کیوں ناگوار گزر رہا تھا۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا تھا۔ صفیہ خاموش رہی اور تب ہی نک سک سے تیار علیشا اندر آئی تھی۔

"ارے...... کیا ہوا؟" اس نے حیران ہونے کی پوری اداکاری کی تھی۔

"چوٹ لگ گئی تھی۔" آذر نے جواب دیا تھا۔ عثمان اور صفیہ کے چہرے پہ ایک ساتھ ناپسندیدگی پھیلی تھی۔

"ڈاکٹر کو بلایا؟" وہ متفکر سی آگے آئی تھی اور ایک چبھتی نظر عثمان کے سامنے بیٹھی صفیہ پر ڈال کر سوالیہ نظروں سے آذر کو دیکھا تھا۔ آذر کی طرح وہ بھی حیران تھی۔ عثمان کہاں کسی کو اتنے قریب آنے دیتا تھا۔

"زیادہ چوٹ نہیں آئی۔ صفیہ دوا لگا رہی ہے۔" آذر نے برے موڈ میں جواب دیا تھا۔

"یہاں کیوں آئی ہو؟" علیشا کو دیکھتے ہی عثمان کا موڈ ایک لمحے میں بدلا تھا۔

"میں...... وہ......" اہانت سے علیشا کا سپید چہرہ سرخ ہوا تھا۔ عثمان پہلی بار اس کے ساتھ ایسا نہیں کر رہا تھا لیکن صفیہ کے سامنے ایسی بے عزتی۔

"دفع ہو جاؤ یہاں سے۔" عثمان نے چٹکی بجا کر اسے باہر جانے کا اشارہ کرتے دھاڑ کر کہا۔

اونچی آواز سے صفیہ لرز گئی تھی اور چیزیں سمیٹنے لگی تھی۔

"تم یہاں ہی رہو گی ناں؟" اسے دیکھ کر عثمان نے لہجہ ایک دم سے بدل کر نرمی سے پوچھا اور تینوں ایک ساتھ ساکت ہوئے تھے۔

صفیہ نے باکس بند کر کے اسے دیکھا اور مسکرا کر سر ہلایا دیا تھا۔

"ڈریسنگ چینج کرنے آؤ گی؟" وہ پر اعتماد مگر نرم لہجے میں بولا۔ نظریں اس کے چہرے پہ گڑی تھیں۔ اس کی نظریں بری نہیں تھیں۔

دروازے سے باہر نکلتی علیشا کو لگا، کسی نے اسے ٹرک سے کچل دیا تھا۔ صفیہ نے سوالیہ نظروں سے قریب کھڑے آذر کو دیکھا۔

"آجائے گی۔" آذر نے صفیہ کا بازو تھام کر اسے اٹھایا تھا اور دونوں باہر نکل آئے تھے۔ کمرے سے باہر نکل کر صفیہ نے چبھتی نظروں سے اسے دیکھتے غیر محسوس طریقے سے، اپنے بازو کو اس کی گرفت سے چھڑا لیا تھا۔

(اتنا نخرہ!) آذر نے ابرو اچکا کر اس کی پشت کو گھورا وہ آگے بڑھ گئی تھی۔ ایک بار پلٹ کے دیکھا نہیں۔ وہ وہیں گھاس پہ رک گیا تھا۔ اس نے علیشا جیسی بے لگام اپنی طرف مائل کرنے والی عورتیں اور رئیسہ جیسی چپ چاپ سب کچھ برداشت کرنے والی عورتیں دیکھی تھیں جو "پرفیکٹ بیوی" کے زمرے میں آتی تھیں اور مریم اپنی ماں جیسی باغی عورتیں دیکھی تھیں۔ لیکن وہ صفیہ جیسی عورت سے پہلی بار ملا تھا۔ عثمان کا رویہ یاد آیا تھا اور اس کے ماتھے پہ ناگواری سے بل پڑے تھے۔

کمرے میں آ کر وہ ڈریسنگ ٹیبل کے ساتھ بیٹھی اور جیولری اتارنے لگی اور تب ہی آذر اندر آیا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے تمہیں دوبارہ انیکسی کی طرف جانے کی، عثمان کو دورے پڑتے ہیں اور وہ چیزیں اٹھا کر مارتا ہے۔" اس نے ناگواری چھپانے کی پوری کوشش کی تھی۔

"اوکے!" کانوں سے جھمکے اتارتی صفیہ نے ایک اچٹتی نظر اس پہ ڈالی اور بے نیازی سے سر ہلا دیا تھا۔

لیکن اس کے ہاتھوں کی رفتار سست ہوئی تھی اور وہ پرسوچ نظروں سے آئینے میں دیکھتے اپنے سراپے کو دیکھے گئی تھی۔ وہ باہر نکل گیا تھا اور صفیہ مسکرائی تھی۔

☆☆☆

اچھا کردار خوب صورتی کا محتاج نہیں ہوتا لیکن خوب صورتی ہمیشہ اچھے کردار کی محتاج رہے گی۔ یہ سبق صفیہ کو زندگی نے دیا تھا۔ وہ مردان میں اس کے آبائی گھر میں رہتی تھی۔ وہ ڈی آئی جی تھا اور اسلام آباد میں تعینات تھا۔ کئی کئی دن بعد گھر واپس آتا تھا۔ ملازم کو زور زور سے آوازیں دیتا وہ کمرے میں آیا۔ ایک نظر اس پہ ڈالی تھی جو لحاف اوڑھے صوفے پر نیم دراز تھی۔

"ملاقات کرنی ہے تو میں کھڑی ہو جاتی ہوں۔" وہ سادگی سے بولی تھی۔ "جمعہ خان شاید کہیں مصروف ہے۔"

"کیس کی فائل منگوانی ہے اس سے۔" تندی سے اسے دیکھتے آذر کو تین سیکنڈ لگے تھے اس کی بات سمجھنے میں اور نا چاہتے ہوئے بھی وہ وضاحت دے گیا تھا۔

"کافی دنوں بعد آنا ہوا؟" بے نیازی سے صفحہ پلٹا گیا تھا۔

"اب یہ مت کہنا کہ تم نے مس کیا ہے۔" وہ کوٹ اتار کے بیڈ پہ پھینک کر الماری کی جانب بڑھا تھا۔

"توہین اچھی کرتے ہیں آپ۔" وہ متاثر ہوئے لہجے میں بولی تھی اور آذر واش روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔

دروازے پہ دستک ہوئی تھی اور صفیہ اٹھ کر دروازے تک آئی تھی سامنے سیاہ سلیولیس ساڑھی اور سرخ لپ اسٹک لگائے علیشا کھڑی تھی۔

"آذر ریڈی ہیں؟" پتانے والے لہجے میں پوچھا گیا تھا۔

"نہیں۔" اس نے اثر لیے بنا سر نفی میں ہلایا تھا اور دروازہ وا کر دیا۔ "اندر آؤ گی؟" اس رویے پہ علیشا ذرا سا بوکھلائی، وہ تو کسی اور چیز کی امید کر رہی تھی۔

"نہیں، ان کو بتا دینا۔ میں باہر انتظار کر رہی ہوں۔" وہ مسکرائی اور معنی خیز نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

"اوکے!" صفیہ نے دروازہ کھٹاک سے اس کے منہ پہ بند کیا اور واپس آ کر لیٹی تھی۔

آذر چینج کر کے باہر نکلا۔ جینز پہ شرٹ پہنے گنگناتے ہوئے وہ آئینے کے سامنے رکا تھا۔

"آپ کے کیس کی فائل باہر آئی تھی۔" وہ مصروف سی بولی تھی۔

"کیا......؟" برش کرتے آذر نے آئینے میں اسے دیکھا۔

"علیشا بلانے آئی تھی۔ باہر انتظار کر رہی ہے۔" آذر نے ایک نظر اسے دیکھا۔ وہ جس صفیہ سے پہلی بار انیکسی کے ٹیرس پہ ملا تھا وہ دوبارہ اس سے نہیں مل سکا تھا۔

"عورتیں ایسی باتوں پہ کتنا واویلا کرتی ہیں اور ایک تم ہو......"

"میں ان عورتوں کی طرح بے وقوف نہیں ہوں جو شوہر گندا ہونے پہ کارپٹ بچھاتی ہیں، میں جوتے پہننے کے حق میں ہوں۔" لہجہ عام سا تھا۔

"الماری سے میری جیکٹ نکال دو!" بیڈ پہ بیٹھا آذر جھک کر جوگرز پہنتے ہوئے بولا تھا۔ صفیہ نے کتاب نیچے کی تھی اور آنکھیں سکیڑ کر آذر کو دیکھا۔

"سیریسلی آذر؟ آپ کو واقعی لگتا ہے کہ آپ مجھے اتنا وی آئی پی ٹریٹمنٹ دیں گے اور میں چیزیں لے کے آپ کے آگے پیچھے گھومتی پھروں گی؟"

جوتوں کے تسمے بند کرتے آذر نے سر اٹھا کر ایک نظر اس پہ ڈالی۔ گندمی رنگت اور عام سے نقوش والی وہ لڑکی اپنی اسی زبان درازی کی وجہ سے اسے اچھی لگی تھی۔ وہ اس سے مرعوب نہیں ہوتی تھی۔

"جتنا فوکس زبان چلانے پہ کرتی ہو۔ اتنا فوکس پڑھائی پہ کیا ہوتا تو پاس ہو جاتیں تم۔" وہ چل کر آئینے تک آیا تھا۔

"پہلے یہ سارے کام کون کرتا تھا؟ علیشا یا ملازم؟" وہ اٹھ کر بیٹھی تھی اور اس کا تبصرہ نظر انداز کر کے سوال کیا تھا۔

علیشا کے نام پہ آذر نے آئینے میں اسے گھورا سوجی آنکھیں، کھلے بال اور سرخ گال، پرفیوم اٹھا کر خود پر چھڑکی تھی۔

"مرد ملازم، اب تمہاری موجودگی میں وہ تو آنے سے رہے۔"

"کسی ملازمہ کی ڈیوٹی لگا دیں۔" وہ لحاف ٹھیک کرتی بے نیازی سے بولی۔ "اوہ یاد آیا آپ تو یہاں رہتے ہی نہیں ہیں۔"

"رسی جل گئی پر بل نہیں گئے۔" جیکٹ پہن کے بالوں میں ہاتھ چلاتا وہ دو قدم آگے آیا۔

"مجھ سے تین فٹ دور رہ کر بات کیا کریں آذر۔" صوفے پہ نیم دراز وہ اس کی آنکھوں میں دیکھتی سنجیدگی سے بولی تھی۔

"ورنہ؟" آذر نے گھڑی پہنتے ہوئے اسے دیکھا تھا۔

"میں علیشا نہیں ہوں، مجھ پہ تشدد اور زبردستی آپ افورڈ نہیں کر سکتے۔"

"تم علیشا ہو بھی نہیں سکتیں۔ وہ دنیا کی خوب صورت ترین عورت ہے۔" آذر جتانے والے لہجے میں بول کر پلٹ گیا تھا۔

صفیہ مسکرائی تھی۔ سمجھ میں نہیں آئی تھی بخار کی جلن زیادہ تھی یا اس کے منہ سے علیشا کی تعریف سننے کی۔

"اچھا! لیکن میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے آج تک نہیں دیکھے۔" وہ اسی کے لہجے میں بولی تھی۔ والٹ اور چابیاں اٹھاتے آذر کے ہاتھ رکے تھے۔

"تم مجھ سے ایسی باتیں کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" وہ سخت لہجے میں بولا اور جاتے ہوئے دروازہ زور سے بند کر کے گیا تھا۔

"گستاخی کر دی!" صفیہ خود کلامی کے لہجے میں بولی اور جمائی لیتے ہوئے بے دلی سے کتاب پھر سے کھولی تھی۔

☆☆☆

وہ عرش سے فرش پہ گری تھی اور فرش سے پاتال میں دھنس گئی تھی۔ صفیہ اٹھ کے باہر آئی تھی۔ مردان میں ان کے آبائی گھر میں آذر، اس کا باپ فاروق، عثمان اور علیشا رہتے تھے۔ اس وقت سب رئیسہ کی بیٹی کی سالگرہ پہ گئے تھے۔ گھر میں بس وہ اور عثمان تھے۔ صفیہ لان میں آئی، سامنے پول کے کنارے بینچ پہ عثمان بیٹھا تھا۔ وہ چاپ چاپ پول کی دوسری جانب بیٹھ گئی تھی۔

"کیسی ہو؟" عثمان نے بات کا آغاز کیا تھا۔

"میں بدصورت ہوں کیا؟" اس نے عجیب سے لہجے میں سوال کیا تھا۔ عثمان نے سر نفی میں ہلایا۔

"بدصورت لوگ علیشا اور آذر بھائی جیسے ہوتے ہیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولا تھا۔ اور صفیہ اس کا چہرہ دیکھے گئی تھی۔

"تم پاگل نہیں ہو۔"

"اور تم بدصورت نہیں ہو۔" وہ اسی کے لہجے میں بولا تھا۔

"ہاں، شاید میرا نصیب بدصورت ہے۔" اس نے ایک ہاتھ پانی کی سطح پر پھیرا تھا۔

"تمہیں کیا لگتا ہے جیتنے کا پریشر زیادہ ہوتا ہے یا ہارنے کا ڈر؟"

"ہارنے کا ڈر۔" وہ گم صم سی بولی تھی۔

"تو کیا ہوا؟" اس کی آواز پہ صفیہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ بڑھی ہوئی داڑھی کے ساتھ وہ بہت عجیب لگا تھا۔

"کیا مطلب؟"

"فیل ہونے کے بعد کیا ہوا؟" عثمان نے ابرو اچکائے تھے۔

"کچھ بھی نہیں۔" صفیہ نے چند لمحے سوچا تھا اور پھر سر نفی میں ہلایا تھا۔ اس کا سب سے بڑا ڈر مجسم اس کے سامنے تھا اور وہ ٹھیک تھی۔ برباد تھی لیکن زندہ تھی۔

"ایگزیکٹلی" عثمان نے چٹکی بجائی تھی۔ "تم اپنا سب سے بڑا ڈر جی رہی ہو۔ تم صحیح سلامت ہو اور تمہیں کچھ بھی نہیں ہوا صفیہ! تمہارا رزق نہیں رکا۔ سانس چل رہا ہے۔ تم زندہ ہو۔ ٹھیک ٹھاک ہو۔ ہار اور ڈر کے اس پار کچھ بھی نہیں ہے۔ زندگی کبھی نہیں رکتی۔ انسان سروائیو کرنا سیکھ لیتے ہیں۔"

اس کی بات پہ صفیہ زخمی سا مسکرائی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہوا؟" یہ سوال اس نے خود سے پوچھا۔

"برا شوہر دنیا کا آخری کنارہ نہیں ہے۔" وہ پانی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"مجھے بھی یہی لگتا تھا عثمان۔"

"تو آذر کو چھوڑ دو نا۔" وہ اسی لہجے میں بولا تھا۔ جس لہجے میں کبھی صفیہ دوسروں کو مشورے دیا کرتی تھی۔

"شادی کی تصویر دیکھ کر لگتا نہیں کہ تم ہی ہو۔" اس نے بات بدل دی تھی کیونکہ اس کے کیس میں برا شوہر دنیا کا آخری کنارہ ثابت ہوا تھا۔

"وہاں زیادہ اچھا لگ رہا ہوں؟" عثمان نے سوال پوچھا تھا اور صفیہ نے اٹھتے ہوئے سر ہلایا تھا۔ اس نے ایک چیز محسوس کی تھی۔ آذر کی غیر موجودگی میں وہ نظریں اٹھا کر اسے دیکھ تک نہیں رہا تھا۔

"تم سب کے ساتھ کھانا کیوں نہیں کھاتے؟"

"میرا دل نہیں کرتا۔" وہ کندھے اچکا کر بولا تھا۔ "ان کی شکلیں دیکھنے کا۔"

"کٹ آف ہونا مسئلوں کا حل نہیں ہے۔ مسئلوں کا صرف ایک حل ہے اور وہ ہے ان کو فیس کرنا۔"

"آپ کہتی ہیں تو آجاتا ہوں صفی۔" وہ

مسکرایا تھا۔
"بھابھی!" صفیہ نے نرمی سے تصحیح کی تھی۔
"صفیہ!" عثمان نے کندھے اچکائے تھے اور وہ اٹھ گئی تھی۔
"اب ایگزام دے کر دیکھو۔" عثمان پیچھے سے بولا تھا۔ "جب کوئی راستہ نہ بچے تو زندگی جو تنگ گلی سامنے رکھے، اسی میں آگے بڑھنے میں ہی عافیت ہے۔"
"مجھے لیکچر دینے والا خود اس حال میں کیوں ہے؟" صفیہ نے پلٹ کر ابرو اچکائے تھے۔ عثمان نے بس سر کو خم دیا تھا جواب نہیں دیا تھا۔

☆☆☆

(میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے آج تک نہیں دیکھے)
الفاظ اس کا ایسے تعاقب نہیں کرتے تھے جیسے آج کر رہے تھے۔ گاڑی کئی منزلہ روشن عمارت کے باہر رکی تھی۔
"تمہاری بیوی تھوڑی عجیب نہیں ہے؟" علیشا نے ٹیک لگائے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ آذر نے ہاتھ بڑھا کر بیک ویو مرر اپنے سامنے کیا تھا اور اپنے وجیہہ چہرے کو دیکھا تھا۔ کیا وہ بدصورت تھا؟
"کیا ہوا؟" علیشا نے اس کے ہاتھ پہ اپنا سپید ہاتھ رکھا تھا۔ اپنے ہاتھ پہ رکھا علیشاء کا ہاتھ دیکھ کر اس نے نظریں اٹھا کر اس کا دمکتا چہرا دیکھا تھا۔ آج وہ خوب صورت نہیں لگا تھا۔ یہ وہی چہرا تھا جس کی وہ چند لمحے پہلے تعریف کر کے آیا تھا۔ اس نے ہاتھ غیر محسوس طریقے سے پیچھے کھینچا تھا۔
علیشا کے لباس کا رنگ آج اس نے پہلی بار نوٹس کیا تھا۔ سیاہ رنگ...... یہ رنگ صرف صفیہ پہ اچھا لگا تھا۔
(میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے آج تک نہیں دیکھے)
گاڑی میں صفیہ کی آواز گونجی تھی۔
"اندر چلیں؟ ہم کس کا ویٹ کر رہے ہیں؟"
علیشاء نے کندھے اچکائے تھے۔
"تم گھر سے کیا کہہ کر آئی تھیں؟" آذر نے گاڑی کا شیشہ نیچے کیا تھا، اسے گھٹن محسوس ہو رہی تھی اور غصہ آ رہا تھا۔
"یہی کہ رئیسہ بھابھی کی بیٹی کی سالگرہ پہ جا رہی ہوں۔" علیشا نے کندھے اچکائے تھے۔
"تو تم سالگرہ پہ جاؤ۔" وہ گاڑی اسٹارٹ کرتا بولا تھا۔
"یہ کیا بات ہوئی۔ اتنی مشکل سے کبھی کبھار اکٹھے باہر آنے کا موقع ملتا ہے آذر۔" وہ بدمزہ ہوئی تھی۔
"طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ گاڑی سڑک پہ ڈال چکا تھا اور علیشا نے متفکر نظروں سے اسے دیکھتے نرمی سے اس کے گال کو چھوا تھا۔ آذر نے اس کا ہاتھ ہٹا کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔
"تم سرخ رنگ پہنا کرو علیشا! سیاہ رنگ تم پہ اچھا نہیں لگتا۔" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بڑبڑایا تھا۔
(میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے آج تک نہیں دیکھے)
اسے کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ بس کانوں میں اس کے زہر میں بجھے الفاظ گونج رہے تھے۔ گاڑی اس نے رئیسہ کے گھر کے باہر روکی تھی۔ علیشا دروازہ کھول کر باہر نکل گئی تھی آذر نے گاڑی واپس موڑ لی تھی۔
وہ سیدھا گھر آیا تھا اور دھپ دھپ کرتا سیڑھیاں چڑھ کر اوپر کمرے میں آیا تھا۔ دروازہ دھاڑ سے کھولا۔ سامنے وہ چادر سر سے اتار کر ایک طرف رکھ رہی تھی۔ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
"بدصورت کیسے کہا تم نے مجھے؟" آذر کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا تھا۔
بال کانوں کے پیچھے اڑستی وہ تکان سے اسے دیکھتی ٹیبل تک آئی تھی۔ جس پہ کھانا لگا تھا۔
"ہمت کیسے ہوئی تمہاری کہ تم مجھے بدصورت

کہو۔" آذر نے اسے گردن سے دبوچا تھا، صفیہ نے دونوں ہاتھوں سے اسے دھکا دیا اور آگے بڑھ کے کھانے سے بھری ٹرالی سے چھری اٹھائی تھی۔

"خبردار...... خبردار جو آپ نے مجھے ہاتھ بھی لگایا تو۔" وہ غرائی تھی، آذر اسے دیکھے گیا تھا۔

"ہاتھ نہیں اٹھانے دوں گی میں آپ کو آذر۔" صفیہ نے چھری ٹرالی میں پھینکی تھی اور اس کے قریب آئی تھی۔

"بدصورت ہیں آپ!" گیلی آنکھوں سے وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتی بے خوفی سے بولی تھی۔ آذر نے اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا اور پھر اس کا ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا تھا۔ وہ اسے تھپڑ نہیں مار سکا تھا۔ اسے اپنی ماں یاد آگئی تھی۔ جبڑے بھینچے ایک تیز نظر اس پہ ڈال کر وہ کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کے الفاظ ہنٹر کی طرح لگتے تھے۔

(میں نے آپ دونوں سے زیادہ بدصورت چہرے آج تک نہیں دیکھے)

☆☆☆

وہ آگ جو اس نے دوسروں کے آنگن میں لگائی تھی، اس کے شعلے اپنے آنگن میں بلند ہوئے تھے تو اسے تپش کا اندازہ ہوا تھا۔ علیشا صبح صبح تیار ہو کر باہر آئی تھی اور اسے جھٹکا لگا تھا۔ عثمان آئینے کے سامنے کھڑا تولیے سے چہرا تھپتھپا رہا تھا۔ اس نے کلین شیو کی ہوئی تھی ایسے تیار تھا جیسے کہیں جا رہا ہو۔ یا شاید اسے ایسے لگا تھا کیونکہ اس نے ایک عرصے کے بعد عثمان کو ایسی حالت میں دیکھا تھا۔

"کہیں جا رہے ہو؟" آتشی رنگ کا سفید کڑھائی والا لباس پہنے وہ اس کے قریب آئی تھی۔

"تم سے مطلب۔" وہ پرفیوم چھڑکتے ہوئے بولا۔

"اتنے روڈ کیوں رہتے ہو؟" علیشا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا، عثمان نے اسے بری طرح جھٹکا تھا۔ آج وہ غصے سے پاگل نہیں ہوا تھا۔

"ہاتھ مت لگایا کرو مجھے۔" وہ حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

"اتنی تیاری؟" علیشا پژمردہ چہرے سے اسے دیکھتی پیچھے ہٹی تھی۔

"صفیہ کہتی ہے کہ کلین شیو میں اچھا لگتا ہوں۔" وہ بڑبڑایا اور کمرے سے باہر نکل گیا تھا۔

علیشا سن سی وہیں کھڑی رہ گئی تھی۔ مرد اس کی خوب صورتی پہ جان چھڑکتے تھے اور وہ دوسری نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کرتا تھا۔ علیشا کو ایک لمبے عرصے بعد احساس ہوا تھا۔ آذر کے پیچھے لگ کر اس نے عثمان کو کھو دیا تھا یا شاید کسی دوسری عورت کی جھولی میں ڈال چکی تھی۔

دوسرا جھٹکا آذر کو لگا تھا۔ وہ پندرہ دن بعد گھر آیا تھا۔ منہ ہاتھ دھو کر وہ واش روم سے باہر نکلا اور تولیے سے چہرا تھپتھپاتا کھڑکی تک آیا تھا۔ چہرے سے تولیہ نیچے لے جاتے اس کے ہاتھ تھمے تھے۔ باہر لان میں عثمان صفیہ کے پاس کھڑا تھا اور وہ اس کے سامنے زمین پہ بیٹھی اس کے جوتوں کے تسمے باندھ رہی تھی۔ تسمے بند کر کے وہ اٹھی اور مسکرا کر بال کانوں کے پیچھے اڑستی اس سے کچھ پوچھ رہی تھی اور وہ سر ہلا رہا تھا۔ وہ عثمان ہی تھا، اسے یقین نہیں آیا تھا۔

تیسرا جھٹکا دونوں کو اجتماعی لگا تھا۔ فاروق ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھے خوش گوار موڈ میں عثمان سے کچھ پوچھ رہے تھے۔ اسے ایسے ناشتے کی ٹیبل پر بیٹھا دیکھ کر ان کو تسلی ہوئی تھی کہ وہ واقعی بہتر ہو رہا تھا۔ فاروق اس سے سوال پوچھ رہے تھے اور وہ ہوں ہاں میں جواب دے رہا تھا۔ آذر اور علیشا آگے پیچھے ہی آئے تھے۔

"صفیہ نہیں آئی؟" اس نے سوالیہ نظروں سے آذر کو دیکھا کرسی کھینچتا اس کا ہاتھ رکا۔

"بھابھی کہا کرو۔" وہ چبھتے لہجے میں تصحیح کرتا بولا تھا۔

"صفیہ!" عثمان نے ڈھٹائی سے کندھے اچکائے آذر نے خشمگیں نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

"آذر، کیا کر رہے ہو؟" فاروق صاحب نے

نا دیبی نظروں سے اسے دیکھا تھا۔
اتنے میں صفیہ میز کے گرد کرسی کھینچ کر آذر کے ساتھ بیٹھی تھی اور سب خاموشی سے ناشتا کرنے لگے۔
علیشا کی بھوک البتہ مر چکی تھی۔ اپنی ذات اتنی غیر اہم اسے کبھی نہیں لگی تھی۔ رات کے وقت وہ انیکسی کی چھت پہ آذر کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ سگریٹ پھونک رہا تھا۔
"میں نے عثمان کو اتنا بدلا ہوا پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ صفیہ کے اردگرد تو وہ کوئی اور ہی انسان ہوتا ہے۔ تمہاری بیوی کے ارادے ٹھیک نہیں ہیں۔" آج دونوں آمنے سامنے دیواروں سے ٹیک لگائے کھڑے تھے۔
آذر نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا تھا اور وہ دونوں سوئمنگ پول کے کنارے آمنے سامنے بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ صفیہ کتابیں پھیلائے بیٹھی تھی اور وہ لیپ ٹاپ کھولے کچھ دیکھ رہا تھا۔ گہرے رنگ کی شال خود پہ لپیٹے وہ ہاتھ ہلا ہلا کہ عثمان کو کچھ بتا رہی تھی۔ وہ ان کی طرح انیکسی کی چھت پہ اندھیرے میں چھپ کر نہیں مل رہے تھے نہ ہی کوئی ملازم ان کی نگرانی پہ کھڑا تھا۔ اردگرد سب لوگ تھے۔ ملازم گھوم پھر رہے تھے۔ ایک طرف فاروق صاحب کسی ملازم کے ساتھ کھڑے کوئی بات کر رہے تھے۔ دور رئیسہ کی بیٹی ملازموں کے بچوں کے ساتھ بھاگ دوڑ رہی تھی اور خود رئیسہ موبائل کان سے لگائے کسی سے بات کرتی چکر لگا رہی تھیں۔ وہ سب نارمل تھے۔
"چھوڑو ان کو تم بتاؤ اتنے دن سے کہاں غائب تھے۔" وہ اس کے قریب آئی اور اس کے سینے پہ ہاتھ رکھتے سوال کیا تھا۔
"جہنم میں تھا۔" آذر جل کر بولا اور اس کا ہاتھ درشتی سے ہٹایا تھا۔
"ایسے کیوں بی ہیو کر رہے ہو؟" علیشا کی آنکھوں کی جوت بجھی تھی۔ پہلے عثمان نے ذلیل کیا تھا اور اب آذر!
"پیچھے ہو کر کھڑی ہو۔" اس کا موڈ برا ہو گیا تھا اور علیشا نے صدمے سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔ چند لمحے وہ وہیں رکا تھا اور پھر سگریٹ پھینک کے جوتے سے مسلتا آگے بڑھا تھا۔
"آذر......" علیشا نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تو اس نے جھٹکے سے خود کو چھڑایا تھا۔
"صفیہ......" عثمان کوئی بات کرنے لگا تو صفیہ نے اسے ٹوکا تھا۔ "بھابھی کہا کرو۔ آذر کو برا لگتا ہے۔"
"مجھے بھی لگتا ہے۔" اس نے کندھے اچکائے تھے۔
"کیا......؟" انہماک سے کاپی پہ کچھ لکھتے صفیہ نے سوال کیا تھا۔
"آپ نے آذر جیسے انسان سے شادی کیسے کر لی؟" وہ اس کی بات نظر انداز کر کے بولا تھا۔
"تمہیں آذر سے کیا مسئلہ ہے؟"
"مجھے آذر سے نفرت ہے۔" وہ مصروف سا بولا تھا اور صفیہ نے ایک نظر اسے دیکھا تھا پھر اس کے عقب میں سیڑھیاں اترتے آذر کو اور اس ایک لمحے نے اسے باور کرایا تھا کہ وہ باخبر تھا۔
"تم جانتے ہو؟"
"سب جانتے ہیں۔" اس نے سر اٹھا کہ صفیہ کا چہرہ دیکھا تھا۔ اور اس سے پہلے وہ مزید کچھ پوچھتی رئیسہ اس طرف آ گئی تھیں۔

☆☆☆

عزت محبت کی محتاج نہیں ہوتی لیکن محبت عزت کے بغیر دھیرے دھیرے دم توڑ دیتی ہے۔ بلکہ کبھی کبھار عزت ملنے پہ محبت زندہ ہو جاتی ہے۔ آذر کے دل میں موجود نفرت عزت میں بدلی تھی۔ عزت نے فکر کا لبادہ اوڑھا تھا اور فکر اب محبت کے رنگ میں ڈھلتی جا رہی تھی۔ ہلکے گلابی رنگ کی کام دار لمبی قمیص اور جیولری پہنے وہ اس کے ساتھ ایک فیملی ڈنر پہ آئی تھی۔ وہ لاؤنج میں ایک طرف کھڑا تھا اور وہ تھوڑے فاصلے پہ عورتوں کے ساتھ بیٹھی چائے کے

کپ کو گھور رہی تھی۔

"عورتوں کی بیک پہ بھائی یا باپ کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ہمارے معاشرے کے مردوں کا المیہ یہ ہے کہ اگر ان کو پتا ہو کہ عورت کی بیک پہ کوئی طاقت ور مرد نہیں ہے تو وہ اس کی عزت نہیں کرتے۔" وہ گم صم سی اپنے ہاتھ میں پکڑے چائے کے کپ کو دیکھ رہی تھی جب رئیسہ کی کسی رشتہ دار نے کہا تھا۔

"ایسے مرد کے ساتھ رہنے کی کیا ضرورت ہے؟" کپ کو دیکھتی صفیہ نے نظریں اٹھائی تھیں اور باری باری سب کو دیکھا تھا۔

"جس مرد کا اچھا سلوک، تحفظ اور عزت آپ کی بیک پہ ایک طاقت ور مرد کے ہونے سے مشروط ہے اس کے ساتھ رہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیونکہ کوئی بھی طاقت ور مرد ہمیشہ آپ کی بیک پہ نہیں رہے گا۔" اس کا لہجہ عجیب سا ہوا تھا۔

"ہر کسی کا شوہر آذر درانی نہیں ہوتا نا۔" عورتوں میں سے ایک نے کہا اور صفیہ نے صرف مسکرانے پہ اکتفا کیا تھا۔ واقعی ہر ایک کا شوہر آذر درانی جیسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

دور بیٹھا آذر اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن اس کی عزت کرنے لگا تھا۔ صفیہ کی نظریں اس سے ملیں اور اس نے منہ موڑ لیا تھا۔ وہ اٹھ کر رئیسہ کے بچے کی جانب بڑھی اور اسے اٹھایا تھا۔

آذر اکیلا ہوا تو رئیسہ اس کے قریب آکر بیٹھ گئیں۔

"مجھے پتا چلا ہے کہ صفیہ کے آنے سے عثمان کی حالت بہتر ہوگئی ہے۔" وہ دور کھڑی صفیہ کو دیکھتے ہوئے بولی تھیں۔ آذر نے سر ہلا دیا تھا۔

"ملازم کہہ رہے تھے کہ اچھا تھا، عثمان بھائی کی شادی ہم صفیہ سے کردیتے اور علیشا کی شادی آذر سے۔" وہ سر جھٹک کر بظاہر مسکراتے ہوئے مگر عجیب سے لہجے میں بولی تھیں۔

"میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ غلطی ہوگئی۔ صفیہ اور عثمان۔" رئیسہ بول رہی تھیں اور کپ پہ آذر کی گرفت سخت ہوئی تھی۔

"رئیسہ بھابھی...... صفیہ بیوی ہے میری۔" اسے برا لگا تھا۔

"سیاسی بیوی۔" رئیسہ نے تصحیح کی تھی۔ "وہ ایک نارمل انسان ڈیزرو کرتی ہے۔"

"میں آپ کو ابنارمل لگتا ہوں؟" اس نے چڑے لہجے میں کہا اور دور کھڑی صفیہ کو دیکھے گیا تھا۔ وہ رئیسہ کے چھوٹے بیٹے کو اٹھائے اسے گدگدی کرتے اس سے باتیں کررہی تھی۔ وہ خوب صورت نہیں تھی۔ شفاف تھی۔ اندر اور باہر سے بالکل صاف۔ اتنی صاف کہ آپ آر پار دیکھ سکیں۔ وہ بچے کو اٹھائے ہوئے تھی جب بصیر رئیسہ کا شوہر اس کے قریب رک کر کوئی بات کرنے لگا۔ وہ بصیر کی بات پہ سر ہلا کر مسکرا کر جواب دے رہی تھی اور بار بار بچے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید وہ دونوں بچے کے بارے میں بات کررہے تھے۔ آذر کے اندر باہر ناگواری پھیلی۔ اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قریب گیا تھا۔ وہ ذرا سا لاپروا کیا ہوا تھا سب کچھ زیادہ ہی فری ہو رہے تھے صفیہ کے ساتھ۔ تب تک بصیر صفیہ کے قریب سے ہٹ چکا تھا۔

"چلیں اب گھر؟" اس نے سوالیہ نظروں سے صفیہ کو دیکھا تھا جس نے سر ہلا دیا تھا۔ صفیہ گاڑی کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی اور سیٹ سے سر ٹکائے آذر گردن ذرا سی موڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ اسٹریٹ پول کی زرد روشنی اس کے آدھے چہرے پڑ رہی تھی۔ بصیر کا اس سے بات کرنا عام سی بات تھی۔ پھر بھی آذر کو پتا نہیں کیوں عام نہیں لگی تھی۔

"صبح تک سامان پیک کرلینا۔" آذر کی آواز گونجی صفیہ نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"کیوں......؟" اس کے چہرے پر پریشانی پھیلی تھی۔ اسے لگا کہ وہ اسے چچی کے گھر بھیجنے کا کہہ رہا ہے۔

"میں نے تو کچھ کیا بھی نہیں۔"

"تم میرے ساتھ جا رہی ہو۔" وہ سیدھ میں دیکھتا بولا تھا۔

"اوہ۔" صفیہ نے سکون کا سانس لیا تھا "اوکے!"

اس نے پھر سے گردن موڑ لی تھی۔ وہ لوگ علیشا اور ملازمہ کا انتظار کر رہے تھے، آذر کی نظر اس کے گود میں رکھے ہاتھوں پر پڑی تھی۔ چوڑیاں کلائی سے ذرا پیچھے کھسکی ہوئی تھیں اور کلائی سے لپٹا سنہری بریسلیٹ زرد روشنی میں چمک رہا تھا آذر نے اس پہ لکھے الفاظ کو پڑھا تھا۔

"غصن الزیتون؟ اس کا کیا مطلب ہوا؟" اس نے صفیہ کی کلائی پکڑ کر بریسلیٹ کو سامنے کیا تھا۔ وہ چونکی تھی۔

"یہ......" اس کے چہرے پہ آسودہ سی مسکراہٹ پھیلی تھی۔ "یہ زیتون کی شاخ کو کہتے ہیں جو معافی، امن اور صلح کی علامت ہے۔"

"کس نے دیا تھا؟" آذر نے سنہری دھات سے بنے ان الفاظ پہ انگلی پھیری تھی۔

"چچا نے۔" صفیہ نے مختصر سا جواب دے کر اس کی شکل دیکھی تھی۔

"کیوں؟" آذر نے اس کا چہرہ دیکھا تھا جس پر غیر آرام دہ تاثر تھا۔ سامنے مین گیٹ سے علیشا باہر نکلی تھی اس کے پیچھے پیچھے ملازمہ چل رہی تھی۔

"میرے اندر نرمی نہیں تھی، اس لیے معاف کرنا بہت مشکل رہا ہے۔ اور وہ کہتے تھے کہ معاف کر کے تعلقات بحال کرنا زندگی میں بہت ضروری ہے۔ اس لیے انہوں نے مجھے یہ دیا تھا کہ میں یہ سبق یاد رکھوں۔" اس نے نرمی سے کہہ کر اپنی کلائی چھڑانا چاہی تھی۔

"میرے لیے معافی مانگنا بہت مشکل ہے۔" آذر اس کا بریسلیٹ دیکھتا بڑبڑایا تھا۔

"اب چھوڑ بھی دیں۔" وہ عام سے لہجے میں بولی تھی لیکن آذر پرسکون سا ان الفاظ کو دیکھ رہا تھا۔ تب ہی صفیہ کی کھڑکی پہ علیشا نے انگلی پہ پہنی انگوٹھی سے دستک دی تھی۔

صفیہ نے چونک کر اس طرف دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکے بغیر آذر کے ہاتھ میں موجود اس کی کلائی دیکھ رہی تھی۔ آذر نے بریسلیٹ سے نظریں ہٹا کر صفیہ کا مضطرب چہرا دیکھا تھا اور پھر نگاہ پھیر کر شیشے پہ جھکی علیشا کے چہرے کو...... نیلی آنکھوں میں عجیب تپش تھی۔ آذر نے صفیہ کی کلائی نہیں چھوڑی تھی۔

"ہاں؟" شیشہ نیچے کر کے صفیہ نے علیشا کو دیکھا تھا۔ صفیہ کے آدھے چہرے پہ پڑتی اسٹریٹ پول کی زرد روشنی، سنہری دھات سے لکھے وہ الفاظ، شیشے کے پار نظر آتی علیشا کی نیلی آنکھیں، ٹھنڈی سیاہ رات اور اس کے کہے الفاظ...... اس ایک لمحے نے عجیب سا تاثر چھوڑا تھا۔ آذر کو لگا تھا جیسے کائنات اسے کوئی پیغام دے رہی تھی۔

"پیچھے چلی جاؤ پلیز، میری ٹانگ میں درد ہے۔" علیشا بے زار سے لہجے میں بولی تھی۔ صفیہ نے ٹھنڈا سانس خارج کیا اور ٹیک لگا کر سر نفی میں ہلایا تھا۔

"نو!"

علیشا نے انگارہ آنکھوں سے آذر کا چہرا دیکھا اس کا سانس غیر معمولی حد تک تیز تھا اور کھڑکی کے شیشے پہ اس کی گرفت سخت ہونے سے مرمریں انگلیاں سرخ پڑ رہی تھیں۔ ملازمہ دلچسپی سے منہ چادر سے ڈھانپے سارا تماشا دیکھ رہی تھی۔

"کوئی مسئلہ ہے تو آپ ایک کام کریں۔ گاڑی کی چابی مجھے دے دیں۔ میں اور شہر بانو گھر چلے جاتے ہیں۔ آپ دونوں بعد میں آ جائیں۔" وہ باری باری دونوں کا چہرہ دیکھتی سکون سے بولی تھی۔ اندر سے دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

(اگر جو آذر نے اس چڑیل کے سامنے بے عزتی کر دی تو؟ تو میری پہلے کون سی عزت ہے) دل کی دھڑکن ذرا سست ہوئی تھی اور اعتماد واپس بحال ہوا تھا۔

"آذر! اس سے کہیں کہ......" ہے ڈرائیونگ کے

کام دار لباس میں اس کا چہرہ خجالت سے سرخ ہوا تھا۔

"صفیہ......" آذر کی بات منہ میں رہ گئی تھی۔

"میں اور شریفاں ڈرائیور کے ساتھ آجائیں گے، آپ لوگ جائیں۔" اس نے سپاٹ چہرے کے ساتھ کہتے ہوئے جھٹکے سے اپنی کلائی چھڑائی تھی اور سیٹ بیلٹ کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تھا۔

"صفیہ اور میں جاتے ہیں۔" آذر نے ہاتھ بڑھا کر اسے روکا اور علیشا کو دیکھتے ڈیش بورڈ سے موبائل اٹھایا تھا۔

"ڈرائیور کو کال کرتا ہوں۔ وہ تم دونوں کو گھر چھوڑ دے گا۔" وہ موبائل پہ بٹن دباتے بولا تھا۔ صفیہ اور علیشا دونوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا تھا۔ دھواں دھواں ہوتے چہرے کے ساتھ علیشا نے شیشے سے ہاتھ ہٹایا اور گاڑی آگے بڑھ گئی تھی۔

"پوری بات سن لیا کرو پہلے!" آذر عام سے لہجے میں بولا تھا۔

"ملازمہ کو تو بٹھا لیتے۔" وہ چلتی گاڑی سے باہر دیکھتے ہوئے جی کڑا کر کے بولی تھی۔

"تم ڈر رہی ہو؟" وہ ڈرائیو کرتے ہوئے عام سے لہجے میں بولا تھا۔

صفیہ نے بس ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

"بندے نہیں کھاتا میں۔" وہ سکون سے بولا تھا۔

"آپ سے کچھ بعید بھی نہیں ہے۔" وہ بڑبرائی تھی۔

"عثمان ایسا کیوں ہو گیا ہے؟" اس نے کچھ یاد آنے پہ سوال کیا تھا۔

"ماں کی ڈیتھ کی وجہ سے۔" آذر کے چہرے پر سایہ سا لہرایا تھا۔

"کیسے ہوئی تھی ان کی ڈیتھ؟"

"تم کیوں پوچھ رہی ہو؟" گاڑی کی فضا میں ایک دم تناؤ پھیلا تھا۔

"وہ عثمان...... پہلے وہ کتنا مختلف نظر آتا تھا پھر......" وہ بول رہی تھی اور آذر نے اس کی بات کاٹی تھی۔

"تمہیں اس کی اتنی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس کے ساتھ ہمدردی کرنا بند کرو۔ ہم ہیں اس کے ساتھ ہمدردی کرنے کے لیے۔" وہ بیزار لہجے اور اونچی آواز میں بولا۔

"میرے ساتھ اس ٹون میں بات مت کریں۔" صفیہ اسی کے لہجے میں بولی تھی۔ آذر نے ایک نظر غلط اس پہ ڈالی اور خاموش ہو گیا تھا۔

اندھیرے میں ڈوبی دنیا کو دیکھتی صفیہ کو علیشا کا چہرا یاد آیا تھا۔ زخموں پہ جیسے کسی نے مرہم رکھ دیا تھا۔

☆☆☆

سب اچھے تھے بس وہی برا تھا، جسے اچھا ہونا چاہیے تھا اور اس ایک انسان کے برا ہونے سے سب کی اچھائی پس منظر میں چلی گئی تھی۔

وہ لوگ مردان جا رہے تھے۔ رئیسہ کو پہلے کسی پارٹی پہ جانا تھا اور پھر واپس مردان آنا تھا۔ ان کے بیٹے کو بخار تھا اس لیے انہوں نے بچے کو صفیہ کے ساتھ بھیج دیا تھا۔ آذر کا سکریٹری گاڑی چلا رہا تھا اور وہ رئیسہ بھابھی کا دو مہینے کا بچہ گود میں لیے بیٹھی تھی۔ صاف رنگت والا وہ گول مٹول صحت مند سا بچہ تھا۔ اپنے گرد شال پھیلائے کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ ان کی فیملی میں فنکشن بہت ہوتے تھے۔ اتنے فنکشن صفیہ نے پوری زندگی میں نہیں دیکھے تھے جتنے شادی کے بعد ان چند مہینوں میں دیکھے تھے۔

گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ آذر نے سوالیہ نظروں سے سکریٹری کو دیکھا۔

"میں چیک کرتا ہوں۔" سکریٹری دروازہ کھول کر باہر نکلا چند منٹ بعد واپس آیا تھا۔

"کوئی مسئلہ ہو گیا ہے سر۔ آپ ڈرائیور کو بلا لیں۔"

آذر نے سامنے سڑک کو دیکھا تھا لمبی سڑک سیدھی ان کے گھر تک جاتی تھی۔ یہاں سے ان کا اپنا علاقہ شروع ہوتا تھا۔

"پیدل چل سکتی ہو؟" دروازہ کھولتے ہوئے

اس نے وہ بیک ویو مرر میں صفیہ کو دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ ''آف کورس!'' کندھے اچکا کر وہ باہر نکلی تھی۔ سکریٹری ڈرائیور کے انتظار میں وہیں رکا تھا اور وہ دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھے تھے۔

''سیف ہے نا؟'' وہ بچے کو بازوؤں میں اٹھائے بولی تھی۔

''یہ ڈر میرے ساتھ زبان درازی کرتے ہوئے کہاں جاتا ہے؟'' وہ گردن موڑ کر اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''میں بے بی کے لیے کہہ رہی تھی۔'' اس نے وضاحت دی تھی۔ ہوا کے جھونکے سے اس کی شال سر سے ڈھلک چکی تھی۔ چلنے میں دشواری ہو رہی تھی بینچ پر بیٹھ کر اس نے ہیلز کو اتارا تھا۔

''اگر تمہیں یہ امید ہے صفیہ کہ میں۔'' آذر نے تندی سے اسے گھورا اور صفیہ نے نظریں اٹھا کر سامنے کھڑے اس آدمی کو دیکھا تھا۔

''مجھے آپ سے کوئی امید نہیں ہے آذر'' وہ سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتی سنجیدہ لہجے میں بولی تھی۔ ایک ہاتھ سے موبائل پکڑے کمبل میں لپٹے بچے کو سہارا دیا تھا اور دوسرے سے جھک کر جوتے اٹھائے اور ننگے پیر ٹھنڈی سڑک پہ آگے بڑھنے لگی تھی۔ آذر خاموشی سے اس کے پیچھے آیا تھا۔

''لاؤ تھوڑی دیر میں اٹھالوں۔'' وہ دونوں آدھے راستے میں پہنچے تھے جب آذر نے ہاتھ بڑھائے تھے۔ صفیہ نے چپ چاپ بچہ اسے دے دیا۔

''تم واپس کیوں آئی تھیں صفیہ؟'' وہ سامنے دیکھتے اپنے گھر کو دیکھتا بولا تھا۔

''چچا کے لیے۔'' صفیہ کا لہجہ پست ہوا تھا۔

''اور نیہا کے لیے۔ چچی نے کہا، میری ڈائیورس سے اس کی شادی متاثر ہوگی۔ میں ان کے ساتھ اتفاق تو نہیں کرتی لیکن رسک بھی نہیں لے سکتی تھی۔ چچا میرے ساتھ بہت اچھے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میری وجہ سے ان کی بیٹی کی زندگی متاثر ہو۔''

''مجھے امید نہیں تھی کہ تم آؤ گی۔'' آذر سر کو خم دے کر کہا تھا۔

''مجھے بھی۔'' اس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ ''مجھے ٹھکانا چاہیے تھا اور آپ کو بیوی نام کا دم چھلا تو برا سودا نہیں ہے۔''

آذر خاموش رہا تھا اور صفیہ نے اس کا چہرا دیکھا تھا۔

''وہ جانتا ہے آذر'' وہ مدہم لہجے میں بولی تھی۔

''کیا؟'' آذر نے سوالیہ نظروں سے اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

''عثمان آپ کے اور علیشا کے بارے میں جانتا ہے۔'' وہ اسے کبھی نہیں بتانا چاہتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں جانے سے پہلے وہ اس پہ ایک احسان کرنا چاہتی تھی۔

''علیشا غیر تھی لیکن آپ اس کے بھائی تھے۔ آپ علیشا کو پسند کرتے تھے تو اس سے شادی کر لینی چاہیے تھی نا'' وہ ہیلز تھامے مزے سے چل رہی تھی۔

''علیشا جیسی عورت شادی کے قابل ہے؟'' آذر تلخ لہجے میں بولا تھا۔

''تو عثمان سے کیوں کی اس کی شادی؟'' وہ رکی اور اس کا چہرا دیکھا تھا۔

''عثمان نے اپنی مرضی سے کی تھی۔'' آذر نے کندھے اچکائے تھے۔

''لیکن آپ کا اور علیشا کا یہ تعلق اس کی مرضی نہیں ہے۔''

آذر نے کوئی جواب نہیں دیا تھا...... اس کے پاس جواب نہیں تھا۔ البتہ شرمندگی اور گلٹ نے گھیرا تھا۔ کسی عوت کے سامنے اتنی اہانت اس نے پہلی بار محسوس کی تھی۔

''آپ مجھ سے اتنی نفرت کیوں کرتے ہیں؟''

''کیونکہ تم فاروق درانی کی پسند ہو۔'' وہ دوبدو بولا تھا۔

''آپ کو فاروق درانی کی پسند پر اعتراض تھا تو

کہا کیوں نہیں؟'' دونوں گھر کے مین گیٹ سے اندر داخل ہوئے تھے۔

''کیونکہ اعتراض تھا۔'' اس نے ''تھا'' پہ زور دیا تھا اور بچے کو اس کی جانب بڑھایا۔ وہ جاگ چکا تھا۔ صفیہ خاموش رہی تھی۔

''ڈنر پہ چلوگی؟''

''مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنی ہے۔'' وہ مصروف لہجے میں بولی تھی۔

''اچھی لگ رہی ہو۔'' وہ آگے بڑھتے ہوئے بولا تھا۔

''توہین کرنے میں آپ ماہر ہیں آذر۔'' وہ اسی کے لہجے میں بولی تھی۔ آذر کو معافی مانگنی نہیں آتی تھی اور صفیہ کو معاف کرنا نہیں آیا تھا۔

''توہین ڈنر کی ریکویسٹ ٹھکرانا ہے یا تعریف کرنا؟'' اس نے پلٹ کے ابرو اچکا کے اسے دیکھا تھا۔

''توہین یہ ظاہر کرنا ہے ڈی آئی جی صاحب جیسے کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔'' وہ جتاتی نظروں سے اسے دیکھتی قریب سے گزر کر آگے بڑھ گئی تھی۔

☆☆☆

آذر کمرے میں کھڑا موبائل کی اسکرین دیکھتا کوئی میسج پڑھ رہا تھا۔ دروازہ کب کھلا اسے پتا نہیں چلا تھا۔ کسی نے پیچھے سے آ کے اس کے گرد بازو حمائل کیے تھے۔ وہ چونک کر پلٹا علیشا کھڑی مسکرا رہی تھی۔

''علیشا......'' آذر نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا تھا۔

''ناراض ہو؟'' وہ بولی تھی اور اس کی گردن کے گرد بازو حمائل کیے تھے۔ اور اس سے پہلے کہ آذر کوئی جواب دیتا دروازہ کھلا تھا اور صفیہ اندر آئی تھی۔ دونوں نے بیک وقت پلٹ کر اسے دیکھا تھا۔ اس نے ایک سپاٹ نظروں دونوں پر ڈالی اور الٹے قدموں واپس پلٹ گئی تھی۔ دروازہ ٹھاہ کر کے بند کیا تھا۔

''علیشا! دوبارہ تم ایسی کوئی حرکت نہیں کروگی۔'' آذر نے اس کے بازو ہٹائے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟'' وہ ہاتھ بڑھا کر اس نے چہرہ چھونے لگی تھی اور آذر نے راستے میں ہی اس کی کلائی پکڑلی تھی۔

''عثمان کو پتا چلے گا تو وہ بہت غصہ کرے گا۔ اس لیے آج کے بعد تم میرے کمرے میں نہیں آؤ گی۔'' اس نے جھٹکے سے اس کی کلائی چھوڑ کر اسے گھورا تھا۔ ''اور تین فٹ دور رہ کر بات کیا کرو۔''

آذر کے لہجے میں اجنبیت اور کراہت سی تھی جسے علیشا نے واضح محسوس کیا تھا۔

''تو ہم شادی کر لیتے ہیں۔'' علیشا کی آنکھوں کی جوت بجھی تھی۔

''جا کے کام کرو اپنا۔'' وہ ہاتھ جھلا کر بولا تھا۔

''تم مجھ سے ایسے پیچھا نہیں چھڑا سکتے آذر۔'' وہ آنکھوں میں تپش لیے بولی۔

''ایک گولی کی مار ہو تم۔'' آذر موبائل جیب میں ڈالتے ہوئے بے رحم لہجے میں بولا تھا اور وہ شاکی نظروں سے اس کا چہرہ دیکھے گئی تھی۔

''وہ تمہیں پھر بھی گھاس نہیں ڈالے گی۔'' وہ رعونت سے بولی تھی۔

''تمیز سے بات کرو۔'' کوٹ پہنتے آذر نے برہمی سے اسے دیکھا۔

''یہ سب تم اپنی بیوی کی وجہ سے کر رہے ہو نا؟'' اس کا چہرہ دھواں دھواں اور گلا رندھا تھا۔

''میں تمہیں جواب دہ نہیں ہوں۔ اور علیشا! تم مجھے ''تم'' کہنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔'' آذر نے موبائل کوٹ کی جیب میں ڈالتے ہوئے ہاتھ سے اسے سامنے سے ہٹنے کا اشارہ کیا تھا۔ علیشا ایسے ہی جم کی کھڑی رہی تب آذر نے بازو سے پکڑ کر گویا اسے ایک طرف دھکیلا اور باہر نکل گیا تھا۔

☆☆☆

انسان تکلیف کا کبھی عادی نہیں ہوتا۔ زخم درد دیتا تھا لیکن زخم پہ ملے زخم کی تکلیف دگنی ہوجاتی تھی۔ وہ سیڑھیاں اتر کر ایک طرف بنی لائبریری میں آئی تھی۔ اور ایک ریک کا سہارا لے کر منہ پہ ہاتھ رکھے

روئے جا رہی تھی۔ یہ آذر کی اصلیت تھی اور وہ پہلے دن سے جانتی تھی لیکن وہ جتنا بھی ڈھیٹ بن جاتی یہ چیز تکلیف دیتی تھی۔

''پہلی بار تو نہیں ہے کہ آپ نے دونوں کو اکٹھا دیکھا ہو پھر یہ رونا کس بات پہ؟'' عثمان کی پرسکون سی آواز پہ وہ چونکی تھی۔ چادر سے آنکھیں صاف کی تھیں۔

''پتا نہیں۔'' اس نے مختصر سا جواب دیا تھا۔

''ایسے ٹاکسک (زہریلے) ریلیشن شپ میں رہنا انسان کو ہر محاذ پر تباہ کر دیتا ہے۔'' وہ ایک کتاب اٹھا کر اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''تو پھر تم کیوں ہو اس رشتے میں؟'' صفیہ نے پلٹ کے سوال کیا تھا۔

''میں تو دیکھ رہا ہوں آذر اور علیشا کتنا نیچے گرتے ہیں۔'' وہ کندھے اچکا بولا تھا۔

''تو پھر ہم دونوں میں کیا فرق ہے؟'' اس نے ریک کے ساتھ ٹیک لگائے سوال کیا تھا۔ وہ اس ریک کی دوسری جانب کھڑا تھا۔

''آپ کی مجبوری ہے اور میں دونوں کو اسی گھاٹ سے پانی پلانا چاہتا ہوں جس سے یہ مجھے پلاتے رہے ہیں۔''

''تمہاری ماں کو کیا ہوا تھا عثمان؟'' اس نے مدھم آواز میں سوال کیا تھا۔

''خودکشی کی تھی۔'' وہ بے حس لہجے میں بولا اور صفیہ کے رونگٹے کھڑے ہوئے تھے۔

''کیوں؟'' اس کے گلے سے پھنسی پھنسی آواز نکلی تھی۔

''وہ بابا کے کسی ملازم سے شادی کرنے کا سوچ رہی تھیں۔'' کتاب کے بند ہونے کی آواز آئی تھی۔ ''بابا کو پتا چلا تو انہوں نے مما پہ افیئر کا الزام لگایا اور ان پہ تشدد کر کے ان کو کمرے میں بند کر دیا تھا۔ تو مما نے سوسائیڈ کر لی۔'' آخر میں عثمان کی آواز مدھم ہوئی تھی۔

''کسی نے روکا نہیں؟'' صفیہ ٹیک چھوڑ کر سیدھی ہوئی تھی اور باہر آ کر عثمان کو دیکھا تھا۔ اس نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

''انہوں نے مدد کے لیے آذر کو بہت پکارا تھا لیکن یہ نہیں گیا۔'' عثمان ریک میں کوئی دوسری کتاب ڈھونڈتا بولا تھا۔

''تو تمہاری آذر سے یہ لڑائی ہے۔؟'' صفیہ نے جواب طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

''کس کس چیز کے لیے لڑوں آذر سے؟'' عثمان بڑبڑایا تھا۔ ''ماں کے قتل میں حصہ ڈالنے کے لیے؟ مجھے اکیلا چھوڑنے کے لیے؟ پاگل پن کا الزام لگانے کے لیے؟ یا میری بیوی کے ساتھ تعلقات رکھنے کے لیے؟'' ریک سے کتاب نکال کر اس نے خشک آنکھوں سے صفیہ کو دیکھا۔

''تعلقات نہیں بس فرینک نیس ہے۔'' صفیہ مدافعانہ انداز میں بولی تھی۔

''اب آپ بھی آذر کو ڈیفینڈ کریں گی۔'' وہ ہنسا تھا۔

''علیشا سے شادی کیوں کی تھی؟'' صفیہ کو آج سارے رازوں سے پردہ اٹھانا تھا۔

''وہ ہمارے پرانے مالی کی بیٹی تھی۔ وکٹم بلیمنگ کر کے پہلے اس نے مجھے پھنسایا پھر اسے آذر میں فائدہ نظر آنے لگا تو اس کے ساتھ مصروف ہو گئی۔ اس نے میرے پاگل ہونے کے الزام پہ ثبوتوں کے ساتھ ٹھپہ لگایا ہے اور اب سب آپ کی نظروں کے سامنے ہے۔ اسے ہمیشہ سے آذر کے قریب ہونا تھا اور پھر اسے بہانا مل گیا۔'' وہ عام سے لہجے میں بولا تھا۔

''اسے چھوڑ کیوں نہیں رہے؟'' اپنی تکلیف وہ یکسر بھول چکی تھی۔

''ایسے کیسے چھوڑ دوں؟ ابھی تو ان دونوں کو اس دوا کا مزاہ چکھنا ہے جو انہوں نے مجھے دی ہے۔'' وہ مسکرایا اور سر اٹھا کر صفیہ کو دیکھا تھا۔ ''مدد کریں گی؟''

''مجھے کسی ڈرامے کا حصہ نہیں بننا۔ میں بس

نیہا کی شادی کا انتظار کر رہی ہوں۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"ایک آخری سوال۔"

"پوچھیں؟"

"کیا واقعی تمہاری ماں......" اس نے بات ادھوری چھوڑ کر متذبذب نظروں سے عثمان کو دیکھا۔

"ڈیڈ آذر سے بھی زیادہ بدتر تھے۔ ماں کو ٹائم نہیں دیتے تھے۔ باہر دوسری عورتوں کے ساتھ گھومتے تھے۔ مما کو ایک نارمل زندگی گزارنی تھی۔ وہ ڈرائیورس لے کے اس آدمی سے شادی کرنا چاہتی تھیں لیکن......" اس نے صفیہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

صفیہ نے سر جھکا لیا تھا۔

"جتنی اذیت ان دونوں نے آپ کو دی ہے۔ اس کا ایک فیصد ہی واپس کر دیں۔" وہ مصروف سے لہجے میں بولا تھا اور صفیہ نے کچھ سوچ کر سر اثبات میں ہلایا تھا۔ عثمان نے دروازہ کھولا تھا سامنے علیشا سیڑھیوں سے اتر رہی تھی۔ ان دونوں کو ایسے باتیں کرتا دیکھ کر وہ جل بھن گئی تھی۔ تن فن کرتی نیچے آگئی تھی۔

"کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"وہی جو تم اوپر آذر کے ساتھ کر رہی تھیں۔" صفیہ سینے پہ ہاتھ باندھے مسکرائی تھی۔

"اپنے شوہر تک محدود رہو سمجھیں۔" علیشا نے انگارہ ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ اور صفیہ نے ایک دم قہقہہ لگایا تھا۔

"دیکھو، بول کون رہا ہے۔"

"ابھی تو میں نے کچھ کیا ہی نہیں اور تم تو ابھی سے لال پیلی ہو رہی ہو۔" اس نے مسمسا منہ بنا کر علیشا کے گال کو چھوا تھا۔ "پوئر علیشا۔"

علیشا اسے گھور رہی تھی اور وہ باہر کی جانب بڑھی جہاں گاڑی تیار کھڑی تھی۔ اس کے ہاتھ میں موجود موبائل پہ آذر کی کال آ رہی تھی۔

☆☆☆

آذر آفس سے گارڈز کے بغیر نکلا تھا۔ سیکریٹری نے اسے روکنا چاہا تھا لیکن وہ کسی کی سنتا کہاں تھا۔ رات کے اس وقت وہ گاڑی سڑک کنارے روکے کھڑا تھا۔ اسٹریٹ پولز کی زرد روشنی گاڑی کے بونٹ پہ پڑ رہی تھی۔ وقت کتنی سال پیچھے گیا تھا، پندرہ سالہ آذر صوفے پہ سر جھکائے سپاٹ چہرا لیے بیٹھا تھا اور اس کے سامنے زمین پہ اس کی ماں بیٹھی تھی۔

"میرا کوئی چکر نہیں ہے آذر! میں فاروق کو دھوکا نہیں دے رہی۔ جمیل اور میں شادی کرنے کا سوچ رہے ہیں۔ میں فاروق جیسے انسان کے ساتھ مزید نہیں رہ سکتی۔ تم سمجھ رہے ہو نا؟" اس کی ماں نے اس کا گھٹنا ہلایا تھا اور آذر نے سر اٹھا کر خالی خالی آنکھوں سے ان کو دیکھا تھا۔

"آپ بدکردار ہیں۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔

"آذر......" اس کی ماں نے صدمے سے اس کی شکل دیکھی تھی۔

"اگر مما بدکردار ہیں تو ڈیڈ کیا ہیں؟" قریب کھڑے عثمان کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے اور ماں کو کندھوں سے تھام کر اٹھایا تھا۔ "ان کو بھی ایسے ہی کٹہرے میں کھڑا کرو۔ مما ڈرائیورس لے کے شادی کرنے کا کہہ رہی ہیں تو اس میں برا کیا ہے؟"

آذر نے بس خالی خالی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر ان کے عقب میں دیوار پہ لگی گھڑی کو۔ اس کا دل چاہا تھا ان کو بتا دے لیکن پھر۔ اس نے دل سخت کر لیا تھا۔

(لوگ تھوکیں گے ہم پہ آذر! وہ میرا اسکریٹری تھا۔ لوگ کیا کیا باتیں کریں گے کبھی سوچا ہے) کانوں میں باپ کی آواز گونجی تھی۔

"آپ کو کسی کی اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔"

عثمان ماں کے آنسو صاف کرتے کہہ رہا تھا اور تب ہی دروازہ دھاڑ سے کھلا تھا۔ اور فاروق اندر آئے تھے۔ اس کی ماں نے مدد طلب نظروں سے

آذر کو دیکھا تھا اور عثمان کے پیچھے ہوئی تھی۔ فاروق نے البتہ صرف آذر کو دیکھا تھا۔ وہ کسی روبوٹ کی طرح اٹھا۔ عثمان بول رہا تھا فاروق نے آگے بڑھ کر مریم کو بالوں سے دبوچا اور باہر نکالا۔ آذر نے عثمان کو پکڑا تھا۔

عثمان خود کو چھڑا رہا تھا اور فاروق مریم کو گھسیٹ کر اندر لے جا رہے تھے اور وہ چیختے ہوئے عثمان کو نہیں...... آذر کو پکار رہی تھیں۔ لیکن اسے نہ وہ نظر آ رہی تھیں نہ ان کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ اسے وہ تصویریں نظر آ رہی تھیں جو اس کے باپ نے اسے دکھائی تھیں جس میں وہ ریسٹورنٹ میں اس ملازم کے ساتھ بیٹھی تھیں اور ان کے تین تین گھنٹوں کی کال ریکارڈنگز سنائی دے رہی تھیں۔ فاروق نے ان پہ تشدد کر کے ان کو شادی سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی اور مریم نے غصے میں آ کر خودکشی کر لی تھی۔ اس ایک واقعے نے عثمان کو پاگل کر دیا تھا۔ اسے دورے پڑنے لگے تھے اور آذر کو بے حس کر دیا تھا۔

آذر حال میں لوٹا تھا۔ مریم کی آوازیں آج بھی اس کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ رات کی تاریکی اوڑھے شہر پرسکون، خاموش اور ٹھنڈا تھا۔ اسٹریٹ پولز کی روشنی بھی ویسے ہی پڑ رہی تھی۔ وہ بدکردار ہوتے ہوئے بھی ایسے قتل کیا جانا ڈیزرو نہیں کرتی تھیں۔ آذر کو ہر دن احساس ہوتا تھا۔ گہرا سانس لے کے اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ پتا نہیں توازن خراب ہوا تھا یا کیا۔ اس کی گاڑی کسی بھاری چیز سے ٹکرائی اور قلابازیاں کھاتی سڑک پہ جا گری تھی۔ کان بند ہو گئے تھے۔ اور منظر دھندلا ہو گیا تھا۔ کراہتے ہوئے اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنے کی کوشش کی تھی اور مریم سامنے کھڑکی کے پار بیٹھی دکھ سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

آذر نے پلکیں جھپک کر منظر کو واضح کرنا چاہا تھا لیکن اس کی آنکھوں پہ بوجھ پڑا تھا اور وہ ان کو دوبارہ نہیں کھول سکا تھا۔ لمحوں میں ہر چیز جیسے اندھیرے میں ڈوب گئی تھی۔

☆☆☆

تین ہفتے اسپتال میں رہنے کے بعد وہ گھر آیا تھا۔

اسے بری طرح چوٹیں آئی تھیں۔ ہوش میں آنے کے بعد اگر اس نے کسی کے چہرے پہ واقعی فکر دیکھی تھی تو وہ صفیہ اور عثمان تھے۔ عثمان نے اس سے بات نہیں کی تھی لیکن وہ اسپتال میں رہا تھا۔ وہ بیڈ پہ لیٹا موبائل پہ کچھ دیکھ رہا تھا جب وہ کھانا لے کر آئی تھی۔ گہرے نیلے رنگ کا لباس پہنے اس نے بال ڈھیلے سے آدھے باندھے رکھے تھے۔

"کھانا کھا لیں آذر۔" وہ اس کے قریب ٹرے رکھ کر کرسی کھینچتی بولی تھی۔ آذر نے موبائل بند کیا۔ اتنے دن ہو گئے تھے صفیہ نے اسے سنائی نہیں تھیں۔

"اتنی فکر؟" وہ اسے دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

پیالہ اٹھاتے صفیہ کے ہاتھ سست پڑے تھے اور اس نے گہرا سانس لیا تھا۔

"سیاسی بیوی ہوں، دکھاوا تو کرنا پڑتا ہے۔" وہ ڈھٹائی سے پیالہ اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولی تھی۔

"کس چیز کا دکھاوا؟" آذر نے پیالہ اس سے لیتے ہوئے پوچھا۔ "کیئر کا یا محبت کرنے کا؟"

"محبت؟" صفیہ نے ابرو اچکا کر آذر کو دیکھا۔ "آپ کو لگتا ہے، میں آپ سے محبت کر سکتی ہوں؟"

"اسپتال میں تمہارا چہرا دیکھ کر تو یہی لگ رہا تھا۔ اتنا لوگ مرے ہوئے لوگوں کو نہیں روتے جتنا تم مجھے رو رہی تھیں۔" وہ مسکراہٹ دبا کر بولا تھا۔

صفیہ نے ٹرے کو ایک طرف رکھی اور بند مٹھی پہ ٹھوڑی ٹکا کر بیٹھ گئی۔

"اسٹاک ہوم سنڈروم کے بارے میں سنا ہے آپ نے؟" وہ اسے گھورتے ہوئے بولی تھی۔ آذر نے بریسلیٹ والی کلائی کو پکڑا تھا اور سرنفی میں ہلایا۔

"سی ایس ایس کے کورس میں تو نہیں تھا۔" وہ جتاتے لہجے میں بولا تھا اور مسلسل ان سنہری الفاظ کو دیکھے گیا تھا۔ عجیب سی کشش تھی ان میں۔

''یہ ایک ایسی بیماری ہے جس میں قیدی کو قید کرنے والے سے محبت ہو جاتی ہے اور زخمی کو زخم دینے والا اچھا لگنے لگتا ہے۔ جسے آپ محبت کہہ رہے ہیں، میرے لیے وہ بس بیماری ہے۔'' اس نے کلائی چھڑانی چاہی تھی۔

''لاعلاج بیماری۔'' آذر نے بازو پہ گرفت بڑھائی۔

''چھوڑیں......'' صفیہ نے تادیبی نظروں سے اسے گھورا اور آذر نے بازو چھوڑ دیا تھا۔

''یہ آپ کو اتنا پسند ہے تو آپ ہی رکھ لیں۔'' کلائی سے بریسلیٹ اتار کے اس نے آذر کو تھمایا تھا۔ اس سے پہلے وہ کوئی جواب دیتا دروازے پہ دستک ہوئی تھی۔ اس نے جتاتی نظروں سے دیکھا تھا۔

''کم آن!'' دونوں نے بیک وقت دروازے کی جانب دیکھا علیشا اندر آئی تھی۔ آذر نے آنکھیں بند کر کے ایک تھکا ہوا سانس خارج کیا تھا اور صفیہ کے چہرے پہ تلخ مسکراہٹ تھی اور وہ کھڑی ہوئی۔

''یہاں کیوں آئی ہو؟'' آذر نے بیزاری سے کہا صفیہ اٹھ کر دروازے کی جانب بڑھی تھی۔

''حال پوچھنے آئی تھی۔'' علیشا کا گلا رندھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے دونوں نکل گئے تھے۔ نہ آذر رہا تھا اور نہ عثمان۔

''زندہ ہوں جیسا کہ تم دیکھ رہی ہو۔'' صفیہ نے ڈورناب گھما کر دروازہ کھولا۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' آذر نے برا سا منہ بنایا۔

''واک کرنے جا رہی ہوں۔'' وہ ایک سپاٹ نظر آذر پہ ڈال کر باہر نکل گئی تھی۔ علیشا ٹس سے مس نہ ہوئی وہیں کھڑی رہی تھی۔

''منع کیا تھا میں نے تمہیں علیشا۔'' آذر برے موڈ میں بولا تھا۔

''تمہاری بیوی اور عثمان کے لچھن کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے۔ ذرا فرصت ملے تو اس طرف بھی غور کرنا۔'' وہ چبا چبا کر بولی آذر کے بیزار چہرے پہ سختی چھا گئی۔

''عثمان میری شکل دیکھنا گوارا نہیں کرتا اور تمہاری بیوی تمہیں گھاس تک نہیں ڈالتی۔''

''یہ کس حیثیت سے تم مجھے 'تم' کہتی ہو؟'' آذر کی پیشانی پہ بل پڑے تھے۔

''گستاخی ہو گئی ڈی آئی جی صاحب!'' علیشا اسے گھور کر باہر نکل گئی تھی۔ اسے واپس سارا فوکس عثمان پہ کرنا تھا۔ آذر اس کی پہنچ سے ہمیشہ سے باہر تھا۔ وہ جو اس کے قریب ہوا تھا وہ بھی بس صفیہ کی چڑ، فاروق سے نفرت اور گلٹ میں ہوا تھا۔

☆☆☆

نیہا کی شادی تھی اور سب اس میں جانے کے لیے تیار تھے۔ آذر سیاہ لباس پہنے کمرے میں دائیں بائیں چکر کاٹتا اپنے مینیجر سے بات کر رہا تھا۔

''یہ پہن لوں؟ اچھی لگ رہی ہے؟'' وہ ساڑھی پہن کے آئینے کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھی۔ آذر نے موبائل پہ جھکا سر اٹھا کر اسے دیکھا اسے یقین نہیں آیا تھا۔ وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔

''آپ سے ہی پوچھ رہی ہوں آذر؟'' صفیہ پلٹی تھی۔ اس نے ہلکے سبز اور سنہرے امتزاج کی سلک کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ آذر نے ستائشی انداز میں ابرو اچکائے اور سر ہلایا۔ وہ مسکرائی اور میک اپ کرنے میں مصروف ہو گئی تھی۔ پھر جیولری نکال کر دو گلوبند اس کے سامنے کیے تھے۔

''کون سا زیادہ سوٹ کرے گا؟''

''تمہاری طبیعت ٹھیک ہے نا؟ آج مجھ پہ اتنی عنایات۔'' وہ موتیوں والے سیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا تھا۔

''آج میں بہت خوش ہوں شاید اس لیے۔'' اس نے چوکر گلے میں پہنا تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ لوگ ایک وسیع لان میں کھڑے تھے۔ صفیہ اس سے کافی فاصلے پہ کھڑی عورتوں سے بات کر رہی تھی۔ بار بار اس کی نظر اس کے طرف اٹھ جاتی علیشا اور عثمان ابھی تک نہیں آئے تھے۔

وہ پلو ٹھیک کرتی اس تک آئی تھی۔
"آپ کو کچھ کہنا ہے آذر؟" اس نے عجیب سی نظروں سے آذر کی شکل دیکھی تھی۔
"کیا مطلب؟" آذر نے اسے دیکھا تھا۔
"سوری، تھینکس یا کچھ بھی؟" وہ اس کا چہرہ دیکھتی بولی تھی۔
"سوری اور تھینکس؟" آذر نے ابرو اچکا کر اسے دیکھا اور صفیہ گہرا سانس لے کے چند لمحے اسے دیکھے گئی تھی۔ پھر کلچ اور موبائل وہیں قریب ٹیبل پر رکھا اور ذرا ہٹ کر ساڑھی ٹھیک کرنے لگی تھی۔ اس کے موبائل کی اسکرین روشن ہوئی تھی اور آذر نے اس طرف دیکھا تھا۔ عثمان کا میسج تھا، وہ اسے گھر جلدی آنے کا کہہ رہا تھا۔ آذر کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔ موبائل اور کلچ اس سے لیا تھا اور چپ چاپ کھڑی ہوگئی تھی۔ موبائل پر روشن ہوا اس بار کال آئی تھی۔ وہ وہاں سے ہٹ کر ایک سائڈ پر چلی گئی۔ کال سننے کے چند منٹ بعد وہ واپس آئی تھی۔
"میرے سر میں درد ہے آذر، میں گھر جا رہی ہوں۔" وہ عام سے لہجے میں بولی تھی۔
"ڈرائیور کو بھیجوں؟" آذر نے اسے گھورتے ہوئے سوال کیا تھا اور اس نے سر ہلا دیا تھا۔

☆☆☆

علیشا انیکسی میں اپنے کمرے میں چپ چاپ لیٹی تھی پھر اٹھ کر باہر آئی تھی۔ عثمان اپنے کمرے میں کھڑا تیار ہو رہا تھا۔ اس نے سیاہ ڈریس شرٹ پہ سیاہ پینٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔
"عثمان"
عثمان نے بس نظریں اٹھا کر آئینے میں اپنے عقب میں دیکھا۔
"مجھے کچھ بات کرنی ہے۔"
"بولو؟" وہ لیے دیے لہجے میں بولا تھا۔
"مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے۔ میں...... یہ سب میں نے خود سے نہیں کیا۔ آذر نے مجھے ورغلایا تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ میں تمہاری بیوی ہوں پھر بھی...... لیکن میرا یقین کرو میں نے کبھی کوئی لمٹ کراس نہیں کی۔" علیشا نے روتے ہوئے جو بچی جھوٹی کہانی بنی تھی اسے سنا دی تھی۔ ساری روداد سن کر عثمان نے اسے دیکھا۔
"آذر ہے ہی ایسا، وہ تمہیں ہراس کرتا رہا یہ تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟"
"میں ڈر گئی تھی۔ مم...... میں۔" اس نے بے یقینی سے عثمان کو دیکھا تھا۔
"ہم یہاں نہیں رہیں گے۔" عثمان نے اس کے آنسو صاف کیے تھے۔ "کھانا کھایا ہے؟" علیشاء نے سر نفی میں ہلایا۔
"پھر شادی پہ جانے کا پلان کینسل کرتے ہیں اور ہم دونوں ڈنر پر چلتے ہیں۔" وہ مسکرا کر اس کا گال تھپتھپاتے بولا۔
"میں ریڈی ہو کر آتی ہوں۔" علیشاء کی آنکھوں میں جگنو چمکے تھے۔
"میں تمہارے لیے ایک گفٹ لایا ہوں۔" وہ مسکرایا اور ایک شاپنگ بیگ اس کی جانب بڑھایا تھا۔
"اوپر چھت پہ ویٹ کر رہا ہوں ریڈی ہو کر آجاؤ۔" وہ آگے بڑھ گیا تھا اور پیچھے علیشا نے آنکھیں بند کر کے سکھ کا سانس لیا تھا۔

☆☆☆

"صفیہ گھر پہنچ گئی ہے؟ میری کال نہیں اٹھا رہی۔" اس نے لہجہ سرسری رکھنے والا کیا تھا۔
"جی صاحب جی، انیکسی طرف گئی تو ہیں۔"
دوسری جانب چوکیدار نے مؤدب سے لہجے میں بتایا، آذر نے کال کاٹ دی تھی۔ وہ گھر سے تھوڑے فاصلے پہ ہی رکا ہوا تھا۔ گاڑی گیٹ سے اندر لا کے وہ جبڑے بھینچے انیکسی تک آیا اور دھاڑ سے دروازہ دھکیل کر اندر دیکھا۔ کمرا خالی تھا۔ وہ باہر سیڑھیوں کی جانب بڑھا اور اوپر آیا۔ آخری سیڑھی پہ آذر کے قدم تھمے تھے۔ سامنے عثمان کھڑا اس کے سامنے صفیہ کھڑی تھی۔ یہاں سے اس کی پشت دکھائی دے رہی

تھی۔ جس انداز میں اور جتنے قریب وہ دونوں کھڑے تھے۔ وہ پلٹ گیا۔ وہ ان دونوں کو زندہ چھوڑنے والا نہیں تھا۔

کمرے میں آ کر اس نے ہذیانی انداز میں درازیں کھنگالی تھیں۔ سامنے گن پڑی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہے ہیں آذر؟" نسوانی آواز پہ وہ پلٹا تھا۔

انیکسی کی چھت پہ عثمان نے علیشا کا چہرہ دیکھا تھا۔

"یہ کہانیاں گھڑنا کہاں سے سیکھا ہے تم نے علیشا؟" وہ ہلکے پھلکے لہجے میں بولا اور اس کے قریب کھڑی علیشا نے سوالیہ نظروں سے اس کو دیکھا تھا۔ آذر کو واپس جاتے ہوئے وہ پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔

"تمہاری ہراسمنٹ کی کہانی کی سیٹنگ یہیں ہوتی تھی نا؟" وہ اس کے چہرے سے لٹ ہٹاتے ہوئے کہہ رہا تھا اور علیشا کے چہرے کا رنگ بدلا تھا۔

"میری نظر میں تم دنیا کی بدصورت ترین عورت ہو۔" کہہ کر عثمان نے لفافہ اس کی جانب بڑھایا تھا اور پیچھے ہٹ گیا تھا۔ ہلکے سبز اور سنہرے رنگ کی ساڑھی عثمان نے اسے دی تھی وہ پہنے علیشا نے سست روی سے لفافہ کھول کر کاغذات باہر نکالا تھا۔ وہ طلاق کے کاغذات تھے۔ لفافہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کے نیچے جا گرا تھا۔

گن پکڑے آذر پلٹا وہ اس کے عقب میں کھڑی تھی۔ آذر نے اسے بازو سے دبوچا اور تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے کر انیکسی کی چھت پہ گیا لیکن اس کے قدم ٹھٹک کر رکے تھے۔ آواز پہ سامنے کھڑی علیشا پلٹی تھی اور خالی خالی نظروں سے ان کو دیکھا تھا۔ علیشاء اور صفیہ کی ساڑھی کا رنگ ایک جیسا تھا۔

"کیسا لگا؟" صفیہ نے بازو چھڑایا۔ وہ جسے صفیہ سمجھ رہا تھا، وہ علیشا تھی۔

"یہ مذاق ہے؟" وہ غرایا تھا اور اس نے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھایا لیکن ہاتھ فضا میں معلق رہ گیا تھا۔ وہ ایسے ہی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"رک کیوں گئے ہیں، ماریں؟" صفیہ دو قدم آگے آئی تھی۔ "میرا بھی یہی دل چاہا تھا آذر، جب میں نے آپ کو علیشا کے ساتھ دیکھا تھا۔"

"عثمان نے مجھے طلاق دے دی ہے۔" علیشا نے آذر کو دیکھا جس نے شاک سے قریب آتے عثمان کو دیکھا تھا۔

"عثمان......تم......ایسے کیسے؟" صفیہ کو چھوڑ کر اس نے عثمان کو دیکھا تھا۔

"آپ کر لیں شادی۔" وہ بے حس لہجے میں بولا تھا۔

"شٹ اپ" آذر نے اسے گریبان سے پکڑا تھا۔

"آپ میرا گریبان پکڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہیں۔ یہ تو ایک بدکردار عورت تھی لیکن آپ تو بھائی تھے میرے؟" وہ شکوہ کناں نظروں سے اسے دیکھتا بولا تھا۔

"جب تک ہم دونوں زندہ ہیں آذر بھائی۔ آپ میرے سامنے مت آیا کریں۔ نفرت ہے مجھے آپ سے۔" عثمان جھٹکے سے اپنا گریبان چھڑا کر پلٹ گیا تھا۔ صفیہ نے بھی ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پلٹ گئی تھی۔ ان کی کہانی یہیں سے شروع ہوئی تھی اور یہیں ختم ہوئی تھی۔

☆☆☆

کمرے میں آ کر اس نے سوٹ کیس نکالا اور چپ چاپ اس میں کپڑے رکھنے لگی تھی۔ آذر دروازہ کھول کر اندر آیا تھا۔

"صفیہ......"

"معافی کا وقت گزر چکا ہے آذر" اس نے کہہ کر سوٹ کیس نیچے اتارا تھا۔

"میں عثمان کے ساتھ یا کسی بھی مرد کے ساتھ اسی پوز میں کھڑی ہوتی ہوں جیسے آپ علیشا کے ساتھ کھڑے تھے اور......"

"شٹ اپ......" آذر کا چہرہ غصے سے سرخ

ہوا تھا۔

"اور جس دن آپ مجھے اس سب کے لیے معاف کر دیں گے آذر! میں بھی آپ کو معاف کر دوں گی۔" آنسوؤں سے لبریز آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے صفیہ نے اپنی بات مکمل کی۔

"میں کسی مجبوری کے تحت واپس نہیں آئی تھی آذر، یہ احسان تھا۔ میرے چچا نے مجھ پہ بہت احسان کیے ہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی، میری طلاق کی وجہ سے ان کی بیٹی کی زندگی متاثر ہو۔ اس لیے میں نے صرف نیہا کی شادی تک انتظار کیا تھا۔"

وہ نم آنکھوں سے چبا چبا کر بولی تھی اور بازو چھڑا کر باہر نکل گئی تھی اور آذر وہیں کھڑا رہا تھا۔ اسے معافی مانگنی نہیں آئی تھی۔

وہ نیچے آئی تھی اور ملازم نے ہونقوں کی طرح اس کی شکل دیکھی تھی۔

"دروازہ کھولو؟" صفیہ نے سوٹ کیس دھکیلتے تیز نظروں سے اسے دیکھا۔

"بی بی! رات کو آذر لالہ کی اجازت کے بغیر گیٹ نہیں کھلتا۔" گن پکڑے چوکیدار ہچکچایا تھا۔

"دروازہ کھولو۔" صفیہ اب کے غصے سے بولی تھی۔ ملازم نے ان کے کمرے کی کھڑکی میں کھڑے آذر کو دیکھا۔ اس نے سر ہلا کر دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تھا اور چوکیدار نے گیٹ کھول دیا تھا۔ سوٹ کیس دھکیلتی وہ باہر نکل گئی تھی۔

☆☆☆

رات کو اس وقت وہ اس خالی سڑک پہ بینچ پر بیٹھی تھی۔ قریب سوٹ کیس رکھا تھا۔ دور روشنیوں میں جگمگاتا درانی ہاؤس نظر آ رہا تھا۔ غصے اور بدلے کا غبار چھٹا تھا تو منظر واضح ہوا تھا۔ اور دماغ نے اس کے سامنے اک سوال لا کر رکھا تھا اب آگے کیا صفیہ......؟

"چچی! مجھے گھر کی چابیاں چاہئیں۔" چچی کے کال اٹھاتے ہی وہ بولی تھی۔ اس نے ان کو کچھ دن پہلے کال کر کے بھی یہی کہا تھا۔

"گھر کی چابیاں فیصل کے پاس ہیں صفیہ۔" چچی پژمردہ لہجے میں بولی تھیں۔

"اس گھر میں میرے بابا کا بھی حصہ تھا، آپ فیصل کو ایسے کیسے دے سکتی ہیں؟" صفیہ کی آنکھوں سے گرم مائع گالوں پہ بہا تھا اور اس نے مرے مرے ہاتھوں سے موبائل کان سے ہٹایا تھا۔ چچی کچھ اور بھی کہہ رہی تھیں لیکن صفیہ نے نہیں سنا تھا۔ ہتھیلی کی پشت سے اس نے گالوں کو رگڑا۔ چچی نیہا کے ساتھ رہتی تھیں۔ گھر بھی چلا گیا تھا اور اس کے پاس اپنا کوئی ذریعہ آمدنی نہیں تھا۔ چچا کی دکان کا کرایہ بھی چچی کے پاس آتا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا سامنے پہاڑی سے چھلانگ لگا دے۔ آذر کے ساتھ سب کچھ کرنے سے پہلے تک یہ سب بڑا آسان لگا تھا۔ اب مشکل لگ رہا تھا۔ سردی ہڈیوں میں گھستی محسوس ہو رہی تھی اور حقیقت کے آئینے نے اسے اس کا اصل دکھایا تھا۔ وہ لاوارث تھی۔

☆☆☆

آذر وہیں صوفے پہ بیٹھا تھا جیب سے والٹ نکال کر دو انگلیوں سے ایک تصویر باہر نکالی تھی اور اسے دیکھے گیا تھا۔ وہ اس کی ماں کی تصویر تھی۔ مریم درانی ایک خوب صورت عورت تھیں۔ وہ مریم کو نہیں بچا سکا تھا۔ جبکہ اسے بچانا چاہیے تھا۔ لیکن وہ صفیہ کو تو بچا سکتا تھا۔ یہ تلافی کا ایک موقع تھا۔ اس نے بیڈ پہ پڑی اپنی شال اٹھا کر اوڑھی اور الماری سے کوٹ نکالا تھا۔

☆☆☆

"بدلہ لینے کے لیے سب سے پہلے اپنی بیک مضبوط کرتے ہیں۔" وہ بینچ پر آ کر بیٹھا اور کوٹ اس کے اور اپنے درمیان رکھا تھا۔

"تم مجھ سے بدلہ لینے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا تھا اور صفیہ گردن موڑے بیٹھی رہی تھی۔

"جانتی ہوں، میں لاوارث ہوں۔" وہ تلخی سے بولی تھی۔

"اٹھو گھر چلو۔" آذر کی آواز گونجی تھی۔

"میں واپس نہیں جاؤں گی۔" اس نے سر نفی میں ہلایا۔

"تو پھر کہاں جاؤ گی؟" آذر کے لہجے میں طنز نہیں استفسار تھا اور صفیہ کے رونے میں مزید تیزی آ گئی تھی۔

"مجھے چھوڑنے سے پہلے تمہیں ایک اسٹیبل سورس آف انکم اور ایک محفوظ ٹھکانے کی ضرورت ہے۔ حقیقت اور تصور میں یہی فرق ہے صفیہ جمال!" وہ پرسکون سا بولا اور اٹھ کر سوٹ کیس پکڑا تھا۔

صفیہ نے ایک کاٹ دار نظر اس پہ ڈالی۔ کوٹ اٹھا کر پہنتے ہوئے اس کے آگے آگے چل دی تھی۔ تقدیر اسے کچھ اس طرح اس آدمی کے قدموں میں لا کر پٹختی تھی کہ وہ بے بس ہو جاتی تھی۔

☆☆☆

آذر اپنے کمرے میں جا رہا تھا۔ رئیسہ کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس کے کانوں میں رئیسہ کی آواز پڑی تھی اور اس کے قدم تھمے تھے۔

"تم صفیہ سے شادی کر لو عثمان! آذر اور وہ ایک دوسرے کی ٹائپ نہیں ہیں اور وہ ویسے بھی اسے چھوڑ رہا ہے۔"

"میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتا رئیسہ بھابھی! آذر بھائی ہے میرا اور وہ صفیہ کو پسند کرتا ہے۔ صفیہ سے شادی کرنے کے لیے آذر کو چھوڑنا پڑے گا اور میں آذر کو نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ دو ٹوک لہجے میں بولا تھا۔

آذر آگے بڑھ گیا تھا۔ اپنے کمرے میں آئے اسے کچھ ہی منٹ گزرے تھے جب دستک ہوئی تھی۔ اجازت ملنے پہ دروازہ کھلا اور عثمان اندر آیا تھا۔

"آپ معافی کیوں نہیں مانگ لیتے آذر بھائی۔" عثمان زچ لہجے میں بولا تھا۔ "آپ کو نہیں لگتا آپ کے اتنا ہرٹ کرنے کے بعد میں، مما اور صفیہ آپ سے معافی سننا ڈیزرو کرتے ہیں۔"

"تمہیں لگتا ہے، میں معافی کے قابل ہوں۔" آذر گھڑی اتارتے ہوئے بولا تھا۔

"یہ فیصلہ میں نے، صفیہ اور مما نے کرنا تھا۔ آپ کا کام بس معافی مانگنا ہے۔"

"سوری!" آذر نے پلٹ کے عثمان کو دیکھا تھا اور اسے جیسے ایک لمحے کے لیے سانپ سونگھ گیا تھا۔ اسے آذر سے اتنی جلدی معافی کی امید نہیں تھی۔

"میں اور رئیسہ بھابھی صفیہ کو واپس تو لے آئیں گے لیکن اسے روکنا آپ کا کام ہے۔" وہ کہہ کر دروازے کی جانب بڑھ گیا تھا۔

☆☆☆

"باہر کی دنیا پریوں کی کہانیوں جیسی نہیں ہے صفیہ۔" یہ رئیسہ تھیں۔ "تم صحیح ہو، جو آذر نے کیا ہے، وہ ناقابل قبول ہے۔ لیکن تم اس وقت اکیلی ہو۔ تمہارا ایک بھی محرم رشتہ ہوتا یا تمہاری ماں ہی زندہ ہوتی تو میں تمہیں کبھی نہ روکتی۔ میں خود تمہیں اس فیصلے پہ سپورٹ کرتی۔ لیکن اب تمہیں آذر کی ضرورت ہے۔ یہ لوگ باہر برے ہیں لیکن محافظ اچھے ہیں۔"

اگلا پورا سال اس کا اور آذر کا آمنا سامنا بہت کم ہوا تھا۔ اس نے امتحان پاس کر لیا تھا اور ٹریننگ اکیڈمی چلی گئی تھی۔ وہاں سے واپسی پہ اس کی تقرری ہوئی تھی اب وہ رئیسہ اور عثمان کے ساتھ بیٹھی تھی۔

"آذر نے وہ سب کچھ بابا اور آپ کی نفرت میں کیا تھا۔ دیکھیں، ایک چانس دے دیں۔ آذر نے دوبارہ کچھ الٹا سیدھا کیا تو اب آپ کے پاس ایک اسٹیبل زندگی ہے۔ آپ کبھی بھی واپس جا سکتی ہیں۔" یہ عثمان تھا۔

"سوال ہی پیدا نہیں ہوتا عثمان۔" صفیہ نے سر نفی میں ہلایا تھا۔

"کوئی بھی بڑا فیصلہ کرنے سے پہلے ایک بار باہر کی دنیا کو دیکھ لو۔ تمہاری آزاد خیال طبیعت کو یہ بات کتنی ہی ناگوار کیوں نہ گزرے یہ حقیقت ہے۔ اس معاشرے میں ہمیں مرد کی ضرورت ہے صفیہ۔" یہ رئیسہ تھیں اور وہ سر ہلا کر اٹھ گئی تھی۔ وہ دونوں چلے گئے تھے اور وہ گورنمنٹ سے ملے اس گھر میں

اکیلی تھی۔ کمرے میں آکر اس نے دروازہ لاک کیا تھا۔ عجیب سا ڈر اسے ہر وقت گھیرے رہتا تھا۔ آفس میں بھی اس نے دیکھا تھا، کچھ مرد آفیسرز بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھتے تھے۔ وہ بیڈ کے ساتھ ٹیک لگائے زمین پہ بیٹھ گئی تھی۔ چند منٹ ہی گزرے تھے جب نیہا کی کال آئی تھی۔ اسے مبارک باد دے کر وہ اسے اپنے دکھڑے سنانے لگی تھی اور صفیہ چپ چاپ سنے گئی تھی۔ وہ بس تنہائی کو کاٹنا چاہتی تھی اور خوف کے اس اثر کو زائل کرنا چاہتی تھی۔

"کیا بتاؤں صفیہ! میرا شوہر فیصل...... اتنا کنجوس آدمی ہے۔ اتنا پیسہ ہے اس کے پاس اور پائی پائی کا حساب رکھتا ہے۔ اتنے طعنے دیتا ہے، تم سوچ بھی نہیں سکتیں۔ ماما کو ساتھ تو رکھ لیا ہے میں نے لیکن جو اس آدمی نے میرا ناک میں دم کیا ہوا ہے۔" وہ روہانسی ہوئی تھی۔

"تو چچی سے کہو، میرے ساتھ آجائیں۔" وہ گم صم سی بولی تھی۔

"کیسے آجائیں؟ یہ بھانجا ہو کر ایسا ہے تو آذر کیسا ہوگا۔ قسم سے میں بابا کو اتنا مس کرتی ہوں صفیہ۔"

"آذر ایسا نہیں ہے" وہ بے آواز بڑبڑائی تھی اور نیہا نے اپنا دل ہلکا کر کے کال کاٹ دی تھی۔

☆☆☆

باہر کی دنیا واقعی پریوں کی کہانیوں جیسی نہیں تھی۔ اسے شوہر برا لیکن محافظ اور جائے پناہ اچھی ملی تھی۔ اگلی شام کو وہ دیر سے واپس جا رہی تھی۔ گاڑی ایک جھٹکے سے رکی تھی۔ ڈرائیور باہر نکلا تھا۔ اور صفیہ نے بے چین نظروں سے اردگرد دیکھا تھا۔ وہ نسبتاً سنسان علاقہ تھا۔ اتنے میں تین موٹر سائیکل سوار ان کے قریب آکے رکے تھے۔ ایک نے ڈرائیور کو دبوچا تھا اور دو اس کی جانب بڑھے تھے۔

ایک نے کار کا شیشہ توڑ کر صفیہ کو باہر نکالا تھا اور گردن سے اسے سختی سے دبوچا تھا۔ وہ اس کی گرفت میں بری طرح پھڑپھڑائی تھی۔ وہ آذر نہیں تھا جو اس کے ایک بار کہنے پہ چھوڑ دیتا۔ وہ اسے گھورتے ہوئے منہ اس کے قریب کیے اسے دیکھ رہا تھا بے بسی سے صفیہ کی آنکھوں میں پانی اکٹھا ہوا تھا۔ ان میں سے ایک نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی، دوسرے نے ڈرائیور کو باندھ کر پھینکا تھا اور تیسرا صفیہ کو دروازہ کھول کر اندر ڈالنے کی کوشش میں تھا۔ جب ان کے ایک ساتھی نے ان کو روکا تھا۔

"اوئے! یہ آذر درانی کی بیوی ہے۔"

"آذر درانی؟ وہ ڈی آئی جی؟" اس آدمی کی گرفت اس کے گلے کے گرد ہلکی ہوئی تھی اور اس نے کارڈ اپنے ساتھی کے ہاتھ سے دبوچ کر دیکھا تھا۔

"نکلو یہاں سے۔" وہ دونوں ایک جست میں گاڑی سے باہر نکلے تھے۔

"نام کیا ہے تیرے شوہر کے باپ کا؟" وہ ابھی تک کشمکش میں تھا۔

"فاروق درانی۔" صفیہ کی پھنسی پھنسی سی آواز نکلی تھی۔

"نکل یہاں سے، وہ اس علاقے کا ڈی آئی جی ہے۔ کہاں مار کر پھینکے گا۔ کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔"

وہ دونوں موٹر سائیکل اسٹارٹ کر چکے تھے۔ اس آدمی نے صفیہ کو چھوڑا اور تینوں بھاگ گئے تھے۔ وہ اب سُن سی وہیں کھڑی رہی تھی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے موبائل نکالا تھا۔ واپسی کا راستہ اسے ٹھیک ٹھیک دکھائی دینے لگا تھا۔ اس کے لیے معاف کرنا مشکل تھا اور اس کے چچا نے کہا تھا کہ یہ مشکل زندگی آسان بنا دے گی تو۔

واقعی زندگی کو آسان بنا دیا تھا۔

☆☆☆

صلح اختلاف ختم کر کے تعاون اور سمجھوتا کرنے کا نام تھا۔ یہ غلطی کو تسلیم کر کے دل آزاری اور نقصان کی تلافی کرنا تھا۔ یہ امن، سکون اور تعاون کی حالت کو دوبارہ قائم کرنا تھا۔ یہ ماضی کی غلطیوں کی تلافی کر کے تعلقات بہتر کرنے کا نام تھا۔ تھوڑی دیر بعد

وہ آذر کے گھر کے لاؤنج میں کھڑی تھی۔ دروازہ کھلا تھا اور وہ اندر آیا تھا۔

"تم ٹھیک ہو؟" وہ اس کے سامنے آ کے رکا تھا اور صفیہ کے آنسو بند توڑ کے باہر نکلے تھے۔ اسے لگا تھا اس کے پاس باور فل پوزیشن ہو گی تو کوئی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا لیکن وہ غلط تھی۔

آذر کی نظر اس کی گردن پہ پڑی تھی جہاں زور سے دبوچنے سے انگلیوں کے نشان پڑ گئے تھے۔ اس نے صفیہ کے بال ہٹا کر گردن کو دیکھا تھا اور پھر اس کا چہرہ دیکھا تھا۔

"کتنے آدمی تھے؟" وہ جبڑے بھینچے بولا تھا۔

"تین۔"

"شکلیں یاد ہیں؟" آذر نے اس کو بیٹھنے کا اشارہ کیا تھا۔

"چہرے کور تھے ان کے۔" سر نفی میں ہلا کر وہ صوفے پہ بیٹھ گئی تھی۔ اور آذر کال ملا کر موبائل کان سے لگائے باہر نکل گیا تھا۔

"مجھے بارہ گھنٹوں کے اندر اندر وہ تینوں سلاخوں کے پیچھے چاہئیں۔" وہ باہر کھڑا سخت لہجے میں بول رہا تھا اور پھر واپس آیا تھا۔ اس کا اترا چہرا دیکھا تھا۔

"ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں صفیہ!" وہ اس کے سامنے آ کر رکا تھا۔

"مجھے لگا تھا، میرے پاس پاور فل پوزیشن ہو گی، گھر ہو گا، پیسے ہوں گے تو مجھے کسی کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ لیکن میں غلط تھی۔" وہ سر جھکا کر بولی تھی۔

"بابا نہیں تھے، تو چچا تھے، اور وہ تھے تو لگتا تھا دنیا کوئی الگ ہی جگہ ہے۔ وہ گئے تو آپ آ گئے۔ زندگی خوب صورت نہیں تھی لیکن محفوظ تھی۔ اور اب آپ نہیں ہیں تو لگتا ہے سر پہ چھت نہیں ہے۔ مجھے آپ کی ضرورت ہے۔ رئیسہ بھابھی نے ٹھیک کہا تھا۔ میں آپ کو چھوڑ نہیں سکتی۔ باہر کی دنیا واقعی پریوں کی کہانی جیسی نہیں ہے۔"

"چھوڑ نہیں سکتیں صفیہ! تو معاف کر دو نا۔" وہ تھکی تھکی آنکھوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"اتنا برا انسان بھی نہیں ہوں یار، میں ہرٹ تھا اور میں نے اپنی تکلیف میں تمہیں بھی تکلیف دی۔"

صفیہ نے ایسے ہی جھکے سر کے ساتھ آنسو صاف کیے تھے۔

"گھر جانا ہے تو چھوڑ آؤں۔" نرمی سے آذر نے گہرا سانس لیا تھا۔ اور صفیہ نے اس کی شکل دیکھی تھی۔ اس آدمی کے نام کا ٹیگ اس کے ساتھ نہ ہوتا تو اس سے آگے اس کی سوچ جا ہی نہیں سکی تھی۔

"مجھے واپس نہیں جانا۔" اس نے سر نفی میں ہلایا تھا اور کھڑی ہوئی تھی۔ "مردان جا سکتی ہوں؟"

فضا جیسے ایک دم سے ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔

"مردان...... اس وقت؟" آذر نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھ کر ایسے ظاہر کیا تھا جیسے یہ کہیں جانے کا بڑا ہی کوئی نامناسب وقت تھا۔

"کیا وقت ہوا ہے؟" صفیہ نے ابرو اچکا کر اس کا ہاتھ تھام کر گھڑی پہ وقت دیکھا تھا۔

"دس ہی تو بج رہے ہیں۔ آپ بارہ بجے بھی واپس آ جاتے تھے، یاد ہے نا؟"

"باہر دھند ہے اور ڈرائیور بے چارا تھکا ہوا ہو گا۔ تو یہاں ہی رک جاؤ، تم ویسے بھی ڈیوٹی پہ ہو صفیہ! صبح واپس آنا پڑے گا۔" آذر سرسری سے لہجے میں بولا تھا۔

"یہ مہمان نوازی کتنے دنوں کے لیے؟" صفیہ نے بالوں کو اونچی پونی میں باندھتے ہوئے اس کا کو دیکھا تھا۔

"ساری زندگی کے لیے۔ لیکن تم جتنے دنوں تک چاہو، رک سکتی ہو۔" وہ جیب سے اس کا بریسلیٹ نکال کر اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا تھا۔

"تو یہ صلح کی کہانی تھی۔ جس کا رنگ زمرد جیسا سبز نہیں تو درختوں کے پتوں اور ہریالی جیسا سبز ضرور ہوتا کیونکہ اس میں تحفظ اور سکینت کی ٹھنڈک تھی۔ اور یہ ایک نئی شروعات کی علامت تھی۔

☆☆

قارئین اب گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں

ہماری بہت سی قارئین جو دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں ان کے لیے اکثر و بیشتر پرچوں کا حصول دشوار ہوتا ہے اور موجودہ حالات نے تو اسے مزید دشوار بنا دیا ہے۔ جس کی بناء پر ہماری قارئین کو پرچا حاصل کرنے میں دشواری کا سامنا ہے۔ ان حالات میں آپ کو گھر بیٹھے پرچا مل سکتا ہے۔

ہم آپ کے دروازے پر پرچا پہنچائیں گے اور آپ کو اس کے لیے صرف پرچے کی قیمت ادا کرنا ہوگی۔ کوئی اضافی رقم آپ سے وصول نہیں کی جائے گی۔ پرچے کی پیکنگ اور ڈاک کے اخراجات ادارہ برداشت کرے گا۔ ہمیں درج ذیل رقم بھجوا کر آپ ہر ماہ باقاعدگی سے گھر بیٹھے پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

اگر آپ کو پرچا اندرون ملک نہیں مل پایا ہے تو آپ ایک پرچے کی رقم -/150 روپے بھجوا کر پرچا حاصل کرسکتی ہیں۔

رقم بھجوانے کا آسان ترین طریقہ ایزی پیسہ ہے۔

آپ کسی بھی ایزی پیسہ شاپ، ایزی پیسہ موبائل ایپ یا بنک اکاؤنٹ سے ہمارے اکاؤنٹ نمبر 0317-2266944 میں رقم بھیج کرسکتے ہیں۔

سالانہ خریدار اندرون ملک قارئین کے لیے:

فی ڈائجسٹ -/1800 روپے بھجوائیں

سالانہ خریدار بیرون ملک قارئین کے لیے:

بیرون ملک پاکستانی درج ذیل طریقہ سے رقم بھجوائیں۔

ڈرافٹ بنام "عمران ڈائجسٹ" اکاؤنٹ نمبر 0010000015680030، الائیڈ بینک لمیٹڈ، عیدگاہ برانچ، کراچی، آن لائن کے لیے "PK44ABPA0010000015680030"، کوشش کریں کہ ڈرافٹ یا چیک کراچی کی کسی برانچ کا ہو اگر کراچی کے علاوہ کسی اور شہر کا ہو تو -/500 روپے زیادہ روانہ کریں، کیونکہ دوسرے شہر کا چیک ہونے کی صورت میں بینک -/500 روپے کمیشن کاٹتا ہے۔

فی ڈائجسٹ ایشیا، افریقہ، یورپ -/22000 روپے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا -/25000 روپے۔

کسی بھی معلومات اور آرڈر کے لیے اس واٹس ایپ نمبر 0317-2266944 پر رابطہ کریں

ایجنٹ حضرات اس واٹس ایپ نمبر 03312266944 پر رابطہ کریں

نگہت سیما

ماہِ الفلورا

لاہور کے ذکی دروازے کی سمت بہت شان دار حویلیاں تھیں ان میں سے ایک مرزا جہاں زیب کے دادا مرزا ہمایوں بیگ نے بنوائی تھی۔ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں جدید تقاضوں کے مطابق تبدیلیاں کی گئی تھیں۔

مرزا جہاں زیب اپنے والد کی اکلوتی اولاد تھے اللہ نے انہیں چار بیٹوں اور ایک بیٹی سے نوازا تھا۔

بیٹوں، بیٹی کی شادی ہو چکی تھی۔ اوپر والی منزل میں اورنگ زیب بیگ اور ارباب بیگ رہائش پذیر تھے جب کہ خود جہاں زیب بیگ گراؤنڈ فلور پر دونوں چھوٹے بیٹوں شاہ زیب اور ظفریاب کے ساتھ رہتے تھے۔

اورنگ زیب کی دو بیٹیاں دو بیٹے تھے۔ ارباب بیگ کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں تھیں۔

ظفریاب کا بیٹا آزین اور شاہ زیب بیگ کی بیٹی زل کا نکاح ہو چکا تھا۔

شاہ زیب بیوی کے مرنے کے بعد گوشہ نشین ہو گئے تھے۔ ظفریاب کچھ سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے گرفتار ہو گئے تھے، وہ بہت برا وقت تھا، نہ جانے کیا ہوا کہ ان کی بیوی نے ان کے واپس آنے کے بعد طلاق لے لی۔

ظفریاب دوسری شادی کر کے ملک سے باہر چلے گئے۔

ابرار شاہ ایک بڑے وڈیرے اور سیاست دان کا بیٹا تھا جو صبوحی سے یونی ورسٹی کے زمانے سے محبت کرتا تھا جبکہ وہ شادی شدہ تھا اور اس کے دو بچے تھے۔ ظفریاب سیاسی ہنگاموں میں غائب ہوئے تو صبوحی ان کو تلاش کرتے ابرار شاہ سے ملتی ہیں وہ ظفریاب کی رہائی کے بدلے صبوحی سے شادی کرنا چاہتے تھے وہ راضی ہو جاتی ہیں یوں ظفریاب کی رہائی اور تندرستی کے بعد وہ طلاق لے لیتی ہیں اور ابرار شاہ سے شادی کر کے یو کے چلی جاتی ہیں۔

سمیرا ابرار شاہ کی پہلی بیوی کی بیٹی ہے جو بدلہ لینے کی خواہش میں زین اور زل کے بیچ دراڑیں ڈالتی ہے وجدان کو سمیرا کی یہ حرکتیں ناگوار گزرتی ہیں۔ زل اختر بانو کے پاس نومان کی شادی کے سلسلے میں جاتی ہے۔ منیرہ کے گھر جاتے ہوئے رستے میں زل کو اغوا کر لیا جاتا ہے چراغ سائیں اس کی اطلاع اختر بانو کو دیتے ہیں وہ پہلے ہی دل کے عارضے میں مبتلا ہانپتی کانپتی ڈیرے پر آتی ہیں اور جذبات میں شایان کا سچ نکل جاتا ہے کہ وہ ان کا خون ہے۔ شایان اور زل کے لیے یہ انکشاف حیران کن تھا۔ شایان ثمرہ سے اس بابت پوچھ گچھ کرتا ہے اور وہ خوب روتی چلاتی ہے۔ چراغ سائیں کا انتقال ہو جاتا ہے حویلی سے اس کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے۔

زل کو لینے مرتضیٰ آتا ہے شاہ زیب بیگ نارمل ہو رہے ہیں۔

اقبال بارہ سال ترکی کی جیل کاٹ کر پاکستان لوٹتا ہے اسے یاد آتا ہے کہ اس نے کس طرح ماسٹر عبدالعزیز، زیب النساء اور اس کے شوہر کے بیچ جھوٹ بول کر دوری کروائی اسے یقین ہے کہ زیب النساء کی زندگی خراب کرنے کی اسے سزا مل رہی ہے۔

زین جو اپنی ماں صبوحی سے ناراض تھا، اس کا سچ ابرار شاہ اسے بتاتا ہے۔ زین تمام تر بہکاوں کے باوجود زل سے اپنے دل کی بات کرنے کا ارادہ کر لیتا ہے کہ اسے زل کے نام وجدان کا محبت نامہ مل جاتا ہے اور وہ ہمیشہ

مکمل ناول

کے لیے باہر جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ شانزہ کو عقیل نے طلاق دینے سے انکار کر دیا۔ سمیرا زل سے ملنے آتی ہے اور اسے وجدان کی ناراضی کا بتاتی ہے زل اسے سنبھالتی ہے۔ آزین کے سارے دوست اس کے جانے کی وجہ جاننا چاہتے ہیں لیکن ہزار بدگمانیوں کے باوجود وہ زل اور اپنے رشتے کی نفی نہیں کرتا۔

زیب النساء کی سہیلی زیتون اختر بانو کے پاس اس کا نکاح نامہ اور تصویر لے جاتی ہے اختر بانو ششدر رہیں۔

بائیسویں قسط

''وہ آئی۔سی۔یو کے باہر بیٹھی تھی۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے ہوئے تھے۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ پتا نہیں اسے وہاں بیٹھے کتنی دیر ہوگئی تھی۔ اسے وقت کا کچھ احساس نہیں تھا۔ کچھ دیر پہلے ہی اسے آپریشن تھیٹر سے نکال کر۔ آئی سی۔ یو میں لے جایا گیا تھا۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے وہ آپریشن تھیٹر میں رہا تھا اور اب بھی اس کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے نگاہ اٹھا کر ادھر ادھر دیکھا اس کے خاندان کے سب ہی افراد ادھر ادھر موجود تھے۔ کوئی بیٹھا تھا کوئی کھڑا تھا سب کے چہرے ستے ہوئے تھے۔ آنکھیں سوجی ہوئی اور لبوں پر دعائیں تھیں۔

یہ وہ ہی تھی جس نے ایمبولینس آتے ہی اس کے گھر فون کیا تھا...... فون وجدان کے چچا نے اٹھایا تھا۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''انہوں نے وجدان کو گولیاں ماردیں۔ ادھر پریس کلب کے سامنے۔''

وہ کیا کہہ رہے تھے اس نے کچھ سنا ہی نہیں۔ فون بند کر کے وہ لوگوں کو اسے اٹھا کر ایمبولینس میں ڈالتے دیکھ کر تیزی سے ایمبولینس کی طرف بڑھی تھی۔ ہینڈ بیگ میں اس کا فون وقفے وقفے سے بج رہا تھا۔ پاس بیٹھی ایک خاتون نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''بیٹا تمہارا فون بج رہا ہے شاید کسی نے ضروری بات کرنی ہو۔

''ہاں''

اس نے چونک کر انہیں دیکھا اور فون نکال کر دیکھا۔ حمیرا کی دس بارہ مس کالز تھیں۔ ابھی فون اس کے ہاتھ میں ہی تھا کہ پھر بیل ہونے لگی۔

''ہاں میری۔''

اس کی آواز بھرائی ہوئی اور بھاری تھی۔

''تم کہاں ہو سمو۔ ٹی وی۔ پر خبر چل رہی ہے کہ وجدان احمد کو کسی نے گولی ماردی ہے۔''

حمیرا اسے بتارہی تھی۔

''ہاں میرے سامنے میری آنکھوں کے سامنے۔ وہ روڈ کراس کر کے اپنی گاڑی کی طرف جارہا تھا کہ۔''

وہ خاموش ہوگئی تھی۔ لیکن کافی دیر سے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلے تھے۔

''سمو، سمیرا کہاں ہو تم ٹھیک ہونا۔ تمہیں تو۔''

حمیرا بے چینی سے پوچھ رہی تھی۔

''مجھے کچھ نہیں ہوا...... مرنا تو مجھے چاہیے تھا میری لیکن وہ مررہا ہے۔''

اس کی بات بمشکل حمیرا کی سمجھ میں آئی تھی۔

''تم وہاں ہو ہاسپٹل میں۔''

''ہاں۔''

''تم وہاں کیا کررہی ہو۔ فوراً گھر آؤ۔''

مما نے شاید حمیرا کے ہاتھ سے فون لے لیا تھا لیکن اس نے جواب دینے کے بجائے پاور آف کر کے فون بیگ میں ڈال دیا۔

''دعا کرو بیٹا اللہ دل سے نکلی دعا ضرور سنتا ہے۔''

خاتون تاسف سے اسے دیکھتی ہوئی چلی گئیں۔

''یہ مکافات عمل ہے سمیرا۔ تم نے جو بویا ہے اسے ہی کاٹنا ہے۔''

''وجدان کی آواز اس کے کانوں میں گونجی تو اس نے تیزی سے نفی میں سر ہلایا۔

''نہیں...... غلطی میری ہے نا تو پھر مجھے ہی سزا ملنی چاہیے۔ اسے کیوں...... یا اللہ اسے کچھ نہ ہو۔'' وہ آنکھیں بند کیے دعا مانگ رہی تھی جب کسی نے اسے آواز دی۔

''سمیرا...... بیٹا''

اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں وجدان کے چچا جو اس کے چاچو سے زیادہ اس کے ہمراز اس کے

دوست تھے۔ بھیگی پلکوں کے ساتھ...... اسے دیکھ رہے تھے۔

وہ یک دم کھڑی ہو گئی۔

"وہ...... وہ ٹھیک ہے نا۔"

"ابھی کچھ کہہ نہیں سکتے...... ڈاکٹر کہتے ہیں اگلے اڑتالیس گھنٹے خطرناک ہیں۔"

ان کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں شاید بہت زیادہ روئے تھے...... جب سے وہ لوگ آئے تھے پہلی بار وہ اس سے بات کر رہے تھے۔

"جب اسے گولی لگی تم ساتھ تھیں۔ کون لوگ تھے وہ۔"

"میں پارک سے نکل رہی تھی اور وہ روڈ کراس کر کے پارکنگ کی طرف جا رہا تھا۔ وہ ایک ہیوی بائیک تھی جس پر دو لڑکے تھے میں نے ان کی شکل نہیں دیکھی۔" اس نے اپنے پڑی زدہ ہونٹوں پر زبان پھیری۔

"مجھے اخبار کے دفتر سے پتا چلا تھا کہ کسی نے اسے یہاں ملنے کے لیے بلوایا تھا۔ مجھے اس سے کوئی کام تھا میں اس سے ملنے کے لیے گئی تھی۔"

اس نے حلق میں اکٹھے ہونے والے آنسوؤں کو نیچے اتارا۔

"کس شخص سے ملنے آیا تھا وہ۔"

وہ بڑے حوصلے سے پوچھ رہے تھے۔

"پتا نہیں شاید وہاں آفس میں کسی کو علم ہو۔"

تب ہی حمیرا تیز تیز چلتی ادھر ادھر دیکھتی ہوئی اس کے قریب آئی تھی۔

"سمیرا اٹھو گھر چلو۔ مما کہہ رہی ہیں اخبار اور میڈیا کے لوگ ادھر ادھر گھوم رہے ہیں۔ مما نے کہا ہے تمہیں وہاں سے ہٹاؤں ادھر باہر کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ روڈ پر ایک لڑکی بھی اس کے ساتھ...... وہ یقیناً تم ہی ہو گی۔"

اس کی نظر اس کے خون آلود کپڑوں پر تھی۔

"پولیس کا کوئی نہ کوئی بندہ جلد ہی تم سے بیان لینے آ جائے گا، دادا جان بہت خفا ہوں گے جب انہیں پتا چلے گا۔ پلیز چلو گھر۔"

"نہیں میری میں نہیں جاؤں گی کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ......"

"نہیں......"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"لوگ باتیں کریں گے کہ طاہر شاہ کی پوتی اور سید ابرار شاہ کی بیٹی یہاں کیا کر رہی ہے۔ تم یہاں رہ کر اپنا کیس خراب کرو گی۔ دادا جان اگر اڑ گئے تو وہ کبھی بھی تمہاری شادی وجدان سے نہیں کریں گے۔"

حمیرا بے حد پریشان تھی۔

"یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ بیٹی آپ ان کے ساتھ گھر جاؤ۔ میں آپ کو صورت حال بتا دوں گا۔ آپ گھر جا کر کپڑے تبدیل کریں۔ اللہ سے دعا کریں۔ ان شاء اللہ ہمارے وجدان کو کچھ نہیں ہو گا۔"

وجدان کے چچا دونوں کی گفتگو سن رہے تھے۔

اس نے شاکی نظروں سے انہیں دیکھا اور نفی میں سر ہلایا اور حمیرا کی طرف دیکھا۔

"یہ وجدان کے چچا ہیں۔"

"انکل آپ اسے سمجھائیں پلیز۔ اس وقت میرے ساتھ چلے۔ مما کو ڈپریشن ہو رہا ہے۔ رات کو ایک چکر لگا لیں گے...... یا پھر کل صبح آ جائیں گے۔"

حمیرا اب وجدان کے چچا سے بات کر رہی تھی۔

"کیا آپ میری بات بھی نہیں مانیں گے۔ وجدان نے کبھی میری کسی بات سے انکار نہیں کیا تھا۔"

وجدان کے چچا جانتے تھے کہ بیان تو اس کا لیا ہی جائے گا کہ وہاں موجود کئی لوگوں نے دیکھا تھا کہ ایک لڑکی روڈ پر وجدان احمد کا سر گود میں لیے بیٹھی چیخ رہی تھی۔ لیکن وہ بھی چاہتے تھے کہ اس وقت جب اتنا ہجوم ہے وہ کسی اخبار والے کی نظر میں نہ آئے۔

"اور تم بھی انکار نہیں کرو گی شاباش۔"

اس نے بے بسی سے ان کی طرف دیکھا اور حمیرا کے ساتھ چلنے لگی...... وجدان کے چچا اب واپس اپنے لوگوں کی طرف جا رہے تھے۔

"تمہاری گاڑی کہاں ہے۔"

حمیرا پوچھ رہی تھی۔ وہ جو پیچھے مڑ مڑ کر دیکھ رہی تھی چونکی۔

''وہاں ہی پریس کلب کی پارکنگ میں۔''
''ڈرائیور کو بھیج کر منگوالیں گے۔''
حمیرا نے اب اس کا ہاتھ تھام لیا تھا وہ سمجھ رہی تھی کہ اس وقت اسے سہارے کی ضرورت ہے۔ وہ کس تکلیف اور اذیت سے گزر رہی ہے۔ اس کا اندازہ تھا اسے کہ وہ محبت کے درد سے آشنا تھی...... اور گھر تک وہ اسے تسلی دیتی آئی تھی۔ اور تقریباً ساری رات ہی جب اس کی آنکھ کھلتی اسے جائے نماز پر رو رو کر دعائیں مانگتے دیکھ کر وہ اسے تسلی دیتی رہی کہ وہ اسے زبردستی اپنے کمرے ہی لے گئی تھی اور مما کے سختی سے منع کرنے کے باوجود سمیرا ہر روز ناشتے کے بعد ہاسپٹل پہنچ جاتی اور دیر تک وزیٹرز روم میں بیٹھی رہتی۔ آتے جاتے ہوئے وجدان کے چاچو اسے حوصلہ اور تسلی دیتے رہتے اور یہ ساتواں دن تھا جب چاچو اس کے پاس آئے تھے۔

''وہ اب بہت بہتر ہے۔ تم چاہو تو اندر جا کر مل لو۔ اس وقت بھابھی اور بھائی جان گھر پر ہیں۔ کچھ دیر تک آئیں گے۔''

اور وہ ہولے ہولے ان کے ساتھ چلتی ہوئی اس کے کمرے تک آئی تھی کہ تین روز پہلے ہی اسے روم میں شفٹ کیا گیا تھا۔

ورنہ پہلے تو کبھی سی۔ سی۔ یو اور کبھی آئی۔ سی۔ یو میں ہی تھا چاچو اسے کمرے کے دروازے تک پہنچا کر چلے گئے تھے۔ وہ دستک دے کر اندر آئی تو وہ دروازے کی طرف ہی دیکھ رہا تھا اسے دیکھ کر پہلے آنکھیں بند کر لیں پھر رخ دیوار کی طرف کر لیا۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ اس کے چہرے پر اگرچہ اب ''بھی زردیاں پھیلی تھیں لیکن آنکھوں میں وہی زندگی سے بھرپور چمک تھی۔

''یا اللہ تیرا شکر ہے۔''

بے اختیار اس کے لبوں سے نکلا اور وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی اس کے بیڈ کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

''سوری وجدان ہر اس بات کے لیے جو میں نے کی...... میں تسلیم کرتی ہوں میں نے غلط کیا۔ بہت برا کیا۔ میں معافی مانگ لوں گی۔ زل سے۔ آزین سے...... سب بتادوں گی جو میں نے کیا۔ تم جو کہو گے ویسا ہی کروں گی۔ مجھ سے ناراض مت ہو خفا مت ہو۔ جانتے ہونا تمہاری ناراضی میری جان لے لے گی۔ پتا ہے میں تو تمہیں یہ بھی بتا ہی نہیں سکی کہ ڈیڈ نے میری شادی کا مسئلہ بھی حل کر دیا ہے...... انہوں نے میری سے وعدہ کیا ہے کہ پہلے وہ اچھی طرح سیٹل کریں گے اور پھر چھ ماہ بعد اس کی رخصتی کر دیں گے آ کر۔ میں نے انہیں تمہارے متعلق بھی بتا دیا تھا۔''

وہ ہولے ہولے بول رہی تھی لیکن وجدان احمد نے پلٹ کر اس کی طرف نہیں دیکھا تھا۔ وہ یقیناً بہت زیادہ خفا تھا لیکن اسے یقین تھا کہ وہ زیادہ دن اس سے خفا نہیں رہ سکتا...... وہ بہت جلد اسے منا لے گی۔

وہ پر یقین تھی۔

پر امید تھی...... چند لمحے یوں ہی اس کے بیڈ کے پاس خاموش کھڑے رہنے کے بعد وہ ہولے ہولے چلتی ہوئی دروازے تک آئی۔ اور دروازہ کھولتے ہوئے غیر ارادی طور پر مڑ کر پیچھے دیکھا وہ اس کی طرف ہی دیکھ رہا تھا۔ بے اختیار مسکراہٹ کو چھپاتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی اس یقین کے ساتھ کہ وجدان احمد اس سے محبت کرتا ہے۔ اور محبت کرنے والے زیادہ عرصہ ایک دوسرے سے ناراض نہیں رہ سکتے۔

☆☆☆

زل دوپٹے کے پلو سے چہرہ پونچھتے ہوئے کچن سے باہر نکلی سحرش تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہوئی نظر آئی تو وہ وہاں برآمدے میں رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

''خیریت ہے نا۔''

''ہاں خیریت ہے۔''

وہ تخت پر بیٹھ گئی۔

''بس پڑھتے پڑھتے ایک نادر خیال آیا اور اس خیال کا ہنڈرڈ پرسنٹ تعلق تم سے تھا۔ تو بس فوراً نیچے بھاگی۔''

لیکن یہاں کیوں بیٹھ گئی ہو یہاں تو تپش ہے اندر کمرے میں چلو۔ زل کی پیشانی پر اب بھی پسینے

کے قطرے جھلملا رہے تھے۔

"ہاں چلو۔"

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ہاں۔اب بتاؤ کون سا نادر خیال آیا ہے تمہیں کہ بھری دوپہر میں بھاگی چلی آئی ہو۔"

زل نے کمرے میں آکر پنکھا آن کیا۔

"خیال تو نادر ہی ہے اب تم اس سے متفق ہوتی ہو یا نہیں۔" وہ جوتے اتار کر بیڈ پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

"میرا تم سے متفق ہونا ضروری نہیں تم اپنے خیال سے مستفید کرو۔" زل بھی کرسی پر بیٹھ گئی تھی۔

"ویسے ملی یہ نادر خیالات اس وقت ہی ذہن میں کیوں آتے ہیں جب کورس کی کتابیں سامنے کھلی ہوں۔" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی۔

"یہ تو ہے۔"

زل مدھم سا مسکرائی۔

"ویسے اس نادر خیال کا تعلق امان سے تو نہیں۔"

"ہوں پہلے تو اسی کا خیال آیا اور پھر اس خیال سے جو خیال آیا وہ تم سے جڑا تھا۔ویسے سوچو تو یہ مانی کتنا گھنا ہے بھی ہوا تک نہیں لگنے دی کہ ایسا کچھ سوچ رہا ہے۔یعنی......"

اس نے انگلی پر دوپٹا لپیٹتے ہوئے شرمانے کی ایکٹنگ کی۔

"ہوسکتا ہے یہ خیال پھپھو کا ہو خالص اپنا۔"

زل کے لبوں پر دلکش سی مسکراہٹ آکر ٹھہر گئی۔

سحرش اس حبس موسم میں اس کے لیے خوش گوار ہوا کے جھونکے جیسے تھی وہ آتی تو کچھ دیر کے لیے وہ اپنی تکلیف بھول جاتی تھی۔ سترہ دن پورے سترہ دن ہوگئے تھے۔زین کو یہاں سے گئے لیکن ایک بار ایک بار بھی اس نے زل سے بات نہیں کی تھی۔بی بی اماں اور دادا جان سے بھی صرف دو بار ہی بات کی تھی۔اس روز وہ دادا جان کے کمرے میں ہی تھی جب زین کا فون آیا تھا اور دادا جان نے بات کر کے ریسیور اس کی طرف بڑھا دیا تھا۔

"یہ لو زین بیٹا! زل سے بات کرلو۔"

لیکن جب اس نے ریسیور کان سے لگایا تو ایر پیس سے ٹوں ٹوں کی آواز آرہی تھی۔

"شاید کال کٹ گئی ہے دادا جان۔"

اس نے ریسیور کریڈل پر ڈال دیا اور فوراً ہی دادا جان کے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔

"میرا دل توڑ کر اب کن سوچوں میں کھوگئی ہو۔"

سحرش اسے ہی دیکھ رہی تھی۔

"میں نے کب تمہارا دل توڑا۔"

زل حیران ہوئی۔

"ابھی......ابھی......"

وہ بے حد اطمینان سے بولی تھی۔

"جب سے پھپھو نے مہرو کی رخصتی کے ساتھ دادا جان اور ابا جان سے میرے اور امان کے رشتے کی بات کی ہے تب سے میں ہواؤں میں اڑ رہی ہوں کہ لو بھئی سحرش ارباب تمہیں بھی کسی نے چنا اور اپنے دل میں جگہ دے کر تمہارا ہاتھ مانگا ورنہ بقول اماں کے نہ منہ نہ متھا تے جن پہاڑوں لتھا مطلب کہ نہ تو میری شکل وصورت اچھی ہے اوپر سے میری گز بھر لمبی زبان مجھے کسی نے نہیں پوچھنا تھا اور جب پھپھو نے میرے رشتے کی بات کی تو میں تو خوابوں اور خیالوں میں بہت اونچا اڑنے لگی تھی۔لیکن تم نے میرے خوابوں کے سارے محل دھڑام سے گرادیے۔"

اختر بانو کا ارادہ تو لاہور آکر ہی شادی کی بات کرنے کا تھا اور انہوں نے سوچ لیا تھا کہ ریحان کے آنے کے دو تین دن بعد لاہور جائیں گے لیکن ثوبان شاہ نے کہا۔"گھر کی بات ہے ابا جان اور اورنگ زیب بھائی سے فون پر ہی بات کرلو۔بس ایک بار ہی بارات لے کر چلے جائیں گے کہ ریحان صرف سات ہفتے کے لیے آیا ہے۔لاہور آنے جانے میں وقت ضائع ہوگا۔شاپنگ بھی تو کرنی ہوگی نا تمہیں جیولری دلہن اور دولہا کا ڈریس وغیرہ تو بہرحال لینا ہی ہے۔اور انہیں ثوبان شاہ کی بات صحیح لگی تھی۔اور فون پر ہی تاریخ وغیرہ طے کرلی گئی تھی اور امان سے پوچھ کر اور ثوبان شاہ کی مرضی سے امان اور سحرش کے رشتے کی بات بھی کرلی تھی۔طے یہ ہوا

تھا کہ وہ دو تین دن پہلے آجائیں گی۔
"بکومت۔"
زل نے اسے گھورا۔
"پھپھو نے اماں کی مرضی پوچھے بغیر تو بات نہیں کی ہوگی۔ اللہ کی بندی اس کی پوری رضامندی شامل ہوگی۔"
"تھینک یو ڈیر! تم نے میرے زخمی دل پر مرہم رکھ دیا۔ ویسے مجھے کچھ اندازہ تو تھا آخری ملاقات پر حضرت مجھے کچھ پسندیدہ پسندیدہ سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔"
"اور تم۔"
زل نے زین کے خیال کو جھٹکا۔
"مجھے بھی اچھا ہی لگا تھا۔ مطلب جب جب امان سے ملاقات ہوئی وہ مجھے بہت مختلف اور اچھا لگا لیکن میں نے دل کو جھڑک دیا کہ خبردار! اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب پھپھو نے مہرو کو مانگ لیا ہے تو اس لیے نا کہ وہ ڈاکٹر ہے اور میں بھلا کیا ہوں تو بس میں نے دل کو ذرا قابو میں ہی رکھا ورنہ۔"
اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا اور رخساروں پر شفق سی بکھر گئی۔ لبوں پر مدھم سی مسکراہٹ تھی اور آنکھوں میں شوخ سی چمک۔
"اللہ کرے تمہارے ہونٹوں کی مسکراہٹ اور آنکھوں کی چمک ہمیشہ قائم رہے۔"
زل نے بے اختیار دعا دی۔
"تم بہت اچھی ہو ملی۔"
سحرش کے لبوں سے بے اختیار نکلا۔
"تم بھی بہت اچھی ہو سحری۔"
زل مسکرائی۔
"نہیں یار میں اتنی اچھی نہیں ہوں۔"
سحرش نادم سی ہوئی تھی۔
"پتا ہے میں نا کچھ کچھ تم سے جیلس ہوتی تھی۔ جب تم اور زین سیڑھیوں پر بیٹھے ہوتے تو میں مہرو سے کہتی تھی دیکھو نا خاندان کا سب سے شاندار لڑکا اسے مل گیا ہے۔ یہ ملی بھی کتنی لکی ہے نا اور تب مہرو کہتی تھی وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے ہی بنے ہیں اور ہم اس سے زیادہ لکی ہیں۔ اللہ ہمارے والدین کو سلامت رکھے۔ اس کے ابا بیمار ہیں۔ اماں نہیں ہیں۔ یہ جو مہرین ہے نا۔ اس میں کچھ کچھ تمہاری عادات کا تڑکا لگا ہوا ہے۔ لیکن میں اس کی بات پر زیادہ دھیان نہیں دیتی تھی اور تم سے تھوڑی تھوڑی سی جیلس ہوتی رہتی تھی دل ہی دل میں اور سوچتی تھی کہ دادا جان نے ہمارے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ خیر اب تو میں تم سے ذرا سی بھی جیلس نہیں ہوتی۔ دراصل تب میں ذرا بچی بچی سی تھی۔ تھوڑی سی نا سمجھ۔ اماں کی باتیں اور خیالات میرے اندر کھلبلی مچائے رکھتے تھے۔
ارے کہیں تمہیں میری نظر ہی تو نہیں لگ گئی۔ ایسا کرنا آج بی بی اماں سے دم کروا لینا۔ بلکہ میں بھی بی بی اماں سے کہوں گی مجھے بھی دم کر دیں۔ کہیں مجھے بھی کسی کی نظر نہ لگ جائے۔ آخر مستقبل میں جاگیردارنی بننے جا رہی ہوں۔" اس نے شرمانے کی ایکٹنگ کی۔
"یہ بڑی سی حویلی۔ آگے پیچھے ملازمائیں۔ اور سحرش ارباب نظر لگنا تو بنتا ہے نا۔"
"تم بھی نا سحرش۔"
زل ہنس پڑی۔
"نہیں بھئی کیا ملی...... میں سنجیدہ ہوں تمہیں اور زین کو ضرور میری ہی نظر لگ گئی ہے۔ کل جب تم سیڑھیوں پر اکیلی اداس سی بیٹھی تھیں۔ میرے دل میں خیال آیا تھا کہ ضرور تمہیں میری نظر لگ گئی ہے۔ کتنے اچھے لگتے تھے نا تم دونوں ساتھ بیٹھے ہوئے اور مہرو کہتی تھی نظر نہ لگا دینا اور دیکھو تمہیں میری نظر لگ گئی۔"
وہ افسردہ سی ہوگئی تو زل کے اندر بھی اداسی کا غبار سا پھیل گیا۔ سیڑھیوں پر بیٹھ کر زین سے باتیں کرتی کئی شامیں آنکھوں کے سامنے آگئیں۔ آ زین کم گو تھا اور اظہار کے معاملے میں تو بہت ہی کنجوس۔ لیکن جب کبھی اظہار کرتا تو مالا مال کر دیتا تھا۔ وہ ہفتوں سرشار رہتی تھی۔
"ارے ہاں یہ کل تم کہاں گئی تھیں۔"

سحرش کو اچانک یاد آیا تھا وہ یوں ہی مشرق کی باتیں کرتے کرتے مغرب کی بات کرنے لگتی تھی۔

''کل...... میں یہ نابینا بچوں کے اسکول گئی تھی جاب کے سلسلے میں۔''

زل نے شکر کیا کہ سحرش نے موضوع بدل دیا تھا ورنہ جانے کتنی دیر تک زین کا ذکر کرتی رہتی اور اسے اپنا درد چھپانا مشکل ہو جاتا۔

''میں جس ٹیچر کی جگہ جاب کر رہی تھی اس کی والدہ کی ڈیتھ ہو گئی تھی اس لیے وہ واپس آ گئی اور نئے ٹیچرز وہ گرمیوں کی چھٹیوں کے بعد ہی رکھیں گے۔ دور نہیں میں جاب نہیں کرنا چاہتی تھی سوچا ادھر ہی جاب کر لوں۔ اور انہوں نے کہا ہے بے شک کل ہی آ جائیں۔ پہلے وہ ٹریننگ دیں گے دس پندرہ دن۔ بریل بھی سیکھنا ہو گا...... آج دادا جان سے بات کروں گی اگر انہوں نے اجازت دے دی تو۔''

''لیکن ملی میں نے تمہیں اور شانزہ کو مشورہ دیا تھا کہ تم پہلے ایم فل کر لو۔ پھر پی۔ ایچ۔ ڈی کرو۔ اور اپنے نام کے ساتھ لگاؤ...... ڈاکٹر زل شاہ زیب اور ڈاکٹر شانزہ اورنگ زیب صرف ڈاکٹر لگانے سے اچھی خاصی بھاری بھرکم شخصیت ہو جائے گی تمہاری لیکن تم دونوں نا بس انتہائی بے وقوف ہو۔

جاب کرنا کوئی تمہاری مجبوری تو نہیں ہے نہ ہی شانزہ کی...... پہلی طلاق کا نوٹس آ گیا ہے اس کا تایا جان نے کسی بڑے تگڑے بندے سے دباؤ ڈلوایا ہے۔ تب کہیں جا کر عقیل اکڑو مانا ہے۔ تو جیسے ہی شانزہ کا طلاق کا پراسس مکمل ہوتا ہے اور عدت کے بعد تم دونوں بس پھر سے پڑھائی شروع کر دو۔''

زل نے اس کی تفصیلی بات دھیان سے سنی تھی۔ بے شک جاب اس کی مجبوری نہیں تھی لیکن دل کے بہلانے کا بھی تو کچھ سامان کرنا تھا نا اسے اور پڑھائی کا فی الحال اس کا موڈ نہیں تھا۔

''خیر تمہاری مرضی۔''

سحرش اسے خاموش دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میں ذرا دادا جان کو سلام کر لوں پھر اوپر جاؤں اماں نے تو سچ مچ جوتے لگانے ہیں مجھے۔''

''دادا جان تو وجدان کے گھر گئے ہیں بتا رہے تھے کہ کل وہ گھر شفٹ ہو گئے ہیں۔ ایک بار ہا سپٹل بھی گئے تھے۔ کہہ رہے تھے کہ ایسے لوگوں کو مرنا نہیں چاہیے۔ ان ہی جیسے محب وطن اور مخلص لوگوں کی وجہ سے یہ وطن قائم ہے۔'' زل بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ویسے یہ تائی اماں نے بطور خاص تمہیں ہی کیوں جوتے لگانے ہیں۔ کیا منع کرتی ہیں اب بھی نیچے آنے سے۔''

''بالکل بھی نہیں اور سحرش کو بھلا کون منع کر سکتا ہے۔ وہ تو انہوں نے مجھے کہا تھا کہ پھپھو کے سسرالیوں کو جو جوڑے وغیرہ دینے ہیں وہ پیک کر دوں حالانکہ پھپھو نے تو بہت سختی سے منع کیا ہے۔ مہرین کے لیے بھی صرف اٹھ دس جوڑے ہی بنانے کو کہا ہے جو وہاں کے موسم میں کام آ سکیں۔ بس بارات کا جوڑا ہے کام والا، ویسے مہندی کے جوڑے پھپھو نے کراچی سے نے لیے ہیں...... اور باقی کی شاپنگ وہ کہہ رہی تھیں ریحان کے ساتھ کراچی جا کر مہرین خود کر لے گی۔

جب کہ انہیں علم نہیں ہے کہ اس کو کپڑے وغیرہ خریدنے کی سوجھ بوجھ نہیں ہے وہ تو اپنے مخصوص ٹراؤزر اور شرٹ میں ہی دلہن بن جائے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہی تھی کہ میں نے اماں سے کہا کہ بس یہ ذرا سا پڑھ لوں اور پھر پھر کیا ہوا تھا کہ مجھے وہ نادر خیال سوجھ گیا جو تمہیں بتانے کے لیے نیچے بھاگی اور بس یہاں ہی چپک کر رہ گئی۔''

''اور وہ نادر خیال ابھی تک تم نے بتایا نہیں۔''

زل ذرا سی متجسس ہوئی۔

''ہاں وہ...... دراصل مجھے خیال آیا تھا کہ میری اماں کوئی بڑی پہنچی ہوئی ہستی ہیں...... دیکھو دن رات وہ کسی فل ٹائم ملازمہ کے لیے دعا کر رہی تھیں اللہ نے گل بکاؤلی کو بھیج دیا۔ اور پھر شانزہ کے رشتے کے بعد تڑپ رہی تھیں کہ میرا ابھی کسی وزیر شزیر کسی جاگیردار کے گھر رشتہ ہو جائے تو اب دیکھ لو کیسے پھپھو

نے اپنے شہزادوں جیسے بیٹے کے لیے مجھے مانگ لیا۔ تو مجھے خیال آیا کہ تم بھی میری اماں سے دعا کروالو کہ اللہ زین کو عقل دے اور وہ جلد ہی آ کر تمہاری رخصتی کروالے۔" وہ نچلے ہونٹ کا دایاں کونا دانتوں تلے دبائے شرارت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بیعت نہ کرلوں تمہاری اماں کے ہاتھ پر۔"

زل نے اس کے ساتھ ہی کمرے سے باہر قدم رکھا۔

"قسم سے یار کرلو بیعت پھر دن رات تمہارے لیے ہی دعائیں کریں گی۔"

وہ شرارت سے ہنستی ہوئی سیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ زل کچھ دیر برآمدے میں کھڑی اسے جاتا دیکھتی رہی۔ پھر تخت پر پڑے زیب النساء مخفی کے دیوان کی طرف دیکھا جسے کل جلد لگا کر اس نے یہاں رکھ کر اوپر ہاون دستہ رکھ دیا تھا۔ ہاون دستہ اٹھا کر اس نے دیوان اٹھالیا اور الٹ پلٹ کر دیکھا۔

"ٹھیک ہی ہو گیا ہے۔ رکھ دیتی ہوں۔" وہ جہاں زیب بیگ کی اسٹڈی کی طرف جاتے جاتے رک گئی پہلے دیکھ لوں ابا سو رہے ہیں یا جاگ رہے ہیں۔ آج کل انہیں دوا کھانے کے بعد بھی نیند نہیں آتی تھی۔ شیخو بابا سے کہوں گی کہ کسی روز ڈاکٹر ارسلان کو ابا کی اس حالت کے بارے میں جا کر بتائیں، زخم تو ان کا اب تک ٹھیک ہو گیا ہے بس ذرا سا نشان ہی رہ گیا ہے لیکن کیل کچھ اس طرح لگی تھی کہ بہت خون بہا تھا ان کا اور وہ بے حد گھبرا گئی تھی۔ وہ دیوان اٹھائے شاہ زیب بیگ کے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ اس نے دستک دی تو شاہ زیب بیگ نے جواب دیا۔

"آجاؤ۔" وہ دروازہ کھول کر اندر آئی تو سامنے ہی شیلف کے پاس شاہ زیب کھڑے تھے۔

"السلام علیکم ابا۔"

اس نے سلام کیا تو انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔

"میں سمجھا شہزادہ ہوگا۔ کتنی دیر ہو گئی ہے آیا ہی نہیں۔ میں اس کا انتظار کر رہا تھا۔"

"شیخو بابا تو دکان کا کام کروا رہے ہیں۔ آتے ہی ہوں گے۔" ظفریاب کے اصرار پر ایک دکان شیخو بابا کے لیے خالی کروالی گئی تھی۔ اور اس میں پینٹ وغیرہ ہو رہا تھا۔ ظفریاب چاہتے تھے کہ وہ نوکری چھوڑ کر اپنا کام شروع کردیں۔ کپڑے کا الیکٹرانک کا یا جس میں بھی انہیں دلچسپی ہو۔ ظفریاب کو اس بات کا بہت افسوس تھا کہ ان سے کوتاہی ہوئی اور انہوں نے اس کی تعلیم کی طرف توجہ نہیں دی۔

"اچھا"

انہوں نے ہاتھ میں پکڑا ہوا فریم شیلف پر رکھا اور ہولے ہولے چلتے ہوئے بیڈ پر آ کر بیٹھ گئے۔

"آپ اپنی اور اماں کی شادی والی تصویر دیکھ رہے تھے۔" وہ بھی روم چیئر پر بیٹھ گئی تھی۔

"یہ ولیمے کی تصویر ہے یا بارات والے دن کی۔"

"یہ ولیمے والے دن کی ہے۔ مریم نے بارات والا ہی جوڑا پہن رکھا ہے۔"

انہوں نے شیلف کی طرف دیکھا اور پھر نظر اس کے ہاتھ پر پڑی اس نے دیوان مخفی ابھی تک ہاتھ میں پکڑا ہوا تھا۔

"یہ کون سی کتاب اٹھا رکھی ہے تم نے اباجان کی طرح تمہیں بھی کتابوں سے بہت محبت ہے۔"

"جی یہ زیب النساء مخفی کا دیوان ہے بہت بوسیدہ ہو رہا تھا میں نے یہ جلد لگادی اس کی۔" وہ مسکرائی اور کتاب ان کی طرف بڑھائی۔

"آپ پڑھیں گے کیا فارسی آتی ہے آپ کو۔ بہت خوب صورت شاعری ہے۔" شاہ زیب بیگ نے دیوان مخفی لینے کے لیے ہاتھ آگے نہیں بڑھایا تھا۔ وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ وہ اسے اردگرد سے کچھ بیگانہ سے لگے۔

"کیا ہوا ابا...... میں پڑھ کر سناؤں۔" اس نے یوں ہی درمیان سے کھولا۔

"بگوائے عاشق صادق چرا گل دستہ آوردی۔"

(اے سچے عاشق بتا کہ تم یہ پھولوں کو باندھ کر کیوں لائے ہو)

شاہ زیب نے جواب دینے کے بجائے اس کے

ہاتھ سے دیوان جھپٹ لیا۔ اور سرورق کو دیکھتے ہوئے بار بار دہرانے لگے۔ ''زیب النساء...... زیب النساء۔

وہ حیران سی انہیں دیکھ رہی تھی جو زیب النساء نام پر انگلی پھیر رہے تھے۔

''کیا ہوا ابا۔ آپ ٹھیک ہیں نا۔''

''یہ...... یہ زیب النساء کون تھی۔ میں نے پہلے بھی اس کا نام سن رکھا ہے؟'' اب وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔

''شہزادی تھی ابا...... مغل شہزادی۔ شاعرہ تھی۔''

شہزادی...... ہاں شہزادی۔'' ان کے لبوں پر بہت خوب صورت سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ ''اور اس شہزادی کا نام تھا زیب النساء...... کتنا خوب صورت نام ہے...... ہے نا...... وہ بھی تو بہت خوب صورت تھی۔ اپنے نام کی طرح شہزادیوں جیسی۔''

انہوں نے زیر لب کہا اور ایک خوب صورت منظر نے ان کے ذہن و دل کو اپنی گرفت میں لے لیا۔ دو جادوگر آنکھیں ان کی طرف اٹھی ہوئی تھیں اور ہاتھوں میں پانی کا پیالہ تھا۔ لبالب بھرے پیالے سے پانی ان کے ہاتھوں کی اوک پر گر رہا تھا اور انگلیوں کے درمیان سے قطرہ قطرہ نیچے گر رہا تھا۔ اور ان جادوگر آنکھوں نے ان پر سحر طاری کر دی تھی۔ وہ مبہوت سے اسے دیکھ رہے تھے۔

''یہ شہزادی پتا نہیں کون ہے۔'' سرگوشی کی طرح ان کے لبوں سے نکلا۔

''مغل شہزادی...... اورنگ زیب عالمگیر کی بیٹی۔'' زل کے لبوں سے بے اختیار نکلا لیکن انہوں نے جیسے اس کی بات نہیں سنی تھی۔

''مغل شہزادی زیب النساء اور مغل شہزادہ سلیم گھوڑے پر بیٹھ کر اسے خوابوں میں تلاشتا ہوا۔'' وہ ہنس پڑے۔

اور زل کو ادراک ہوا کہ وہ اس وقت کہیں کسی اور ہی دنیا میں ہیں اس لیے وہ یہ کہتے کہتے لیکن شہزادہ سلیم نے تو کسی زیب النساء کو نہیں تلاشا تھا رک گئی اور انہیں دیکھنے لگی وہ سامنے دیکھ رہے تھے ان کی نظریں کبھی وارڈروب پر رکتیں، کبھی دائیں طرف والی خالی دیوار پر اور کبھی وارڈروب کے بائیں طرف دیوار پر لگی پینٹنگ پر ہر جگہ جیسے کوئی منظر ٹھہرا ہوا تھا۔ وہ استانی جی کے سامنے بیٹھے تھے۔ ہولے ہولے کچھ کہتے ہوئے استانی جی مسکرا رہی تھیں۔

وہ ہاسپٹل کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے اور مولوی صاحب پوچھ رہے تھے آپ کو زیب النساء بنت ماسٹر عبدالعزیز بعوض حق مہر قبول ہے۔''

''قبول ہے۔'' انہوں نے خود کو کہتے سنا تھا اور پھر نگاہیں دیوار پر لگی پینٹنگ پر ٹھہر گئیں۔ اگر میں مصور ہوتی تو اس منظر کو پینٹ کرتی۔ کانوں میں جیسے کسی نے رس گھولا تھا وہ ناران میں اپنے ہوٹل کے سامنے دریائے کنہار کے کنارے پڑے بینچوں میں سے ایک پر بیٹھے تھے اور پانی پتھروں پر اچھلتا شور مچاتا بہہ رہا تھا۔ وہ مبہوت سا اس منظر کو دیکھ رہی تھی اور وہ اسے دیکھ رہے تھے منظر بدلا تھا وہ کیمرہ گلے میں لٹکائے ایک فوٹو گرافر کو اشارے سے بلا رہے تھے۔ پھر منظر تیزی سے بدلنے لگے جیسے کسی نے فارورڈ کا بٹن دبا دیا ہو۔

پھر ایک منظر ان کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر گیا۔ ان کے سامنے وہ کھڑا تھا اقبال شکاری ہاتھ باندھے کچھ کہتا ہوا اور پھر انہوں نے خود کو لرزتی آواز میں کہتے سنا۔ ''کیا...... کیا کہہ رہے ہو تم وہ زندہ تھی اور تم نے جھوٹ بولا۔ مجھ سے اس سے۔ ماسٹر صاحب سے

''منظر ایک بار پھر تیزی سے بدلنے لگے تھے۔ مریم کے سوئم میں دعا کروائی جا رہی تھی وہ بے چین سے تھے۔

☆☆☆

وہ اقبال شکاری کے گھر کے باہر کھڑے تھے...... وہ اقبال سے ایک بار پھر ایک لفظ سن رہے تھے وہ ماسٹر صاحب کے گھر کے باہر کھڑے تھے، دروازے پر کھڑی عورت انہیں بتا رہی تھی کہ وہ یہاں سے چلی گئی تھی اپنے کسی رشتہ دار کے گھر...... مانسہرہ، ہری پور حویلیاں ادھر ہی کہیں اس کے رشتہ دار رہتے تھے نا۔ ماسٹر صاحب کے رشتہ دار۔ اس کے نانا نانی تو

کب کے مرکھپ گئے تھے۔ ماسٹر صاحب کے بعد اکیلی کیسے رہتی تو یہ مکان فروخت کر کے چلی گئی۔ اپنے ابا کے رشتہ داروں کے پاس...... پھر...... پھر کیا ہوا تھا۔ وہ شہادت کی انگلی ہولے ہولے اپنی کنپٹی پر مار رہے تھے۔
ان کی جاب ختم ہو گئی تھی یا انہوں نے خود چھوڑ دی تھی۔ وہ ایبٹ آباد، حویلیاں، ہری پور ہر جگہ مارے مارے پھر رہے تھے...... وہ اسے ڈھونڈ رہے تھے اور وہ نہ جانے کہاں چھپ گئی تھی۔ پھر ہولے ہولے انہیں یاد ہی نہ رہا کہ وہ کسے ڈھونڈ رہے ہیں۔ جہاں بیٹھتے وہاں ہی بیٹھے رہتے۔ کوئی ترس کھا کر کھانا دے جاتا بھوک ہوتی تو کھا لیتے ورنہ یوں ہی پڑے رہتے تھے۔
ایک بار پھر منظر بدلا تھا۔ وہ سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر بیٹھے ہر آنے جانے والے کو دیکھ رہے تھے جب ظفریاب ان کے پاس آ کر رکے تھے۔
''شاہ زیب...... زیبی۔'' وہ بے چینی سے پوچھ رہے تھے...... ''تم...... تم یہاں ہو کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا ہم نے تمہیں۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟''
''پتا نہیں۔'' باوجود کوشش کے وہ یاد نہیں کر پائے تھے کہ وہ یہاں کیا کر رہے تھے۔ وہ شاید کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لیکن کسے...... وہ کسے ڈھونڈ رہے تھے۔ انہوں نے سوالیہ نظروں سے زل کو دیکھا۔
''جی ابا......''
''وہ...... وہ مجھے یاد نہیں آ رہا کہ میں کسے ڈھونڈ رہا تھا۔
''یاد آ جائے گا ابا۔''
اس نے ان کے بازو پر ہاتھ رکھا۔
''آپ کچھ دیر آنکھیں بند کر کے لیٹ جائیں۔ شاید آپ کو نیند آ جائے اور جب آپ سو کر اٹھیں گے نا تو فریش ہو جائیں گے۔ اور یاد آ جائے گا آپ کو۔ اور یہ بھی تو ہو سکتا ہے نا کہ آپ کو خواب میں وہ نظر آ جائے جسے آپ ڈھونڈ رہے ہیں۔''
انہوں نے سر ہلایا تھا اور پھر بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ کچھ دیر یوں ہی لیٹے رہے پھر دیوار کی طرف رخ کر لیا۔ وہ کچھ دیر بیٹھی رہی۔ انہوں نے کروٹ نہیں بدلی تھی شاید سو گئے تھے۔ وہ آہستہ سے اٹھی اور دبے پاؤں چلتی ہوئی باہر آ گئی، دروازہ بھی آہستہ سے بند کیا۔ اور اپنے کمرے کی طرف جانے لگی تب تک جہاں زیب بیگ کے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ باہر آئے۔
''زل''
جی دادا جان آپ کب آئے۔''
زل رک گئی تھی۔
''زیبی...... سو رہا ہے کیا۔''
ان کی آواز میں دبا دبا سا جوش تھا۔
''جی بس ابھی ابھی ہی سوئے ہیں۔''
''اچھا ٹھیک ہے تم ادھر آؤ میری بات سنو۔'' وہ وہاں سے ہی واپس کمرے میں مڑ گئے تھے۔
''کیا ہوا دادا جان سب خیریت ہے نا۔'' وہ ان کے پیچھے ہی کمرے میں داخل ہوئی تھی۔
''ہاں خیریت ہے۔ تم بیٹھو۔ بیٹھ جاؤ۔'' وہ بے حد مضطرب سے لگ رہے تھے۔
''وہ...... ابھی ابھی تمہاری پھپھو کا فون آیا ہے۔'' انہوں نے ایک گہرا اور لمبا سانس لیا۔
''وہ کہہ رہی تھی کہ بہت دنوں سے وہ مجھ سے ایک بات کرنا چاہ رہی تھی۔ ارادہ تھا کہ شادی کی تاریخ طے کرنے آئے گی تو بات کرے گی تو اب چونکہ شادی پر ہی آنا ہے تو اتنے دن مجھ سے صبر نہیں ہو گا۔ کب سے بات دل میں رکھی ہوئی ہے۔''
''کیا بات ہو سکتی ہے کہیں زین نے تو پھپھو سے کچھ نہیں کہہ دیا۔ کوئی ایسی ویسی بات۔''
دل ڈوب کر ابھرا تھا اور اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔
''کیا...... کیا بات دادا جان۔''
''وہ بتا رہی تھی کہ اس کے ہاں ایک لڑکی کام کرتی ہے شاید رحیم یار خان کے کسی دیہات سے بیاہ کر آئی ہے۔''
''ہاں...... ہاں منیرہ...... کیا ہوا اسے۔'' زل نے ایک پرسکون سانس لی۔

"نہیں اسے تو کچھ نہیں ہوا۔ اس کی ماں نے اختر بانو کو اپنی ایک سہیلی کے متعلق بتایا۔" وہ ہولے ہولے اختر بانو سے سنی گئی ساری بات اسے بتاتے گئے۔

"نکاح نامے کی جو کاپی اس نے اختر بانو کو دی...... وہ نکاح نامہ کسی اور کا نہیں شاہ زیب کا تھا۔"

"نہیں......" اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔

"وہ کوئی اور شاہ زیب بھی تو ہو سکتا ہے ضروری تو نہیں کہ وہ ابا کا ہی نکاح نامہ ہو۔"

"وہ نکاح نامہ زیبی کا ہی ہے۔ تصویر بھی دی تھی اس نے اختر بانو کو اور تصویر نہ بھی ہوتی تو شک کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ باپ کا نام گھر کا پتا سب کچھ ہی تو لکھا ہوتا ہے۔" انہوں نے ایک نظر اسے دیکھا۔

"میں سمجھتا تھا مریم کے چلے جانے کا روگ لگائے بیٹھا ہے لیکن وہ شاید کوئی اور ہی روگ لگائے بیٹھا تھا۔"

نہیں دادا جان جس بات نے بھی ابا کو آہستہ آہستہ ہوش وحواس سے بیگانہ کیا ہے وہ اماں کی موت کے بعد ہی کی بات ہے ورنہ انہوں نے پہلی شادی اماں سے شادی کرنے سے پہلے کی تھی نا جب وہ پڑھ رہے تھے تب نا اور اماں سے شادی کرنے کے بعد تیرہ ساڑھے تیرہ سال تک تو وہ ٹھیک تھے نا اگر اپنی پہلی بیوی کے بچھڑ جانے کی وجہ سے ان کا ذہن متاثر ہوا تھا تو وہ اتنے برسوں تک کیسے صحیح رہے۔ اتنی اہم پوسٹ پر کام کرتے رہے۔"

زمل کو کچھ دیر پہلے شاہ زیب کی کہی باتیں یاد آرہی تھیں۔

"ہاں شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو...... مریم سے شادی سے پہلے وہ کچھ پریشان اور اداس سا رہتا تھا...... مریم سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا کہتا تھا وہ بہت کم عمر ہے۔ لیکن تمہاری دادی نے اپنی مرتی ہوئی بہن سے وعدہ کیا تھا اور وہ ماں کے سامنے مجبور ہو گیا تھا تب لیکن شادی کے بعد اپنی جاب کی مصروفیت میں کھو کر وہ پہلے کی طرح اداس اور پریشان نہیں رہتا تھا۔ تمہاری پیدائش پر تو وہ بہت خوش ہوا تھا۔ مریم کو گولڈ کے کنگن تحفے میں دیے تھے اس نے اس رشتے کو قبول کر لیا تھا دل سے جب وہ بیمار ہوئی تو اس نے مجھے کہا آپ ڈاکٹروں سے بات کریں میں اسے باہر لے جاؤں گا جہاں بھی اس کا علاج ممکن ہوا۔"

وہ شاہ زیب بیگ کی مریم سے متعلق کی گئی باتیں یاد کر رہے تھے اور زمل کا ذہن شاہ زیب بیگ کو ان باتوں میں الجھا ہوا تھا جو وہ پچھلے چند ماہ سے کر رہے تھے۔

انہوں نے کہا تھا جس روز اماں ہاسپٹل میں زندگی کے آخری سانس لے رہی تھیں اس روز کچھ اور بھی ہوا تھا کوئی بڑا حادثہ...... ایسا حادثہ جس نے انہیں روشنی سے اندھیروں میں لا پھینکا تھا۔ اس روز انہوں نے کہا تھا اس شخص نے مجھے کند چھری سے ذبح کر ڈالا تھا۔

"کون تھا وہ شخص اور اس نے کیا کہا تھا شاہ زیب سے۔" جہاں زیب بیگ بڑبڑائے تھے۔

"ہاں وہ...... وہاں ایک شخص نے شاہ زیب کو روکا تھا وہ کچھ کہنا چاہتا تھا اس سے۔ اور ہم نے التجا کی تھی اس سے کہ پھر...... پھر بھی وہ بات کر لے اس سے کہ ہم اس وقت بہت مشکل وقت سے گزر رہے ہیں۔"

"کیا آپ اسے جانتے ہیں دادا جان۔" زمل نے پوچھا تو انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

"میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا اور اب تو مجھے اس کی شکل بھی یاد نہیں۔

"یہ جو ابا پچھلے کئی سالوں سے ہوش وخرد کی درمیانی کیفیت میں ہیں تو اس کی وجہ وہی شخص ہے ان کی پہلی بیوی نہیں...... اس نے ہی کچھ ایسا کہا تھا ان سے...... اور کیا کہا تھا ان سے یہ تو صرف ابا ہی بتا سکتے ہیں یا وہ شخص، اس شخص کا ہمیں علم نہیں ہے اور ابا کو ہولے ہولے ماضی کی بہت سی باتیں یاد آرہی ہیں ابھی وہ آدھی ادھوری باتیں یاد کر رہے ہیں لیکن ایک روز انہیں سب کچھ یاد آجائے گا۔ اور پھر وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ ان شاء اللہ۔"

☆☆☆

زمل کو یقین تھا اور اس کا یقین غلط بھی نہیں تھا شاہ زیب کو ہولے ہولے سب یاد آ رہا تھا۔ وہ ماضی کی کتاب کے اوراق کبھی ایک ایک کر کے پلٹتے اور کبھی یک دم بہت سارے اوراق ایک ساتھ پلٹ دیتے تو ربط ٹوٹ جاتا تو وہ الجھ جاتے اس وقت بھی وہ اپنے کمرے میں مضطرب سے ادھر سے ادھر چکر لگا رہے تھے ان کی آنکھ بس چند لمحوں کے لیے ہی لگی تھی پھر وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔ زمل جا چکی تھی۔ انہوں نے چاروں طرف نظر دوڑائی تھی۔ زمل کے پاس کوئی کتاب تھی۔ پتا نہیں کون سی لیکن وہ اسے ساتھ ہی لے گئی تھی شاید پھر ان کی نظر تکیے کے پاس پڑی اس کتاب پر پڑی انہوں نے جھپٹ کر اسے اٹھایا اور کھولا۔

"دیوان زیب النساء مخفی۔"

"زیب النساء زیب النساء۔" وہ زیر لب دہراتے ہوئے کمرے میں چکر لگا رہے تھے۔

"کہاں ہو تم...... کہاں چھپ گئی ہو تم کہاں ڈھونڈوں تمہیں......" ان کے لبوں سے غیر اختیاری طور پر نکلا تھا۔ پھر وہ ٹھٹک کر رک گئے تھے۔

"کیا...... میں زیب النساء کو ڈھونڈ رہا ہوں...... لیکن کیوں ڈھونڈ رہا ہوں کہاں چلی گئی تھی وہ۔"

وہ شہادت کی انگلی ہولے ہولے اپنی کنپٹی پر مار رہے تھے۔

"نہیں...... وہ کہیں نہیں گئی تھی...... وہ تو...... وہ تو مر گئی تھی ایکسیڈنٹ ہوا تھا اس کا اور استانی جی کا بھی لیکن یہ استانی جی کون تھیں اور زیب النساء کون تھی میری۔"

وہ الجھے الجھے سے بیڈ پر بیٹھ گئے تھے۔

"زیب النساء مغل شہزادی تھی۔

زمل نے ابھی ابھی تو بتایا تھا انہیں لیکن پھر میرا اس سے کیا تعلق تھا کس نے کہا تھا مجھ سے اسے ڈھونڈنے کو......" دماغ کے اندر پھر کوئی ریل سی چلنے لگی تھی۔

"اس نے...... وہ جو ہاسپٹل کے کوریڈور میں کھڑا تھا...... وہ اقبال شکاری...... اس نے کہا تھا۔ وہ مری نہیں تھی...... وہ زندہ تھی...... اس نے جھوٹ بولا تھا کہ وہ مر گئی ہے۔ لیکن وہ کھو گئی ہے۔ دنیا کی اس بھیڑ میں گم ہو گئی ہے۔ اور یہ کہ وہ اکیلی نہیں ہے اس کے پاس ان کا بیٹا بھی ہے...... میرا بیٹا......" وہ پھر چونکے تھے۔

"میری تو صرف بیٹی ہے زمل...... اور میرا بیٹا...... اگر میرا کوئی بیٹا ہے تو وہ اس کے پاس کیوں تھا۔ یہاں کیوں نہیں اس گھر میں ہمارے پاس۔"

وہ بے حد الجھ رہے تھے...... "کیا کروں کس سے پوچھوں۔" وہ اٹھے اور پھر بیٹھ گئے۔ سر میں شدید درد ہو رہا تھا جیسے کوئی ہتھوڑے سے ضربیں لگاتا ہو۔ وہ شیخو بابا...... شہزادہ وہ کہتا تھا۔ زیادہ نہ سوچا کریں۔ ڈاکٹر نے منع کیا ہے۔ زیادہ سوچنے سے طبیعت خراب ہو جائے گی اور زمل نے بھی تو کہا تھا سو جاؤں...... ہاں ٹھیک ہے انہوں نے بیڈ پر لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔ اور وہ چھم کر کے ان کی آنکھوں میں اتر آئی۔ مسکراتی ہوئی۔ شرماتی ہوئی۔

"میں زیب النساء ہوں آپ کا اور میرا نکاح ہوا تھا۔ یاد ہے نا ہم شادی کے بعد گھومنے گئے تھے۔ ہاں یاد ہے...... لیکن ہمارا ساتھ کتنا مختصر رہا حالانکہ ہم نے عمر بھر ساتھ نبھانے کی قسمیں کھائی تھیں...... پھر...... ایسا کیا ہوا تھا کہ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ بند آنکھوں میں نیند بھرتی جا رہی تھی لیکن وہ یاد کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ کیا ہوا۔ اور پھر جیسے سب کچھ یاد آتا چلا گیا۔ ایک ایک بات ایک ایک لمحہ ماضی کی کتاب کے ہر ورق کا وہ ایک ایک لفظ پڑھ رہے تھے۔ بند آنکھوں کے سامنے گزرے سارے ماہ سال کی کتاب کھلی پڑی تھی۔

کتنی اذیت ناک داستان تھی ان گزرے برسوں کی...... وہ اس دنیا سے چلی گئی تھی انہوں نے صبر کر لیا تھا۔ اللہ کی رضا پر راضی ہو گئے تھے۔ گو وہ

اسے بھولے نہیں تھے۔ وہ جوان کی زندگی میں بہت مختصر عرصہ کے لیے آئی تھی لیکن جس نے انہیں محبت سے آشنا کیا تھا...... وہ کبھی بھی اسے بھول نہیں سکتے تھے اس کا نام اس کی یاد ان کے دل پر نقش تھی۔ لیکن وہ زندہ تھی اس دنیا میں کہیں موجود تھی ان کے ساتھ دھوکا کیا گیا تھا جھوٹ بولا گیا تھا یہ دکھ ان سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔

وہ مریم کو سپرد خاک کر کے اقبال کے پاس پہنچ گئے تھے۔ جس نے ہسپتال کے کوریڈور میں کھڑے کھڑے اپنے جرم کا اعتراف کیا تھا اور اب اس سے سب حرف حرف سن رہے تھے۔ جان رہے تھے۔

''تم نے ہم پر بہت ظلم کیا اقبال۔''

وہ زخمی روح اور زخمی دل کے ساتھ واپس آئے تھے۔

کتنا تلاشا تھا انہوں نے اسے کہاں کہاں نہیں ڈھونڈا لیکن وہ انہیں نہیں ملی تو ہولے ہولے ان کے اعصاب جواب دیتے گئے وہ فراموش ہی کر بیٹھے کہ وہ کسے تلاش کر رہے تھے۔ سارا دن خاموش بیٹھے خلاؤں میں دیکھتے رہتے تھے۔ آنسو بند آنکھوں سے نکل کر رخساروں پر پھسل آئے۔

''زیب النساء...... میری زندگی کہاں ڈھونڈوں تمہیں۔ کہاں ہو تم۔''

وہ اٹھ کر بیٹھ گئے تھے۔

''میں تمہیں ڈھونڈ لوں گا زیب النساء۔ میں بیمار ہو گیا تھا نا تو تلاش کا سفر رک گیا تھا لیکن اب میں ٹھیک ہوں تو ایک بار پھر ہر اس جگہ جاؤں گا جہاں تمہارے ملنے کا امکان ہو گا۔'' وہ بیڈ سے اٹھے دروازے کی طرف بڑھے پھر رک گئے۔

''لیکن میں کہاں جاؤں گا۔'' انہوں نے دروازہ کھولا۔

''میرے پاس تو نہ پیسے ہیں اور نہ ہی کوئی سواری۔

اور مجھے تو یہ بھی یاد نہیں آ رہا کہ مجھے کس شہر میں جانا ہے۔ اور وہ اقبال شکاری اس کے ساتھ کہاں گیا تھا میں اور اس عورت نے جو وہاں اس کے گھر میں رہتی تھی اس نے کیا بتایا تھا کہ وہ کہاں گئی ہو گی۔ کس جگہ اس کے رشتہ دار رہتے تھے۔'' وہ ذہن پر زور دے رہے تھے لیکن انہیں یاد نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہولے ہولے دروازے کی چوکھٹ پر سر مارنے لگے پہلے ہولے ہولے پھر زور سے۔ پتا نہیں کتنا عرصہ وہ بیمار رہے۔ کتنا وقت گزر گیا اسے جدا ہوئے۔ پتا نہیں وہ ہے بھی یا نہیں...... انہوں نے پوری طاقت سے سر چوکھٹ پر مارا......

''وہ ہے اسے کچھ نہیں ہوا ہو گا...... کچھ نہیں ہو سکتا...... زیب النساء...... زیب النساء ان کی آواز بلند تھی۔

پھر وہ دھاڑیں مار مار کر رونے لگے۔

''کہاں...... کہاں ڈھونڈوں......'' وہ رو رہے تھے، سر پیٹ رہے تھے اور جہاں زیب بیگ کے کمرے سے نکل کر کچن کی طرف جاتی زمل بھاگتی ہوئی ان کی طرف آئی۔

''ابا...... ابا کیا ہوا۔''

اس نے انہیں کندھوں سے پکڑا۔ ان کی پیشانی سے خون رس رہا تھا۔ انہوں نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔

''ابا میں زمل''

اس نے سمجھا شاید وہ اسے پہچان نہیں پا رہے لیکن وہ تو اسے دیکھتے ہوئے ان ماہ و سال کا حساب لگا رہے تھے جو زیب النساء سے بچھڑے ہو گئے تھے۔ شاید تیس سال نہیں شاید اکتیس سال۔ اتنے سال گزر گئے اب بھلا وہ اسے کہاں ڈھونڈیں۔ مایوسی نے ان کے اندر پنجے گاڑ لیے وہ اب زندگی بھر انہیں نہیں مل سکتی۔ وہ ایک بار پھر دروازے کی چوکھٹ پر سر مارتے ہوئے رو رہے تھے۔ انہیں سنبھالتے ہوئے زمل خود بھی رونے لگی تھی اور بلند آواز سے سب کو بلا رہی تھی شینو، بابا، بی بی اماں، دادا جی، زین۔

اور سب ہی اس کی آواز سنتے ہی دوڑتے ہوئے آ گئے تھے۔ ہاں زین نہیں تھا۔ تمہاری اس

وقت کتنی ضرورت تھی زین۔ کتنے مشکل وقت میں تم نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس نے دل ہی دل میں شکوہ کیا اور اسے لگا جیسے شاہ زیب بیگ کی آنکھیں بند ہو رہی ہوں اور وہ اپنا بوجھ سہار نہ پا رہے ہوں۔ شینو بابا نے انہیں گرنے سے پہلے ہی سنبھال لیا تو وہ وہاں ہی دروازے کے پاس فرش پر بیٹھ گئی شینو بابا انہیں اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھائے اندر کمرے میں جارہے تھے اور وہ وہاں ہی بیٹھی بے آواز روئے چلی جارہی تھی۔

اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم سے جان نکل رہی ہو۔ بی بی اماں نے اس کے کندھوں پر ہاتھ رکھا۔

''اس طرح فرش پر مت بیٹھو زل۔ مجھے وہم آتا ہے اٹھو۔'' اور وہ بے جان قدموں سے چلتی ہوئی اندر کمرے میں آئی تھی شینو بابا انہیں بیڈ پر لٹا چکے تھے اور ہوش میں لانے کی کوشش کر رہے تھے۔ جہاں زیب بیگ پریشان سے کھڑے تھے۔

''مہرین...... مہرین کو بلاتی ہوں دیکھے آ کر کیا ہو گیا ہے میرے بچے کو۔'' بی بی اماں باہر کی طرف لپکیں تو زل نے بتایا۔

''مہرو تو ہاسپٹل گئی ہوئی ہے۔''

''میں ڈاکٹر ارسلان کو لے کر آتا ہوں۔ اس وقت وہ گھر پر ہی ہوں گے۔''

شینو بابا تیزی سے باہر نکل گئے اور وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ کر ان کے ہاتھ سہلانے لگی۔ بی بی اماں کچھ پڑھ پڑھ کر پھونکنے لگیں۔

''ابا آپ ہوش میں آجائیں جلدی سے تو میں آپ کو بتاؤں کہ وہ جس زیب النساء کے متعلق آپ پوچھ رہے تھے کہ وہ کون ہے تو وہ کوئی مغل شہزادی نہیں آپ کی بیوی آپ کی محبت تھی اور جس کے متعلق ابھی ابھی ہمیں پتا چلا ہے۔'' لیکن نہیں جانتی تھی کہ اس بار ان کی بے ہوشی کئی دنوں تک ٹوٹنے والی نہیں تھی۔

☆☆☆

شینو بابا ڈیوڑھی کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے ہی تھے کہ اندرونی دروازہ کھلا اور شاہ زیب بیگ ڈیوڑھی میں آئے۔

''کہاں چلے گئے تھے تم...... دوبار دیکھنے آیا ہوں۔ تم نہیں تھے۔''

''میں ذرا دھوبی سے اپنے کپڑے لینے گیا تھا۔''

شینو بابا نے ہاتھ میں پکڑا شاپر چارپائی پر رکھا جب سے وہ ڈیوڑھی میں آئے تھے اپنے کپڑے بی بی اماں کے کہنے پر دھوبی کو دھلنے کے لیے دینے لگے تھے گھر کے مردوں کے کلف والے کپڑے دھوبی کی طرف ہی جاتے تھے مہینے کے آخر میں جہاں زیب بیگ دھوبی کا حساب چکا رہے تھے دوسرے کپڑے گھر میں ہی دھل کر استری ہو جاتے تھے لیکن شینو بابا اپنے سب کپڑے دھلنے کے لیے دھوبی کو دیتے تھے۔

''کوئی کام تھا آپ کو کیا۔''

''ہاں کام...... کام تو تھا۔ وہ مجھے ہری پور جانا ہے زیب النساء کو ڈھونڈنے۔ ظفر بھائی نے کہا ہے کہ وہ بہت جلد آرہے ہیں پاکستان وہ میرے ساتھ چلیں گے اسے ڈھونڈنے لیکن وہ پتا نہیں کب آئیں، میں اب اتنا انتظار نہیں کرسکتا۔ کتنے ہی سال گزر گئے وہ پہلے بھی تو نہیں ملی تھی مجھے۔ پتا نہیں اب بھی ملے گی یا نہیں۔

لیکن مجھے ایک بار پھر اسے ڈھونڈنا چاہیے نا...... اور میں ظفر بھائی کا انتظار نہیں کرسکتا...... تم چلو گے میرے ساتھ۔''

شاہ زیب بیگ چند دن پہلے ہی اسپتال سے آئے تھے اور جب سے گھر آئے تھے بہت بے چین تھے۔ تین دن کی مکمل بے ہوشی کے بعد چوتھے دن انہوں نے آنکھیں کھولی تھیں اور یہ تین دن گھر کے افراد کے ساتھ ساتھ شینو بابا نے بھی بہت اذیت میں گزارے تھے ڈاکٹر کوئی بھی یقینی بات نہیں بتاتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ کومے کی یہ حالت طویل بھی ہوسکتی ہے چند ہفتے۔ چند ماہ چند سال اور یہ بھی ممکن ہے کہ ابھی چند گھنٹوں میں ہوش میں آجائیں۔

اور تین دن بعد انہوں نے بس ذرا سی دیر کے لیے ہی آنکھیں کھولی تھیں لیکن ایک امید پیدا ہو گئی تھی آس لگ گئی تھی کہ وہ جلد ہی مکمل ہوش میں آجائیں گے۔ گھر میں سب ہی پریشان تھے۔

☆☆☆

دو دن کے لیے اختر بانو بھی آئی تھیں تب جہاں زیب بیگ نے کہا تھا کہ وہ نہیں چاہتے کہ مہرین کی شادی ملتوی کی جائے۔ شاہ زیب کو نہ جانے کتنے روز ہاسپٹل میں رہنا پڑے۔ ریحان کی چھٹی ختم ہو جائے گی۔ بہتر ہے کہ رخصتی ہو جائے اور ریحان مہرین کو ساتھ لے جائے تا کہ وہ بھی وہاں جا کر اپنی پڑھائی شروع کر سکے۔ شاہ زیب بیگ اگلے کئی دن اس کیفیت میں رہے کہ کبھی ہوش آجاتا اور کبھی کئی گھنٹے بے ہوش رہتے۔ ہوش میں آتے تو پرانی باتیں کرتے جب وہ پڑھ رہے تھے اور جب شکار کے لیے گئے تھے اور بیمار ہو گئے تھے۔ مکمل ہوش میں آنے میں انہیں دس دن مزید لگے تھے۔ اس دوران ڈاکٹر ارسلان نے بہت ساتھ دیا تھا وہ اپنا کلینک بند کر کے زیادہ تر وقت ان کے ساتھ گزار رہے تھے جانتے تھے کہ شاہ زیب بیگ اس وقت بہت نازک لمحوں سے گزر رہے ہیں ذرا سی بے احتیاطی اور غلطی انہیں نقصان پہنچا سکتی ہے۔ انسانی دماغ کی پیچیدگی کو سمجھنا آسان نہیں ہے وہ آہستہ آہستہ ماضی سے حال کی طرف سفر کر رہے تھے۔

شیخو بابا ہر وقت ہاسپٹل میں ہی رہتے تھے زل اور جہاں زیب بیگ بھی وہاں ہی ہوتے تھے رات کو زبردستی شیخو بابا انہیں اور زل کو گھر بھیجتے تھے۔ پرائیویٹ ہاسپٹل کا پرائیویٹ روم تھا۔ اس لیے زیادہ روک ٹوک نہیں ہوتی تھی۔ دن بھر کوئی نہ کوئی آتا رہتا تھا۔ اس دوران مہرین کی رخصتی بھی ہو گئی تھی۔ بارات کا شاندار استقبال کیا گیا تھا مقررہ تاریخ پر مہرین کی رخصتی کے جہاں زیب بیگ کے فیصلے پر اگر کسی کو کوئی اعتراض تھا تو وہ سحرش تھی۔

''میں نے اتنے پروگرام بنا رکھے تھے مایوں، مہندی سب کرنا تھا، نکاح تو ہو ہی چکا ہے۔ رخصتی ملتوی کر دیتے اگلے سال آجاتے ریحان بھائی تو پھر ہو جاتی رخصتی بھی۔''

''دادا جان نے بالکل صحیح فیصلہ کیا ہے سحری۔ ابا کی بے ہوشی طول بھی پکڑ سکتی تھی۔ بی بی اماں کہہ رہی تھیں کہ تاریخ طے ہو جانے کے بعد اگر رخصتی نہ ہوتی تو اپنی مہرو ہرٹ ہوگی نہ جانے کیا کیا سوچے گی اور لوگ بھی باتیں کریں گے۔'' زل نے اسے سمجھایا تھا۔

''مہرین کی تیاری میں خوشی خوشی مدد کرو اس کی۔ ایک ہی فنکشن ہے تو بہت اچھے سے انجوائے کرنا۔''

ہاسپٹل کے کوریڈور میں سحرش کو زل سمجھا رہی تھی اور انہوں نے ایک شفقت و محبت بھری نظر اس پر ڈالی تھی انہیں زل کی یہ عادت ہمیشہ سے ہی اچھی لگتی تھی کہ وہ اپنے لیے سوچنے سے پہلے دوسروں کے لیے سوچتی تھی۔ ولیمے کا فنکشن دو دن بعد تھا اور ولیمے سے ایک دن پہلے ڈاکٹر نے شاہ زیب بیگ کو گھر جانے کی اجازت دے دی تھی۔ اختر بانو نے سب ہی کو شاہ زیب بیگ کے متعلق بتا دیا تھا۔

سب نے ہی نکاح نامے کی کاپی اور تصویر دیکھی تھی سب کو ہی اس بات کا دکھ ہوا تھا کہ شاہ زیب کی وہ بیوی جس کے متعلق کسی کو علم نہیں تھا اب اس دنیا میں نہیں اور بیٹا دنیا کی بھیڑ میں کہیں گم ہو چکا ہے ماضی سے حال تک کے سفر میں ڈاکٹر ارسلان کی ہدایت کے مطابق شیخو بابا ہر لمحہ ان کے ساتھ رہے تھے۔ وہ نہ ہوتے تو زل ان کے پاس ہوتی تھی وہ جو کہتے تھے دونوں ہی خاموشی سے سنتے رہتے تھے۔ ان کی باتوں کا اختتام ہمیشہ اس بات پر ہوتا تھا۔

''جب میں اقبال کے ساتھ ماسٹر صاحب کے گھر گیا تو وہ عورت جس نے ماسی نور بھری سے ان کا گھر خریدا تھا اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی دادی کے رشتہ دار ہری پور میں رہتے ہیں۔ تو مجھے ہری پور جانا ہے۔ شاید پہلے میں ٹھیک سے ڈھونڈ نہیں سکا تھا لیکن اب ایک ایک گلی ایک ایک محلے میں جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے شاہ بابا ابھی آپ کی طبیعت مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہوئی جب آپ ذرا اور بہتر ہو جائیں گے تو پھر چلیں گے ہری پور وہ وقتی طور پر بہل جاتے لیکن دوسرے دن پھر وہی ضد کہ ہیں ہری پور جانا ہے۔اور اب بھی وہ سوالیہ نظروں سے دیکھ رہے تھے۔''

''تو تم چلو گے نا میرے ساتھ۔ظفر بھائی جانے کب آئیں اور بہت دیر نہ ہو جائے۔''

''دیر تو ہو چکی شاہ بابا۔''

دل ہی دل میں کہتے ہوئے شیخو بابا نے اثبات میں سر ہلایا۔

''جی شاہ بابا ضرور چلوں گا لیکن ایک خیال آیا ہے ذہن میں۔کیوں نہ ہم پہلے ماسٹر صاحب کے گاؤں میں جائیں۔کچھ اور لوگوں سے ملیں۔جس اسکول میں پڑھاتے تھے وہاں کوئی نہ کوئی ایسا شخص مل ہی جائے گا جو ماسٹر صاحب کے ساتھ رہا ہو وہاں۔کیا خبر کبھی ماسٹر صاحب نے کسی سے اپنے رشتے داروں کا ذکر کیا ہو۔آپ جب اقبال کے ساتھ گاؤں گئے تھے تو ماسٹر صاحب کے اسکول میں بھی گئے تھے۔''

''نہیں۔''

انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔

''ہم نے تو بس پاس پڑوس سے ہی پتا کیا تھا۔ان کی عمر کے تو ایک دو بندے ہی ملے تھے۔''

''تو پھر ایسا کرتے ہیں پہلے ماسٹر صاحب کے گاؤں جاتے ہیں ہری پور بعد میں جائیں گے۔آپ کو پتا ہے نا ان کے گاؤں کا۔''انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''تم بہت سمجھ دار اور ذہین ہو شہزادے۔پتا نہیں کیوں تم نے تعلیم حاصل نہیں کی۔پڑھ لیتے کچھ تو آج نہ جانے کس مقام پر ہوتے۔''

''ساری بات نصیب کی ہے۔شاید میرے نصیب میں اعلیٰ تعلیم نہیں تھی۔''شیخو بابا کے لہجے سے جھلکتی افسردگی کو شاہ زیب بیگ نے محسوس کیا تو ان کے بازو کو ہولے سے تھپکا۔

''تعلیم حاصل کرنے کے لیے عمر کی کوئی قید نہیں ہوتی صاحبزادے! تم چاہو تو اب بھی اپنی ادھوری تعلیم کو جاری رکھ سکتے ہو۔خیر اس موضوع پر میں پھر آ کر بات کرتا ہوں پہلے ابا جان کو بتا آؤں کہ میں تمہارے ساتھ کل ماسٹر صاحب کے گاؤں جا رہا ہوں...... میرا دل کہہ رہا ہے کہ ہمیں ان کے اسکول سے ان کے عزیزوں کے متعلق کچھ نہ کچھ پتا چل جائے گا۔تو سب کے گھر جائیں گے۔'' ان کی آنکھوں میں امید کی ایک ننھی سی لو جل رہی تھی۔

شیخو بابا کا دل غم سے بوجھل ہو گیا۔ان کا جی چاہا وہ شاہ زیب بیگ سے کہیں کہ ان کی تلاش لاحاصل ہے۔وہ جسے ڈھونڈنا چاہتے ہیں وہ تو سالوں پہلے رزق خاک ہو گئی تھی۔دل میں خوامخواہ کی امیدیں نہ پالیں لیکن وہ کچھ بھی کہہ نہیں سکے اور شاہ زیب بیگ جس طرح تیز تیز چلتے ہوئے آئے تھے اسی طرح تیز تیز چلتے ہوئے واپس چلے گئے۔ڈاکٹر ارسلان نے سختی سے منع کیا تھا کہ فی الحال ان کے سامنے کوئی ایسی بات نہ کی جائے جس سے انہیں صدمہ پہنچے۔زیب النساء کی وفات کے متعلق بھی انہیں نہ بتایا جائے بلکہ اگر وہ ضد کریں ہری پور جانے کی تو ان کی بات مان لی جائے۔چونکہ وہ ڈاکٹر ارسلان کے زیر علاج تھے تو انہیں جہاں زیب بیگ نے خود ماضی کی اس کہانی کے متعلق بتا دیا تھا تاکہ علاج صحیح سمت میں کیا جا سکے۔

☆☆☆

شاہ زیب بیگ چلے گئے تھے اور شیخو بابا افسردہ سے اپنی چارپائی پر بیٹھ گئے۔کتنے ہی ماہ و سال گزر گئے تھے انہیں یہاں اس موروں والی حویلی میں آئے انہوں نے کبھی کہیں اور جانے کا سوچا ہی نہیں۔ظفر یاب کی انگلی پکڑے اپنا بستہ کندھے پر لٹکائے جب وہ پہلی بار اس ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تھے تو بہت سہمے اور ڈرے ہوئے تھے اور دل میں ایک امید سی تھی کہ کسی روز شاید بہت جلد ماسی چاچا کے ساتھ انہیں

ڈھونڈتی ہوئی آ جائے نہیں جانتے تھے کہ جو قدم آج انہوں نے اس حویلی میں رکھے ہیں۔ وہ اب پلٹنے والے نہیں، جانے کیا طلسم تھا اس حویلی کے در و دیوار میں کہ وہ اس سے بندھ کر ہی رہ گئے تھے کبھی انہوں نے یہاں سے جانے کا سوچا ہی نہیں۔ وہ دن جب خوف دکھ اور غم سے نڈھال وہ ظفریاب بیگ کا ہاتھ تھامے اس اونچے اور بڑے دروازے والے گھر میں داخل ہوئے تھے یک دم جیسے آنکھوں کے سامنے آ گیا تھا۔

''ڈرو نہیں بیٹا۔'' ظفریاب نے محسوس کر لیا تھا کہ وہ ڈرا اور سہا ہوا ہے۔

''بہت جلد میں تمہارے کسی عزیز رشتہ دار کا پتا چلا لوں گا۔ تب تک تم آرام سے بے فکر ہو کر رہو۔''

وہ انہیں بتا چکا تھا کہ ماں کے انتقال کے بعد ان کا ایک پڑوسی اسے یہاں ایک رشتہ دار کے ہاں چھوڑنے آیا تھا اور وہ بھیڑ میں اس سے بچھڑ گیا۔ اور ظفریاب نے انہیں بی بی اماں کے حوالے کیا تھا۔

''بی بی اماں یہ بچہ ملا ہے جب تک اس کے کسی عزیز رشتہ دار کا پتا نہیں چل جاتا آپ اس کا خیال رکھیں۔ ابھی یہ ڈرا ہوا ہے کچھ بتا نہیں رہا۔''

اور بی بی اماں نے اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا تھا۔ ظفریاب مصروف تھے پھر بھی گاہے گاہے بی بی اماں سے پوچھتے رہتے کہ اس نے کچھ بتایا۔ کچھ مزید۔ لیکن بی بی اماں کے اصرار کے باوجود وہ مزید کچھ بھی نہ بتا پائے تھے۔

''کس شہر میں رہتے تھے گھر میں کون کون تھا۔ کس کے ساتھ یہاں آئے ہو۔''

بی بی اماں گھما پھرا کر کئی بار پوچھ چکی تھیں۔

''اتنے چھوٹے بچے بھی نہیں ہو کہ تمہیں اپنے شہر و محلے، گھر کا نہ پتا ہو۔''

''میں گاؤں سے آیا ہوں۔ گھر میں صرف اماں تھیں وہ فوت ہو گئی ہیں۔''

''یہاں کیسے آئے اور کس کے ساتھ۔''

ان سوالوں کے جواب وہ دے ہی نہ پاتے بس اپنی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں آنسو بھرے بی بی اماں کو دیکھتے رہتے۔ کیا بتاتے کیسے آئے تھے اور کس کے ساتھ، انہیں خود یقین نہیں آتا تھا کہ صفدر چاچا اس کے ساتھ ایسا کر سکتے ہیں۔ اور بی بی اماں ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر سینے سے لگا لیتیں۔

''اچھا پریشان نہ ہوں مجھے اپنی اماں ہی سمجھو۔ اور رونا نہیں بالکل شاباش۔ بہت پیارا بیٹا ہے میرا۔ کچھ نہیں بتانا چاہتا تو نہ بتا۔ میرا بیٹا بن کر یہاں ہی رہ میرے پاس میں ظفر میاں سے کہوں گی فارغ ہو کر تمہیں اسکول میں داخل کروا دیں۔

بی بی اماں شاید سمجھ گئی تھیں کہ وہ کچھ بتانا نہیں چاہتا۔ اور وہ بی بی اماں کے آنچل میں سمٹ کر ماں کی خوشبو تلاش کرنے لگے تھے۔ بی بی اماں بھی ان کا بے حد خیال رکھتی تھیں لیکن پھر جب بی بی اماں حویلی کے اندر منتقل ہوئیں تو وہ ڈیوڑھی میں آ گئے پہلی چند راتیں جو تنہا ڈیوڑھی میں گزریں۔ وہ بہت تکلیف دہ تھیں لیکن پھر کتنے ہی ماہ و سال انہوں نے یہاں اس ڈیوڑھی میں گزار دیے تھے اور کبھی کہیں جانے کا نہیں سوچا تھا۔ بی بی اماں بھی کبھی کہتی تھیں۔

''شیخو بچے! کیا ملازموں کی طرح یہاں ڈیوڑھی میں پڑے پڑے عمر گزار دے گا۔ دس جماعتیں پڑھ چکا ہے۔ باہر نکل کہیں کسی دفتر میں ہی کلرکی کر لے۔ کچھ ڈھنگ کا کام کر لے۔ یہ زندگی نہیں ہے جو تم گزار رہے ہو۔ اور وہ مسکرا دیتے کیا کہتے کہ ان کے لیے اب زندگی یہاں اسی ڈیوڑھی میں ہے۔

ان کی آنکھوں میں نمی سی پھیل گئی تو انہوں نے دونوں پاؤں چارپائی پر رکھے اور دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ بند آنکھوں سے گرم پانی کے قطرے نکل کر رخساروں کو بھگونے لگے تو انہوں نے ہاتھوں کی پشت سے آنسو پونچھے۔

آج انہیں اپنی اماں یاد آ رہی تھی۔ کاش آج وہ زندہ ہوتیں۔ دل سے ایک آہ سی نکلی وہ یونہی آنکھیں موندے دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے اور ماضی

کے تھال سے گزرے لمحے ذرہ ذرہ کر کے حال کے شیشے پر گرنے لگے۔

اپنی موت سے چند دن پہلے اماں ان کا ہاتھ پکڑے انہیں پاس بٹھائے بہت دیر تک دیکھتی رہی تھیں۔

"مجھے اپنے ابا کی طرح موت سے ڈر نہیں لگتا شہزادے لیکن تمہارے اکیلے رہ جانے سے ڈرتی ہوں۔ مجھے کچھ ہو گیا تو اپنی ماسی زیتون کے پاس چلے جانا۔ دل لگا کر بہت سارا پڑھنا۔"

اور اماں کے دفن کے بعد زیتون خالہ انہیں اپنے گھر لے گئی تھیں۔ اماں کی ہدایت کے مطابق اماں کا وہ کپڑے کا تھیلا انہوں نے اپنے بستے میں رکھ لیا تھا۔ اماں نے یہ نیا بستہ شہر سے اس کے لیے صفدر چاچا سے منگوایا تھا۔ کینوس کا بنا یہ بستہ اسے بہت پسند آیا تھا۔ اس میں اس کی پانچویں جماعت کی پرانی کتابیں اور کاپیاں بھی تھیں انہیں کتابوں اور کاپیوں کے درمیان اس نے وہ تھیلا بھی رکھ لیا تھا۔ تھیلا کون سا اتنا بڑا تھا۔ چند خطوط اور سرٹیفکیٹ ہی تو تھے اس میں۔

فضل نے اپنی پرانی کتابیں آدھی قیمت پر بیچ دی تھیں لیکن اسے یہ کتابیں کسی کو نہیں دینی تھیں ان کتابوں اور کاپیوں پر اماں کے ہاتھ کے کور چڑھے تھے اور ہر کاپی کے پہلے صفحے پر ان کی خوب صورت لکھائی میں اس کا نام جماعت اور مضمون کا نام لکھا تھا اسے یہ کتابیں اور کاپیاں کبھی کسی کو نہیں دینی تھیں۔

زیتون ماسی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں بہت محبت کرتی تھیں اس سے لیکن وہ اماں تو نہیں تھیں۔

رات کو جب وہ سونے کے لیے اپنی چارپائی پر لیٹتا تو دن بھر کے رکے ہوئے آنسو بہہ نکلتے تھے۔ ساتھ والی چارپائی پر فضل تو لیٹتے ہی سو جاتا تھا اور وہ دیر تک اماں کو یاد کر کے روتا رہتا تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے وہ اماں کے بغیر جی نہیں پائے گا۔ کسی روز مر جائے گا لیکن اسے زندہ رہنا تھا۔ اپنے بابا کو ڈھونڈنا تھا۔ اماں جاتے جاتے اپنا یقین اس کے دل میں رکھ گئی تھیں۔

اسے بھی اماں کی طرح لگنے لگا تھا کہ اس کے بابا زندہ ہیں۔ بس وہ انہیں ڈھونڈ نہیں پائے۔ اور روتے روتے جب وہ تھک جاتا تو اللہ سے دعا مانگنے لگتا۔ یا اللہ میں جلدی سے بڑا ہو جاؤں بہت سارا پڑھ لوں اور بڑا افسر بن جاؤں تاکہ اپنے بابا کو ڈھونڈ سکوں۔

زیتون نے بتایا تھا کہ چھٹیوں کے بعد وہ اسے اور فضل کو شہر کے اسکول میں داخل کروادے گی اور دعا کرتے کرتے وہ چھٹیاں جلد ختم ہونے کی دعا بھی اپنی دعا میں شامل کر لیتا لیکن وقت تو اپنے حساب سے ہی آگے بڑھتا ہے۔ آسمان پر چمکتے ستارے اس کی سادگی پر مسکرا دیتے کہ وقت نے تو اپنی مرضی سے ہی آگے بڑھنا تھا اور اسے بڑا ہونا تھا لیکن شاید اللہ نے اس کی دعا سن لی تھی کہ اس روز جب چھٹیاں ختم ہونے میں کچھ ہی دن رہ گئے تھے ناشتہ کرتے ہوئے چاچا نے ماسی زیتون سے کہا۔

"فضل کی اماں! ایک خوشخبری ہے شہر سے میرے سنگی نے پیغام بھجوایا ہے کہ شہزادے کے باپ کا پتا چل گیا ہے۔ تو ایسا کرنا کل اسے صبح صبح تیار کر دینا میں اسے لے کر لاہور جاؤں گا۔"

"کیا سچ میں منی کے ابا۔"

زیتون ہاتھ میں پکڑا نوالہ منہ میں ڈالنا بھول گئی تھی۔

"تو کیا میں جھوٹ بول رہا ہوں۔" صفدر چاچا کو پتا نہیں کیوں غصہ آ گیا تھا۔

"نہیں میں یہ تو نہیں کہہ رہی کہ تم جھوٹ بول رہے ہو۔ بس یقین نہیں آ رہا۔ کتنا انتظار کیا زیبو نے ایسی کسی خبر کا اور ابھی اسے دنیا سے گئے دو ماہ بھی نہیں ہوئے تو وہ خبر آ گئی جس کا اس نے برسوں انتظار کیا تھا۔"

اور چائے کا۔ پیالہ ہاتھ میں پکڑے اس وقت وہ بھی اماں کے متعلق سوچ رہا تھا کاش اماں زندہ ہوتیں کاش انہیں کچھ نہ ہوتا۔

"اللہ کو جب منظور ہو زیتون! انسان تو کچھ نہیں کرسکتا۔"

صفدر نے لہجے میں نرمی پیدا کی تھی۔
''ایسا کر منی کے ابا مجھے بھی ساتھ لے چل۔''
زیتون نے زیب النساء کی یاد میں نم ہو جانے والی آنکھوں کو دوپٹے کے پلو سے پونچھا۔
''نہ تو ساتھ جا کر کیا کرے گی۔ تیرا دماغ ٹھیک ہے۔'' صفدر کو پھر غصہ آ گیا تھا۔
''میں اسے بتاؤں گی کہ زیب النساء کو کتنا یقین تھا کہ وہ زندہ ہے موجود ہے۔ اسے زیب النساء۔''
''بس بس رہنے دے۔''
صفدر نے اسے ٹوک دیا تھا۔
''تیرے کچھ بھی بتانے سے تیری سہیلی کو اب کوئی فائدہ نہیں ہونے والا......اور میں ایک اجنبی شہر میں عورت ذات کو لے کر کہاں خوار ہوتا رہوں گا۔ خود تو کسی منجی ہوٹل میں منجی (چارپائی) لے کر پڑا رہوں گا۔''
''لیکن کیا وہ تمہاری بات کا یقین کر لے گا کہ شہزادہ اس کا ہی بیٹا ہے۔''
زیتون متذبذب سی تھی۔
''میں کہتی ہوں مجھے بھی ساتھ لے چل۔ اور پھر اس کی امانت بھی تو ہے نا جو اس کے حوالے کرنی ہے۔ اپنی دی ہوئی انگوٹھی اور کنگن تو پہچان ہی لے گا زیبو نے مجھے بتایا تھا کہ یہ انگوٹھی اور کنگن اس نے دیئے تھے اسے۔''
''پٹھی مت ہے تیری۔ (الٹی عقل)۔''
صفدر کو پھر تپ چڑھی تھی۔
''ابھی ٹھیک سے پتا ہی نہیں ہے کہ جس بندے کے متعلق میرے سنگی نے بتایا ہے وہ سچ میں ہی شہزادے کا باپ ہے یا نہیں، پہلے ایک بار جا کر مل لوں اور ثبوت۔ ثبوت میں سب میرے پاس دکھا دوں گا اسے بتا دوں گا کہ شہزادہ کون ہے نانا کون تھا ماں کون تھی کس گاؤں میں رہتا تھا۔ دس بار تو تم نے ساری کہانی سنائی ہے مجھے......اور ہاں۔'' اس نے لہجے میں ذرا نرمی پیدا کی تھی۔
''تو فکر نہ کر اسے ساتھ ہی لے کر آؤں گا۔ پھر کر لینا ساری باتیں اس سے اور اس کی امانت اس کے حوالے کر دینا۔''
اور زیتون نے سر ہلا دیا تھا کہ اب اسے صفدر کی بات معقول لگی تھی اس نے ساکت بیٹھے شہزادے کو اپنے ساتھ لگا کر اس کی پیشانی چومی تھی اور اسے اماں بے تحاشا یاد آئی تھیں۔ اور وہ سارا دن سوچتا رہا تھا پتا نہیں بابا کیسے ہوں گے۔ شاید وہ اسے دیکھ کر حیران رہ جائیں۔ اماں نے بتایا تھا کہ ان کو تو اس کا پتا ہی نہیں ہے۔
اور پتا نہیں وہ اس سے مل کر خوش ہوں گے یا نہیں، پتا نہیں وہ اسے پیار کریں گے یا نہیں۔ لیکن وہ اس کے بابا ہیں۔ ضرور اسے پا کر خوش ہوں گے۔ اس رات صحن میں چارپائی پر لیٹے اوپر آسمان کو تکتے ہوئے اسے ستارے ہر رات سے زیادہ روشن اور چمکدار لگے تھے۔
صبح زیتون نے اسے تیار کروایا تھا۔ اس کے بالوں میں کنگھی کی تھی۔ اسے اس کا سب سے اچھا جوڑا پہنایا تھا۔ اور وہ صفدر کے ساتھ صبح سویرے ہی گھر سے نکل آیا تھا۔ اور صفدر کے ساتھ آتے ہوئے اس نے اپنا بستہ اٹھا لیا تھا۔
''ابا کہہ رہا ہے نا تمہارے ابا کو ساتھ لے کر آئے گا تو پھر یہ کیوں ساتھ لے کر جا رہا ہے۔''
فضل نے پوچھا تھا لیکن وہ خاموش ہی رہا تھا۔ اس میں اماں کی امانت تھی جو اسے اپنے بابا کے حوالے کرنی تھی۔ وہ بھلا اسے کیوں چھوڑ کر جاتا۔
''ایسا کر اس کے ایک دو جوڑے کپڑے بھی رکھ دے ساتھ۔'' صفدر کو اچانک ہی خیال آیا تھا۔
''اتنا لمبا سفر ہے راہ میں خراب ہو جائیں گے اب جاتے ہی اس کے باپ نے کپڑے تو نہیں خریدنے نا اس کے۔''
اور زیتون نے ایک تھیلے میں دو جوڑے کپڑے رکھنے کے ساتھ باجرے کی میٹھی ٹکیاں مکئی کے مرنڈے اور بھنے ہوئے چنے بھی رکھ دیئے تھے۔
''جب بھوک لگے رستے میں تو کھا لینا۔ سفر

میں تو ویسے بھی کچھ نہ کچھ کھانے کو دل چاہتا ہے۔" صفدر کمرے میں گیا تو زیتون نے اس سے کہا تھا۔

"اور ہاں یہ اس پوٹلی میں پراٹھے۔ آملیٹ اور اچار ہے۔ ساتھ میں آلو کی بھاجی بھی ہے۔ دوپہر میں کھالینا۔"

زیتون ماں نہیں لیکن اس کی محبت میں ماں جیسی خوشبو تھی۔ جاتے ہوئے زیتون نے اسے لپٹا کر خوب پیار کیا تھا جیسے اس کو احساس ہو گیا تھا کہ اب وہ کبھی اسے نہیں دیکھ سکے گی۔

"اپنے امیر ابا کے پاس شہر جا کر مجھے بھول نہ جانا۔" فضل نے بھی نم آنکھوں کے ساتھ اسے گلے لگایا تھا اور اس کی اپنی آنکھیں بھی نم ہو گئی تھیں۔

"چاچا صفدر نے کہا ہے نا ابھی تو بس ہم انہیں ملنے جا رہے ہیں۔ واپسی پر انہیں ساتھ لے کر آئیں گے۔"

☆☆☆

لیکن پھر وہ کبھی واپس نہیں آسکا تھا اور کئی سالوں بعد جب وہ اماں کی قبر پر آیا تو کوئی اسے پہچانتا نہیں تھا اور خالہ زیتون اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ یہ گاؤں چھوڑ کر کہیں اور جا چکی تھی۔ پر اس روز جب وہ پہلے بس میں اور پھر ریل گاڑی میں بیٹھ کر صفدر چاچا کے ساتھ لاہور کے ریلوے اسٹیشن پر اترا تھا تو اس کے اندر امید اور خوشی کے سینکڑوں چراغ جل رہے تھے اور ان چراغوں کی روشنی جیسے اس کی آنکھوں میں بھی اتر آئی تھی۔ جگر جگر کرتی آنکھوں کے ساتھ اس نے صفدر کی طرف دیکھا تھا۔ جو ایک تانگے والے سے بھاؤ تاؤ کر رہا تھا۔

"چاچا کیا ہم اب بابا کے پاس جا رہے ہیں۔"

"نہیں پہلے ابھی ایک دوست کے پاس سبزی منڈی جا رہے ہیں۔"

شاید یہ وہ ہی دوست ہو گا جس نے چاچا کو پیغام بھجوایا تھا کہ اس کے بابا کا پتا چل گیا ہے۔ اس نے دل ہی دل میں فرض کر لیا تھا وہ تانگے میں بیٹھا حیرانی سے ارد گرد دیکھتا ہوا بے حد خوش تھا بس کچھ ہی دیر کی بات ہے پھر وہ اپنے بابا سے ملے گا۔ پتا نہیں وہ کیسے ہوں گے۔ کیسے ملیں گے اس سے، کئی وسوسے اس کے ننھے سے دل سے لپٹے ہوئے تھے پھر بھی وہ خوش تھا کہ زندگی میں پہلی بار وہ اپنے بابا سے ملنے والا ہے۔

اور منڈی میں چاچا صفدر کے دوست کی دکان تک پہنچتے پہنچتے نہ جانے اس نے کتنی باتیں سوچ ڈالی تھیں وہ انہیں سب بتائے گا اپنے متعلق، اماں اور ماسی زیتون اور جناں کے متعلق وہ سب جو پچھلے برسوں میں بیتا تھا۔ اماں کی بیماری ان کا انتظار، ان کا یقین کہ اگر وہ زندہ ہیں تو ایک روز ضرور انہیں ڈھونڈتے ہوئے آجائیں گے۔ لیکن نہیں جانتا تھا کہ ابھی اس کے نصیب میں ان سے ملنا نہیں لکھا تھا۔

چاچا صفدر کا دوست انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا تھا۔ چند منٹ لگے تھے اسے انہیں پہچاننے میں۔

"ارے یار صفدر تم اچانک کیسے۔" اس نے گلے ملتے ہوئے حیرت کا اظہار کیا تھا۔

"اتنے سالوں بعد کیسے پروگرام بن گیا یہاں آنے کا۔ خط ہی لکھ دیتا تو میں آجاتا اسٹیشن لینے۔ میں اکثر تمہیں یاد کرتا تھا سوچتا تھا تم بھی پتا نہیں کبھی مجھے یاد کرتے ہو گے یا نہیں۔"

"اس آخری ملاقات کے بعد پھر کبھی لاہور آنا ہی نہیں ہوا اور جسے ایک بار یار کہہ دیا پھر بھلا اسے کیسے بھول سکتا تھا۔ اب بھی ایک کام سے آنا ہوا تو پہلے تمہارے پاس ہی آیا ہوں۔ اسٹیشن سے سیدھا آرہا ہوں۔"

اور وہ حیران سا ان دونوں کی باتیں سن رہا تھا۔ چاچا نے تو ماسی زیتون سے کہا تھا کہ اس کے دوست نے ابا کے متعلق پیغام بھجوایا ہے کہ ان کا پتا چل گیا ہے لیکن یہ...... شاید وہ کوئی اور دوست ہو گا۔ دل میں جلتے امید کے چراغوں کی لو ذرا سی دیر کو مدھم ہو کر پھر تیز ہو گئی تھی۔

"چل یار اندر دکان میں چل کر آرام سے بیٹھ

کر بات کرتے ہیں۔ پانی شانی پی کر گھر چلتے ہیں۔ ابا جی ابھی کسی کام سے باہر نکلے ہیں آتے ہوں گے۔''

وہ انہیں دکان کے اندر لے گیا تھا اور انہیں اندر موجود بینچ پر بٹھا کر دروازے میں جا کر کسی کو آواز دی تھی۔ ''اوے چھوٹے بھاگ کر نکڑ سے دو ٹھنڈی ٹھار بوتلیں پکڑ لا۔''

''اتنے سال پہلے رحیم یار خان میں تم سے پہلی بار ملاقات ہوئی اور آخری بار تم نو دس سال پہلے آئے تھے کسی یار کی بارات کے ساتھ۔ اور پھر میرے اصرار پر چند دن میرے گھر ٹھہرے تھے۔''

''اور تم نے چند دنوں میں آدھا لاہور دکھا ڈالا تھا مجھے۔'' صفدر ہنسا تھا۔

''چلو باقی آدھا لاہور اب دیکھ لینا۔'' پھر اس کی نظر اس پر پڑی تھی۔

''یہ بیٹا ہے تمہارا ماشاءاللہ بہت پیارا ہے۔''

''نہیں جاننے والے ہیں میرے ان کا بچہ ہے۔ اسی کے کام سے آیا ہوں۔''

''کام شام ہوتا رہے گا۔ ابا جی آجائیں تو گھر چلتے ہیں۔ اتنا لمبا سفر کر کے آیا ہے۔ آرام کرنا۔ کھانا کھا کر سکون سے ساری بات بتانا۔''

تب ہی ایک ادھیڑ عمر شخص دکان میں آیا۔

''ابا جی یہ صفدر ہے چک مراد شاہ والا آپ نے پہچانا۔'' وہ کھڑا ہو گیا تھا۔

''ارے ہاں صفدر بیٹا کیسے ہو بڑے سالوں بعد آئے ہو۔'' وہ بڑی خوش دلی سے صفدر سے ملے تھے اور پھر اس کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا کر دو انگلیوں سے اس کا رخسار سہلایا تھا۔

''ماشاءاللہ بہت پیارا بچہ ہے کیا نام ہے بیٹا۔''

''جی شہزادہ۔'' اپنا اصل نام اس کی زبان پر چڑھتا ہی نہیں تھا۔

''شہزادہ۔''

وہ اب گہری نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ پھر انہوں نے ایک گہری ٹھنڈی سانس لی۔ ایسی سانس جس میں افسوس تھا دکھ تھا۔

''تمہیں دیکھ کر مجھے کوئی اور یاد آ گیا ہے۔ اسے بھی یہاں منڈی میں سب شہزادہ ہی کہتے تھے۔ اس کا نام مجھے ٹھیک سے یاد نہیں عدنان یا عمران اور اس کے بال بالکل تمہارے جیسے تھے تھوڑے سے گھنگریالے اور گردن تک زلفیں رکھی ہوئی تھیں اس نے اور شاید کچھ اور مشابہت بھی ہے لیکن کیا سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' پھر وہ صفدر کی طرف متوجہ ہوئے۔

''میں تب نو دس سال کا تھا جب میں نے پہلی بار یہاں اسے ابا جی کی دکان پر دیکھا تھا۔ بارہ تیرہ سال کا ہو گا وہ۔ دو تین سال پہلے سوتیلی ماں کے ظلم سے تنگ آ کر گھر سے بھاگ آیا تھا عمر میں فرق کے باوجود میری اس سے دوستی ہو گئی تھی۔ وہ یہاں منڈی میں مزدوری کرتا تھا اور رات کو یہاں ہی ایک دکان پر بنے چوبارے پر دوسرے مزدور لڑکوں کے ساتھ جو آس پاس کے دیہات سے مزدوری کے لیے آتے تھے رہنے لگا تھا۔

میں جو پہلے بھی کبھار ہی ابا جی کی دکان پر آتا تھا اب ہر روز اسکول سے سیدھا دکان پر آجاتا تھا میرے ابا جی اسے سمجھایا کرتے تھے کہ گھر تو گھر ہی ہوتا ہے ماں سوتیلی سہی باپ اور بہن تو سگے ہیں۔ میں خود تمہیں بہاولپور چھوڑ آتا ہوں تمہارے باپ کو بھی سمجھاؤں گا۔

لیکن وہ کہتا تھا ابھی نہیں جب اس قابل ہو گیا کہ سوتیلی ماں مجھ پر ہاتھ نہ اٹھا سکے تب ہی جاؤں گا۔ لیکن اس سے پہلے ہی ایک روز ٹرک پر پھلوں کی پیٹیاں لاتے ہوئے وہ پتا نہیں کیسے سر کے بل گرا۔ سر کا پچھلا حصہ بالکل پچک کر رہ گیا تھا۔ میں نے خود اسے ٹرک پر چڑھتے اور پھر گرتے دیکھا تھا اس نے وہاں ہی دم توڑ دیا۔''

انہوں نے جھرجھری سی لی جیسے وہ منظر اب بھی ان کی آنکھوں کے سامنے آ رہا ہو۔ پھر وہ مدھم سا مسکرائے۔

''میں بھی کیا قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ جلیل بیٹا! تم اپنے مہمانوں کو گھر لے جاؤ۔ آرام کر لیں تھکے ہوئے

آئے ہیں، میں ادھر ہی ہوں تمہیں آنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ صفدر کے دوست کی خالی کی ہوئی کرسی پر بیٹھ گئے تھے۔ بوتلیں پی کر وہ انہیں اپنے گھر لے گئے تھے۔ اس رات وہ ان کے گھر میں ہی رہے تھے۔ بیٹھک میں ان کے سونے کا انتظام کیا گیا تھا۔ چاچا نے کہا تھا کہ صبح ناشتے کے بعد وہ چلیں گے اس کے ابا سے ملنے اور وہ آنکھیں موندے اپنے بابا کے متعلق سوچتے سوچتے جانے کب سو گیا تھا لیکن کچھ دیر بعد ہی اس کی آنکھ باتوں کی آواز سے کھل گئی تھی۔ صفدر چاچا اپنی چارپائی پر تکیئے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے اور سامنے کرسی پر ان کا دوست بیٹھا تھا چاچا صفدر کہہ رہے تھے۔

"یار اس بچے کو کسی مدرسے میں داخل کروانا ہے۔ جہاں دینی تعلیم کے ساتھ کچھ دنیاوی تعلیم بھی دی جاتی ہو۔ ایسے ادارے ہوتے ہیں نا جہاں مفت ہی سب کچھ ہو جاتا ہے کوئی فیس وغیرہ نہیں دینی پڑتی۔ یتیم بچہ ہے۔ تیری بھرجائی نے اس کی ماں سے وعدہ کیا تھا کہ کسی مدرسے میں داخل کروا دے گی۔ ماں کے مرنے کے بعد کوئی ایسا عزیز رشتہ دار بھی نہیں تھا جہاں یہ بچہ رہتا۔ تو تیری بھرجائی گھر ہی لے آئی اسے۔ مجھے اب ذرا فرصت ملی ہے تو اسے یہاں لے آیا ہوں۔ سنا تھا لاہور میں ایسے مدرسے ہیں، نہیں تو پھر کسی یتیم خانے میں داخل کروا دینا۔ میرے اپنے تین بچے ہیں ماں ہے بمشکل گزارا ہوتا ہے میرا۔"

"ہاں ایسے مدرسے ہیں یہاں جہاں بچے حفظ وغیرہ کرتے ہیں۔ ایک مدرسے کے منتظم میرے اچھے جاننے والے ہیں صبح تمہیں وہاں لے جاؤں گا۔"

اور وہ اپنی چارپائی پر لیٹے لیٹے جیسے سرد ہو گیا تھا یوں جیسے کسی نے اس کے وجود سے جان نکال لی ہو۔ چاچا نے تو ماسی زیتون سے کہا تھا کہ وہ مجھے ابا سے ملوانے لے جا رہا ہے۔ لیکن اب جو کچھ چاچا صفدر نے اپنے دوست سے کہا تھا اس کا کیا مطلب تھا کہ وہ اسے اپنے گھر نہیں رکھنا چاہتا اور ماسی زیتون سے جھوٹ بول کر وہ اسے یہاں لے آیا تھا، میں چاچا سے کہوں گا بے شک وہ مجھے اپنے گھر نہ رکھے میں اپنے گھر میں اکیلا بھی رہ سکتا ہوں۔ مجھے ڈر نہیں لگے گا بالکل بھی۔ اور پھر وہاں گاؤں میں تو سب ہی اس سے پیار کرتے ہیں تو پھر ڈر کیسا۔ وہ خود کو تسلی دیتا رہا۔ بار بار آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی تھیں وہ چاچا صفدر کی طرف سے کروٹ کیے جانے کب سو گیا۔

صبح ناشتے میں چاچا کے دوست نے پوریاں، چنے حلوہ اور جانے کیا کچھ منگوا ڈالا تھا لیکن نوالے اس کے حلق میں پھنس رہے تھے۔ دو تین نوالے لے کر اس نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ صفدر چاچا کے دوست نے بہت منتیں کیں لیکن اس نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے نم آنکھوں سے صفدر کی طرف دیکھا تھا۔

"چاچا واپس گاؤں چلیں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔"

جواب میں صفدر نے اسے گھور کر دیکھا تھا اس سے اس کی آنکھوں میں اتنی بے رحمی تھی کہ وہ سہم گیا۔ اور بے بسی سے ہونٹ کاٹنے لگا۔

"پریشان نہ ہو بیٹا میں کبھی کبھار تمہاری خیر خبر لیتا رہوں گا۔"

صفدر کے دوست کو شاید اس پر ترس آیا تھا لیکن چاچا جو اسے ہمیشہ بہت مہربان اور شفیق لگتا تھا اس وقت بہت بے رحم لگ رہا تھا۔ ناشتے کے بعد وہ تانگے میں بیٹھ کر ایک مدرسے میں آئے تھے پتا چلا کہ منتظم صاحب آج کچھ دیر سے آئیں گے۔ صفدر کا دوست انہیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا کہ اسے اپنے سسرال میں کسی فوتگی میں جانا تھا جس کی اطلاع اسے صبح گھر سے نکلتے ہوئے ملی تھی۔

(آخری قسط آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

☆☆

کہو تو نام میں دے دوں اسے محبت کا
جو اک الاؤ ہے جلتی ہوئی رفاقت کا

جسے بھی دیکھو چلا جا رہا ہے تیزی سے
اگرچہ کام یہاں کچھ نہیں ہے عجلت کا

دکھائی دیتا ہے جو کچھ کہیں وہ خواب نہ ہو
جو سن رہی ہوں وہ دھوکا نہ ہو سماعت کا

یقین کرنے لگے لوگ رت بدلتی ہے
مگر یہ بھی کرشمہ نہ ہو خطابت کا

سنوارتی رہی گھر کو مگر یہ بھول گئی
کہ مختصر ہے یہ عرصہ یہاں سکونت کا

چلو کہ اس میں بھی اک آدھ کام کر ڈالیں
جو مل گیا ہے یہ لمحہ ذرا سی مہلت کا

فاطمہ حسن

بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی
لوگ بے وجہ اداسی کا سبب پوچھیں گے
یہ بھی پوچھیں گے کہ تم اتنی پریشاں کیوں ہو؟
انگلیاں اٹھیں گی سوکھے ہوئے بالوں کی طرف
اک نظر دیکھیں گے گزرے ہوئے سالوں کی طرف
چوڑیوں پر بھی کئی طنز کیے جائیں گے
کانپتے ہاتھوں پہ بھی فقرے کسے جائیں گے
لوگ ظالم ہیں ہر اک بات کا طعنہ دیں گے
باتوں باتوں میں میرا ذکر بھی لے آئیں گے
ان کی باتوں کا ذرا سا بھی اثر مت لینا
ورنہ چہرے کے تاثر سے سمجھ جائیں گے
چاہے کچھ بھی ہو سوالات نہ کرنا ان سے
میرے بارے میں کوئی بات نہ کرنا ان سے
بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی

کنول آذر

شگفتہ جاہ

باتوں سے خوشبو آئے

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اگر تم میں سے کسی پر قیامت قائم ہو جائے اور اس کے ہاتھ میں کھجور کا پودا ہو، تب بھی اسے چاہیے کہ اسے گاڑ دے۔''

(مسند احمد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا

☆ سچائی نجات ہے اور جھوٹ ہلاکت۔

☆ سچ بولنا ایمان کا ستون ہے۔

☆ سب سے بڑی خیانت یہ ہے کہ تم کسی سے بات کرتے وقت جھوٹ بولو۔

☆ آدمی کی عزت اس کے سچ میں ہے اور اس کی ذلت اس کے جھوٹ میں۔

ریاکاری

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اپنا سر نیچے کیے ہوئے ہے یعنی یہ ظاہر کر رہا تھا کہ میں پارسا ہوں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے فرمایا۔

''اے گردن کج کرنے والے گردن سیدھی کر! تواضع اور خاکساری کا تعلق دل سے ہے گردن سے نہیں۔''

انسان اور اخروٹ

ہندوستان میں بندروں کے شکاری انہیں پکڑنے کے لیے ایک صندوق استعمال کرتے ہیں جس کے اوپر ڈھکنے میں ایک کھلا سوراخ ہوتا ہے جو اتنا بڑا ہوتا ہے کہ بندر اس میں اپنا ہاتھ ڈال سکتا ہے۔ اس صندوق میں اخروٹ ہوتے ہیں۔ بندر سوراخ سے ہاتھ صندوق کے اندر ڈال کر اخروٹوں سے مٹھی بھر لیتا ہے۔ اب وہ مٹھی کو باہر نکالنے کی کوشش کرتا ہے لیکن سوراخ اتنا چھوٹا ہوتا ہے کہ اس میں سے صرف کھلا ہاتھ ہی نکل سکتا ہے، مٹھی نہیں۔

بندر کو انتخاب کرنا ہوتا ہے کہ یا تو اخروٹ مٹھی سے نکال کر ہمیشہ کے لیے آزاد ہو جائے یا اخروٹ مٹھی میں پکڑے رکھے اور پھنسا رہے۔ لیکن بندر اخروٹ مٹھی میں پکڑے رکھتا ہے اور پھنسا رہتا ہے۔

انسان بندروں سے مختلف نہیں ہیں۔ سارے انسان اخروٹوں کو پکڑے رکھتے ہیں۔ جو انہیں زندگی میں آگے بڑھنے نہیں دیتے۔ ہمیشہ جواز تراشتے رہتے ہیں۔

''ہم یہ کام اس وجہ سے نہیں کر سکے کہ......'' اور ''کہ'' کے بعد ہمیشہ ''اخروٹ'' ہوتے ہیں، جنہیں پکڑے رکھنے کی وجہ سے کامیابی اور ترقی سے دور رہتے ہیں۔

چینی کہاوتیں

☆ سچا دوست سائے کی طرح ہوتا ہے۔ جب سورج چمکتا ہے وہ دور جاتا ہے، جب اندھیرا ہوتا ہے وہ قریب آتا ہے۔

☆ جس کے پاس علم ہے، وہ خزانے کا مالک ہے۔

☆ ایک دن کا استاد، زندگی بھر کا باپ۔

☆ وقت سونے سے بھی قیمتی ہے۔

☆ پہاڑ کو ہلانے والا شخص چھوٹے

پتھر ہٹانے سے آغاز کرتا ہے۔

☆ محنت کا پھل ہمیشہ میٹھا ہوتا ہے اگرچہ وہ کڑوا دکھے۔

☆ عقل مند شخص غلطی کرنے سے پہلے سوچتا ہے، بے وقوف شخص بعد میں افسوس کرتا ہے۔

☆ ایک ہزار میل کا سفر ایک قدم سے شروع ہوتا ہے۔

☆ پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے بے شمار راستے ہوتے ہیں مگر وہاں سے منظر ایک جیسا نظر آئے گا۔

☆ آہستہ چلنے والا زیادہ دور جاتا ہے۔

☆ کاغذ سے آگ کو ڈھانپا نہیں جا سکتا۔

☆ جسے مسکرانا نہیں آتا اسے دکان نہیں کھولنی چاہیے۔

☆ ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہے۔

اعتماد اور تسلی

حکیم اجمل خان کا نام برصغیر پاک و ہند کے مشہور و معروف یونانی طبیب کے طور پر ہمیشہ پہچانا جائے گا ایک بار ان کے پاس ایک مریض لایا گیا جسے کئی حکیم اور ڈاکٹر جواب دے چکے تھے۔

حکیم اجمل خان نے مریض کو دیکھا، تسلی دی اور بغیر دوا دیے کہا۔

”پریشان نہ ہو، تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بس اطمینان رکھو۔“

مریض نے حکیم صاحب کی بات پر یقین کیا اور واقعی کچھ دنوں میں وہ صحت یاب ہو گیا۔ بعد میں لوگوں نے پوچھا کہ دوا کیوں نہ دی؟

حکیم اجمل خان نے فرمایا۔

”بعض اوقات صرف اعتماد، تسلی اور دعا ہی سب سے بڑی دوا ہوتی ہے۔“

سنہری باتیں

☆ جو شخص شہرت کا طالب اور نام و دولت کا خواہاں ہے وہ اللہ کے دین میں صادق نہیں ہے۔

(حضرت ابراہیم ادہمؒ)

☆ اس نادان شخص کے دل کو کبھی سکون میسر نہیں آئے گا جو یہ دیکھ رہا ہے۔ کچھ لوگ اس کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں (اور وہ مقتدئی اور پیشوا بنا ہوا آگے آگے چل رہا ہے)

(حضرت حسن بصریؒ)

☆ اگلے بزرگوں کو زرق برق لباس سے نفرت تھی خواہ وہ پوشاک نئی ہو یا پرانی، لباس ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی شخص اس کا تذکرہ نہ کرے (یعنی معمولی لباس ہو)

(حضرت سفیان ثوریؒ)

☆ کبھی کبھی جرم معاف کر دینا مجرم کو زیادہ خطرناک بنا دیتا ہے۔

(کنفیوشس)

☆ وہ واقعی انسان ہوتا ہے جو مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔

(فیثا غورث)

☆ انسان کو اپنے حال اور مستقبل کا خود سوچ کر پروگرام بنانا چاہیے۔ محض ماضی پر فخر کرتے رہنا احمقوں کا کام ہے۔

(عبیداللہ سندھی)

☆ مصیبت کا نازل ہونا ہلاکت کے لیے نہیں بلکہ امتحان کے لیے ہوتا ہے۔

(حکیم لقمان)

☆ جہاں لوگ ڈاکٹر کو زیادہ محترم مانیں وہ بیمار ذہنیت کے ہیں۔ جہاں لوگ جرنیل کو زیادہ محترم مانیں وہ شدت پسند وحشی ہیں، اور جہاں کے لوگ استاد کو محترم مانیں وہی حقیقی تہذیب یافتہ ہیں۔

(افلاطون)

دستر خوان کا حق

عمر ثعلبی نے ولید بن عبدالمالک کی ہجو کہی، ولید نے اسے سزا دینا چاہی، وہ دمشق سے بھاگ گیا اور مدت تک کہیں روپوش رہا۔ جب اس چوروں کی سی

زندگی سے اکتا گیا تو ناچار دمشق واپس آ گیا اور ایک دن موقع پا کر ولید کے پاس جا پہنچا۔ ولید کھانا کھا رہا تھا، نظر بچا کر، دستر خوان پر جا بیٹھا اور کھانے میں شریک ہو گیا۔

جب کھانا بڑھایا جانے لگا اور لوگ اٹھنے لگے، تو حاضرین میں سے کسی نے عمر کو پہچان لیا اور ولید کو بتا دیا۔ ولید نے قریب بلایا اور کہا۔

''بدنصیب! اللہ کا شکر ہے کہ میں نے ابھی بدلہ لینے کی قسم نہ کھائی تھی کہ تو آ گیا۔'' پھر بولا۔

''اچھا ذرا میری وہ ہجو تو سناؤ۔''

عمر کچھ دیر تو انتظار کرتا رہا، لیکن جب ولید نے بہت مجبور کیا تو اس نے ہجو سنا دی، ولید نے کہا۔

''بھلا بتا تو میں تجھے کیا سزا دوں گا۔''

عمر نے جواب دیا۔ ''میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو گیا آپ کے دستر خوان پر بیٹھ چکا اور آپ کے ساتھ کھانے میں شریک ہو چکا ہوں، اس کے بعد خواہ کتنا ہی بڑا گناہ کر چکا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ آپ مجھے سزا نہ دیں گے۔''

ولید نے کہا۔ ''بے شک! دستر خوان کے حق کے مقابلے میں تیرے گناہ کی کوئی حقیقت نہیں۔''

چنانچہ نے اس نہ صرف عمر کو معاف کیا، بلکہ انعام دیا۔ کہا جاتا ہے کہ کوئی کیسا ہی مجرم کیوں نہ ہو اگر اس کے دستر خوان پر پہنچ جاتا تھا تو معاف کر دیا جاتا تھا۔

تعریف وستائش

☆ ہر کوئی تعریف وستائش کا خواہش مند ہوتا ہے۔

(ابراہام لنکن سابق امریکی صدر)

☆ انسانی فطرت میں یہ بات بہت اہم ہوتی ہے کہ اس کے اصولوں اور کاموں کی تعریف کی جائے۔

(ولیم جیمز)

☆ ایک انسان کے اندر سب سے بڑی خواہش اپنے آپ کو نمایاں کر کے پیش کرنے کی ہوتی ہے۔

(امریکی فلاسفر جان ڈیوی)

☆ کسی کے اچھے کام کی تعریف وستائش کرنا، اسے سراہنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو دوسروں کی خوبیوں کی تعریف کریں۔ تعریف کرنے میں بہت زیادہ طاقت ہے اس سے اپنے اور غیر سب مطیع ہو جاتے ہیں۔

ابوالکلام آزاد

دانش ور کہتے ہیں

☆ بوجھ میں اگر محبت نہ ہو تو وہ بے شک ایک تنکے کا ہو، نا قابل برداشت ہوتا ہے۔

(مستنصر حسین تارڑ)

☆ عورت اگر ''ناں'' کہہ دے تو مطلب ہوتا ہے ''شاید'' اگر وہ ''شاید'' کہہ دے تو مطلب ہوتا ہے ''ہاں'' اور اگر وہ ہاں کہہ دے تو سمجھ لو وہ عورت ہی نہیں۔

(ممتاز مفتی)

☆ نہانے سے سو بیماریاں دور ہو جاتی ہیں لیکن نہ نہانے سے جو بیماریاں دور رہتی ہیں، ان میں سے ایک ''محبوبہ'' بھی ہے۔

(مشتاق احمد یوسفی)

☆ ''بدصورت'' کی جو حرکت ''بدتمیزی'' کہلاتی ہے وہی ''خوب صورت'' کرلے تو ''ادا'' کہلاتی ہے۔

(ڈاکٹر محمد یونس بٹ)

☆ دو بے وقوف مل کر ایک عقل مند نہیں بن سکتے، میاں بیوی بن سکتے ہیں۔

(ڈاکٹر یونس بٹ)

☆☆

اس ماہ کی مسکراہٹیں

سچ

ایک لڑکی کو پیٹ کی تکلیف کی وجہ سے ڈاکٹر کے پاس لایا گیا۔

''کیا کھایا تھا؟'' ڈاکٹر نے نوجوان لڑکی سے پوچھا۔

''برگر، فرائز، پیزا اور کوک۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''یہ فیس بک نہیں ہے، سچ سچ بتاؤ۔'' ڈاکٹر نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔

''جی ٹینڈے کھائے تھے۔'' لڑکی نے نظریں نیچی کر کے آہستہ سے کہا۔

وجہ

اسپتال میں ایڈمٹ ایک شخص کے متعلق نرسیں بات کر رہی تھیں۔ ایک نے کہا۔

''میرے خیال میں سامنے والے بیڈ کے مریض کی بیوی اسے ٹھیک نہیں ہونے دے گی۔''

''کیوں، کیا کوئی بات ہوئی ہے؟'' دوسری نرس کو تجسس ہوا۔

''ہاں آج جب اس کی بیوی آئی تو مریض کا حال احوال پوچھنے کے بجائے بولی۔

''کل مارکیٹ میں بہت خوب صورت برانڈڈ سوٹ بہت اچھا لگا تھا۔ اجازت ہو تو خرید لوں۔''

احتیاط

امریکن خواتین دیگر معاملات کے علاوہ دوران ڈرائیونگ میں بے حد محتاط رہتی ہیں ان کی پوری کوشش ہوتی ہے کہ وہ حد درجہ احتیاط سے اور قوانین پر عمل درآمد کرتے ہوئے ڈرائیونگ کریں۔

سفر کے دوران ایک خاتون ڈرائیور سے ان کے پاس بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے پوچھ لیا۔

''آپ کی عمر کتنی ہے؟''

خاتون ڈرائیور نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔

''کوئی شخص گاڑی ڈرائیور کر رہا ہوں تو اس سے ایسے سوال نہیں پوچھنے چاہئیں، جن کا جواب سوچ سمجھ کر دینا پڑے۔''

حفظ ما تقدم

شوہر نے بیگم کو دفتر سے فون کر کے کہا۔

''بیگم! مجھے اسٹیج ڈرامے کے دو پاس ملے ہیں۔ ہم دونوں کو ڈرامہ دیکھنے جانا ہے۔'' بیگم نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے میں جانے کے لیے تیاری شروع کرتی ہوں۔''

''ہاں فوراً تیار ہونا شروع کر دو، پاس کل کے شو کے لیے ہیں۔'' شوہر نے جواب دیا۔

مماثلت

ایک صاحب نے اپنی بیوی کے مغالطے میں راستے میں ایک خاتون کا ہاتھ پکڑ لیا مگر فوراً ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا وہ بے حد شرمندہ ہوئے اور خاتون کا ہاتھ چھوڑ کر بولے۔

''معاف کیجیے گا محترمہ! محض غلط فہمی کی بنا پر میں آپ کو اپنی بیوی سمجھ بیٹھا تھا۔''

''قسمت پھوٹ گئی اس عورت کی جسے تم جیسا بے وقوف اور بدصورت شوہر نصیب ہوا۔ کبھی آئینہ میں اپنی شکل دیکھی ہے۔''

''خدا کی پناہ محترمہ! آپ کی صورت ہی نہیں بلکہ گفتگو بھی میری بیوی جیسی ہے۔'' وہ صاحب حیرت سے بولے۔

☆☆

بقیہ خط آپ کے

لگتا تھا۔لیکن اب پڑھ کر زین پر بہت غصہ آیا۔منگیتر بھی نہیں منکوحہ ہے زیمل ،بات کر کے غلط فہمی دور کر کے جاتا۔لیکن کانوں کا کچا۔جس نے جو بات بھی بولی بس زیمل سے ناراض ہوگیا۔"گوشت کے پکوان" اتنے سارے دیکھ کر منہ میں پانی آگیا۔امی نے عید والے دن کلیجی بھی اچھی بنائی اور کباب بھی بڑے مزے کے بنائے۔

ج: پیاری رضوانہ! ہمیں احساس ہے کہ دوستوں سے بات کر کے آپ کو خوشی ہوتی ہے۔کچھ دیر کے لیے آپ اپنی بیماری بھول جاتی ہیں۔اسی لیے ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ماہ آپ کا خط ضرور شامل کیا جائے اگر کوئی آپ سے رابطہ کرنا چاہتا ہے۔کوئی دعا یا ڈاکٹر کے بارے میں بتانا چاہتا ہے تو ہم آپ کا نمبر دے دیتے ہیں لیکن ہم ہر قاری کا نمبر نہیں دے سکتے۔آپ کے علاوہ ہم نے آج تک پرچے میں کسی کا نمبر بھی شائع نہیں کیا۔

آپ کو بھی مشورہ دیں گے کہ ہر کسی پر اعتبار نہ کریں اور کوئی دوائی ڈاکٹر کے مشورے کے بغیر استعمال نہ کریں ۔آپ بہت معصوم ہیں۔آپ کو اندازہ نہیں لوگوں کے کتنے چہرے ہوتے ہیں۔آپ سے کوئی کسی کا نمبر مانگے تو آپ صاف انکار کر دیں۔کسی کا نمبر کسی دوسرے کو نہ دیں۔ہر ایک سے دوستی نہ کریں۔آپ نہیں جانتیں کہ اس سے آپ کی زندگی میں کتنے مسائل ہو اور الجھنیں پیدا ہو سکتی ہیں۔اللہ نہ کرے کہ آپ کے ساتھ کوئی فراڈ ہو۔

آپ پچھلے دو ماہ سے ہم سے جو نمبر مانگ رہی ہیں۔اس کے لیے معذرت۔

ریحانہ وقاص......لاہور

آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل جیسا محاورہ شاید ہمارے لیے ہی بنایا گیا ہے۔اگر ہم خط نہ لکھ سکے تو کسی نے ہمارا پتہ نہیں کیا۔ملتے رہے تو اسلام علیکم ورنہ اللہ حافظ۔

چلیں جی مرضی ہے ادارے کی اور ان میں لکھنے والوں کی۔اس سے یہ تو پتا چلا کہ ہم کو اتنے بھی اہم نہیں کہ ہمیں اہم سمجھا جائے۔

بہت ساری کہانیاں نامکمل اپنے مکمل ہونے کا انتظار کر رہی ہیں۔لیکن وقت ایسے گزر جاتا ہے کہ ان کے ساتھ ساتھ بہت سے کام بھی ادھورے رہ جاتے ہیں۔وجہ شاید بلکہ یقیناً میری فجر کی نماز کا قضا ہونا ہے۔"جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے" دکھی تھا۔

"ابھی کچھ دن لگیں گے" گھریلو پر اثر تحریر تھی "کامیاب عورت" ڈراؤنی تحریر تھی کہ مرد اپنے سے اوپر عورت کو اگر برداشت نہ کر سکے تو اس کے اوپر ایک اور عورت لا کر بٹھا دیتا ہے۔"چاندی کے گھر" پر اثر کہانی تھی۔

"ادھوری دعا" پڑھ کر مزا آ گیا۔ہمارے ساتھ الٹا ہوا۔ہماری سسرال زندہ باد۔سادہ اور صرف سادہ کھانا کھانا پسند کرتا ہے۔ایک دن گوشت بن جائے تو اس کی گرمی چار دن نہیں جاتی۔دالیں سبزیاں جتنی مرضی کھاؤ اور پکاؤ۔

ج: پیاری ریحانہ! آپ نے کیسے سوچ لیا کہ ہم نے آپ کو یاد نہیں کیا۔بس یہ ہے کہ ہم نے پرچے میں آپ کا نام لکھ کر آپ کو یاد نہیں کیا۔شرکت کا شکریہ۔آپ کے افسانے مل گئے ہیں

زوبیہ لکھتی ہیں

کچھ عرصہ پہلے شعاع سے رابطہ ٹوٹا تو کافی عرصے تک بحال نہ ہو سکا۔پہلے جس قریبی قصبے سے رسالے منگوایا کرتی تھی وہاں سے پتا کیا تو پتا چلا وہ لائے ہی نہیں۔خیر مئی اور جون کا شمارہ ادارے سے منگوایا اور یہ تجربہ بڑا اچھا رہا۔

شمارے کا سب سے خوب صورت سلسلہ "تاریخ کے جھروکے"۔"باتوں سے خوشبو آئے" میں تمام باتیں خوشبودار تھیں، خصوصاً "شعور کی اہمیت"

"چاند کی عید" افشاں آفریدی کی ہلکی پھلکی تحریر تھی، بس نائرہ کا بات بات پہ رونے والا سین ذرا غیر حقیقی سا لگا۔"بس وفا کے لیے" دانیہ سمیع کی خوب صورت تحریر، بہت اچھا سبق دیا اس تحریر نے۔

مریم انصاری کا "یہ رسمیں" بہت مختصر لیکن بہت اچھا، شاید یہ اس سے زیادہ لکھا جاتا تو خوب صورتی کھو دیتا۔

"کیا بنے گا شیبا کا" نازنین فردوس نے اچھا لکھا

یہ ایک حقیقت ہے اور آج کل بچیاں اس بات پہ فخر کرتی نظر آتی ہیں کہ مجھے تو کچھ نہیں کرنا آتا۔ اور لڑکیوں کے اس جملے سے تو مجھے باقاعدہ چڑ ہوتی ہے کہ مجھے انڈہ ابالنا بھی نہیں آتا۔ سمیرا حمید نے ایک ناول شروع کیا تھا "مشک بام" کیا وہ اب تک مکمل نہیں ہوا؟

ج: پیاری زوبیہ! آپ کا خط تاخیر سے موصول ہونے کے باوجود ہم نے شامل کرلیا ہے۔

شعاع کی محفل میں آپ نے شرکت کی، بہت خوشی ہوئی۔ اب باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

ایچ ایس ایچ...... تحصیل سمبڑیال سے شریک محفل ہیں

شعاع ہمیں عید سے ایک دن پہلے ملا۔ قصہ کچھ یوں ہے کہ ہم رسالہ خرید کر ہاتھ میں تھامے دوسری اشیاء کی خرید وفروخت کر رہے تھے کہ جوتا مارکیٹ میں ایک شاپ پر ہمیں ایک لڑکی ملی۔ ہم جوتے دیکھ رہے تھے کہ اس نے ہمیں متوجہ کیا اور شعاع کی بابت پوچھا اور کہا کیا میں اس کو ایک نظر دیکھ لوں ہم نے بھی جھٹ شاپر سے نکال کر انہیں دکھایا وہ بڑی خوش ہوئی۔

اس نے بتایا کہ وہ بھی پڑھتی ہے پر پرانے کہ نئے وہ خرید نہیں سکتی اور یہ بھی بتایا کہ وہ شادی شدہ ہے اور ساتھ نو دس سال کا بچہ اس کا ہے، ان رسالوں کی ایک خاموش قاری سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ پلازہ میں گئی، جلدی سے پرچہ کھول کے اپنا خط دیکھا تو خوشی کی انتہا نہ رہی پھر سروے میں دوڑ لگائی خود کو موجود پا کر دل شاد شاد ہوگیا۔ ایمن علی کے ناول "چاندی کے گھر" پیتل سے چاندی کا ہی رخ اختیار کیا بہت خوب ایمن علی۔ وہی جو لڑکا ایک گھر کی طرف نہ چاہتے ہوئے بھی گاڑی موڑ لیتا ہے اور ادھر ایک ماڈرن لڑکی کو نکلتے دیکھتا ہے اس کی وضاحت نہیں ہوئی اور شکر ہے ماہم نے نکاح کیا تھا ورنہ ہم بہت غصہ تھے اس کے علی کے ساتھ یوں رہنے پر۔ افشاں آفریدی کا ناول بھی شاندار رہا نگہت سیما ناول ختم ہونے پر رائے دیں گے، دھوپ دریچہ میں ضامن بہت خوب صورت کردار ہے اس کی اپنے باپ کے لیے محبت اور فکر بہت پسند آئی، انٹرویو میں احد رضا کو دیکھ کر دل باغ باغ ہوگیا۔

تسنیم کوثر! سروے میں آپ نے ترکیب بھی بتائی تھی۔

ج: عزیز بہن! ماڈرن لڑکی ماہم اور لڑکا ہارون تھا۔

زرینہ خانم لغاری مظفر گڑھ سے شریک محفل ہیں

جون کا شمارہ ملا سرورق پر ایک معصوم سی اداس حسینہ بالوں میں پھول لگائے آدھے بال کندھے پر لٹکائے پیاری لگی۔ آگے بڑھے عیدالاضحیٰ کے رنگ دیکھے، سب بہنوں کے الگ الگ رنگ تھے۔ رضوانہ وقاص نے کرلاں کی بہت اچھی طرح وضاحت کی شکریہ، دھوپ دریچہ کھل کے کہانی سمجھ میں آرہی ہے قانتہ رابعہ کی کہانی ہو اور کوئی مثبت پیغام نہ ہو، ہو ہی نہیں سکتا۔ چاند کی عید بہترین گھریلو کہانی تھی۔ قربانی سے پہلے خواہ مخواہ ضد اور تکبر کی کہانی تھی۔ اف چاندی کا گھر پچھلی قسط میں جب ماہم اکیلی تڑپ رہی تھی ہم پورا مہینہ تجسس میں رہے۔ ہارون کا کردار بہت پسند آیا کیسے اپنے باپ کو آئینہ دکھایا۔ لیکن پھر ادھوری سی کہانی لگی، دکھانا چاہیے تھا کہ علی صہیب رشتہ لینے چلے گئے۔ اب ہارون اور بیلا کا ملن کیسے ہوا۔ شیبا کا کیا بنے گا ویسے عام طور پر بھی دیکھا گیا ہے ایسی لڑکیوں کا رشتہ بہترین ہو جاتا ہے۔ میری خالہ ساس تجربے کی بنا پر کہتی تھیں کہ ماؤں اپنی بیٹیوں کو پھوہڑ، نکمی اور سست بناؤ۔ عموماً ان کی قسمت اچھی ہوتی ہے قابل، ذہین سگھڑ کئی دفعہ رل رہی ہوتی ہیں۔۔۔ یہ رمیس نے تو ہنسا کر لوٹ پوٹ کر دیا۔ بس وفا کے لیے کہانی میں سبق تھا کہ ہر لڑکی کا جوڑا اللہ کی طرف سے بنا ہوا ہوتا ہے دیر سویر ہو جاتی ہے۔ ماں باپ پریشان نہ ہوا کریں اللہ پر توکل رکھیں دعا کریں۔

ج: پیاری زرینہ! سروے طوالت اختیار کر گیا اس لیے پچھلے ماہ آپ کا خط شامل نہ ہو سکا۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہیں، آپ نے لکھا ہے کہ عموماً بدسلیقہ اور پھوہڑ لڑکیوں کی قسمت بہت اچھی ہوتی ہے۔ قسمت کا تو پتا نہیں لیکن پھوہڑ، بدسلیقہ لڑکیاں آپ کے صبر کا امتحان ہوتی ہیں، گھر میں بے برکتی، ہر چیز کا

بے محابا استعمال اور ضیاع۔ بکھرا ہوا گھر، اپنا حلیہ بھی خراب، گھر کے کا حلیہ بھی خراب، کچن میں جاؤ تو جھوٹے برتنوں کا انبار اور سب سے زیادہ بے رونق اور بدذائقہ کھانے تو حلق سے ہی نہیں اترتے، قسمت اچھی ہے بری اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے لیکن ہماری رائے میں لڑکیوں میں سلیقہ ضرور ہونا چاہیے۔

آپ نے بہت اچھی اور سچ بات لکھی ہے کہ شادی میں دیر سویر ہو سکتی ہے۔ اللہ پر توکل رکھنا چاہیے۔

تسنیم کوثر نے کراچی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

اس بار تو تمام ناولز اور افسانوں نے ریکارڈ توڑ دیے ماشاءاللہ کسی نے بھی کوئی تنقید کرنے کی گنجائش ہی نہیں چھوڑی تو بہت سی دعائیں شعاع کے لیے۔ خاص طور پر ایمن علی کا لاجواب ناول چاندی کے گھر کی تعریف جتنی بھی کی جائے کم ہے۔ بہترین دل گداز اسٹوری نے دل چھولیا۔ اور دانیہ سمیع کا ناولٹ بس وفا کے لیے کا بھی جواب نہیں۔ اس کے علاوہ نگہت سیما کے ماء الملوک کو بھی شاندار ناولز کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اگر زیب النساء زندہ رہتی تو اس کہانی کے اینڈ میں چار چاند لگ جاتے۔

مریم عزیز کے دھوپ دریچہ کو اچھا کہہ سکتے ہیں لیکن ابھی تک اسٹوری میں دلچسپی تھوڑی سی کم ہی ہے۔

افسانوں میں قانتہ رابعہ کا افسانہ کہکشاں جگمگ دل کو لگا تو قربانی سے پہلے قربانی کو مریم طاہر نے پیارا سا لکھا۔

نازنین فردوس کا کیا بنے گا شیبا کا میں بہت مزا آیا۔ حمیرا شفیع نے بہت پیارا اور شاندار لکھا ویسے بھی حمیرا ہمیشہ ہی عمدہ لکھتی ہیں۔ اور عیدالاضحیٰ کے رنگ پر سروے بہت بہت اچھا لگا سب ہی کا انداز تقریباً ملتا جلتا ہی رہا۔ اب بات خط آپ کے پر کی جائے تو یوں سمجھیے کہ یہ محفل تو شعاع کی جان ہے۔ پیارے شعاع کی تمام پیاری قارئین اللہ تعالیٰ آپ سب کو بہت خوش رکھے۔ ہماری دعائیں آپ سب کے لیے ہیں اور پیاری انمول دعا آپ تو یقیناً ہم سے بہت چھوٹی ہیں تو آپ باجی آنٹی جو بھی سمجھیں ٹھیک ہے نا۔

ج: پیاری تسنیم! شعاع آپ کو پسند آیا۔ تہہ دل سے شکریہ۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

صدف ناصر گوجرانوالہ سے شریک محفل ہیں

چاند رات کو "شعاع" نے گھر آ کر عید کا مزہ دوبالا کر دیا۔ "پہلی شعاع" اچھی لگی۔ خاص طور پر "پاکستانی عوام" کی تعریف بہت بھائی۔

"پیارے نبی ﷺ کی پیاری باتیں" قربانی کے مکمل مسائل اور فضائل سے مستفید ہوئے۔ ہمیں اس سال الحمدللہ "دنبہ" ذبح کرنے کی توفیق عطا فرمائی اللہ نے۔

"احد رضا میر" سے ملاقات کروا کر شاہین نے سب کو خوش کر دیا۔ خدیجہ۔ مومنہ کی طرف سے شکریہ قبول فرمائیں شاہین۔

"عیدالاضحیٰ کے رنگ" بہت اچھے لگے۔ کیونکہ زرینہ خانم، تسنیم، گوشی، رضوانہ، ریحانہ چوہدری بھی شریک محفل ہیں۔ سب سے مل کر خوشی ہوئی۔ ریحانہ چوہدری کے بڑے بھائی جان کی وفات کا دلی دکھ ہوا۔

"دھوپ دریچہ" کی سیر کو گئے۔ "ضامن" نے بہت بہت اچھا کیا۔ اپنی پھوپھو کی بیماری کا والد صاحب کو بتا کر۔ حارث اور کومل کی صد شکر اس ماہ ملاقات نہیں ہوئی، سخت کوفت ہوتی ہے۔ افشاں آفریدی نے زبردست طریقے سے "چاند کی عید" کروائی۔ حقیقی زندگی میں بس چند، گھرانے ہی رہ گئے ہیں، سلوک اتفاق، محبت رواداری نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہی۔

"چاندی کے گھر" مدتوں یاد رہے گی۔ "ماہم" کو لاکھ بروکن فیملی کی بے چاری لڑکی کہا جائے مگر وہ بے چاری ہرگز نہیں۔ اللہ نے ایک جانب سے محروم رکھا تو دوسری کئی جانب سے بے حد نوازا بھی۔ وہ انتہائی ذہین اور ٹیلنٹڈ تھی۔ بہترین سلائی اور کوکنگ آتی تھی۔

وہ اپنی صلاحیتوں کو صحیح طریقے سے بروئے کار لاتی تو کامیاب زندگی گزرتی۔ لاکھ ماہم کے ماموں

... ان کا دوبدو مقابلہ کیا، کبھی اچھا بننے کی کوشش نہیں کی۔ ایمن علی ویری ویری ویل ڈن! ہم سب کو تحریر بے حد اچھی لگی۔

بات ہو جائے ذرا ''ماء الملوک'' کی تو صد شکر سمیرا کی اصلیت کھل کر سامنے آ گئی۔

اگلی آخری قسط دیکھ کر دل بے حد اداس ہو رہا ہے۔ کیونکہ پورا ماہ دل ''موروں والی حویلی'' میں اٹکا رہتا تھا۔ ''بس وفا کے لیے'' دانیہ سمیع نے شاندار ناولٹ عید گفٹ کیا ہمیں۔

''افسانے'' قطار در قطار کھڑے ہیں۔ کہکشاں جگمگ نے بے حد متاثر کیا۔ ''سارا'' کی نیک دلی اور سمجھ داری قابل تقلید ہے۔ نعیمہ ناز اور راشدہ رفعت بھی منظر سے غائب ہیں۔ براہ کرم واپسی کی راہ لیں۔

''گل بہار کی عید'' منفرد نام اور مزے کی نئی تحریر۔ ''قربانی سے پہلے قربانی'' مریم طاہر نے بہت خوب صورت لکھا۔

''کیا بنے گا تیرا شیبا'' دلچسپ تحریر ہے۔ محترمہ شیبا نے رس گلے سے خوب محبت نبھائی۔ پر پتا نہیں کیوں ہمیں گلاب جامن بھاتے ہیں رس گلے نہیں۔ (ہاہاہا) آپ بتائیں، آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟؟

''یہ رسمیں'' مریم انصاری نے انتہائی مختصر مگر جامع تحریر لکھ کر نہ صرف ہنسا دیا بلکہ صدیوں پرانی رسم کو بھی بدل ڈالا۔ بھئی دلہن کے ساتھ جڑ کر بیٹھنے میں کوئی مزا ، بلکہ تمام رشتہ داروں کے ساتھ کر آنے میں بہت ہی انجوائے منٹ اور خوشیاں ہیں۔ پو... ستہ ہلا گلا کرتے گزرتا ہے۔ ایک دفعہ ہی دلہن کی گاڑی میں بیٹھے تو تاعمر توبہ کریں۔ (ہاہاہا)۔

ج: پیاری صدف! آپ نے تو ہمیں بڑے امتحان میں ڈال دیا۔ گلاب جامن اور رس گلے میں انتخاب کیسے کر سکتے ہیں۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ میٹھا ہو اور بہت سارا ہو۔ ساری مٹھائیاں، ساری سویٹ ڈشز ہمیں بے حد پسند ہیں۔ میٹھا نہ ہو تو ہمیں سارا جگ سونا سونا لگتا ہے۔ اس لیے اس انتخاب کو آپ رہنے دیں۔

شعاع پر آپ کا تبصرہ تو ہمیشہ ہی بہت اچھا ہوتا ہے۔ اس بار بھی آپ نے تمام کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ کیا۔ پڑھ کر مزا آیا۔ قارئین سے معذرت کہ صفحات کی کمی کی وجہ سے وہ اس سے لطف اندوز نہیں ہو سکے

گوشی جمال منڈی یزماں سے شریک محفل ہیں

''پیارے نبیؐ کی پیاری باتیں قربانی کے حوالے سے معلومات نے خاطر خواہ اضافہ کیا۔ آٹھ سال کے وقفہ کے بعد بالآخر آپا شاہین کی نظروں میں احمد رضا میر دوبارہ سے آ گئے عید الضحیٰ کے رنگ میں ایویں نظریں اپنے رنگ پہ جا ٹھہریں باقی بہنوں کے رنگ سے خوشی کے کئی رنگ خوش نما محسوس ہوئے۔

حقائق پہ مبنی حالات و واقعات کو الفاظ میں دلکشی سے سموئے نئی لکھاری ایمن علی نے کامیابی سے عمدہ تحریر سے روشناس کروایا۔ دونوں اقساط سے فیض یابی ایک ساتھ پائی۔

''دھوپ دریچہ'' کی تمام تر خوب صورتی کریکٹر زیمل اور ضامن پہ مشتمل ہے۔ ایک ہی نشست میں پڑھنے کا مزہ آتا ہے۔

شاباش مریم عزیز سلامت رہو۔ مدت بعد افشاں آفریدی کو ''چاند کی عید'' کی صورت ہلکی پھلکی مزاح پہ مبنی تحریر نے دل خوش کر دیا۔ افسانے سارے عید کی مناسبت سے تھے۔

نگہت سیما جی! ایسی بھی کیا جلدی ہے کافی عرصے بعد اتنی عمدہ آئی ہے۔ آخری قسط کا پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا۔ ''بس وفا کے لیے'' دانیہ سمیع لیے پیش خدمت، تحریر کو میں نے اپنے دل کے بہت قریب محسوس کیا۔

ج: گوشی جی! آپ نے عید پر دکان کے رش اور مصروفیت کے باوجود پرچا پڑھا اور وقت نکال کر ہمیں خط بھی لکھا۔ بہت شکریہ۔

☆☆

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

جامع حضرت ابوایوبؓ

استنبول میں جس مقام کو سب سے زیادہ مقدس اور متبرک سمجھا جاتا ہے وہی ہے جہاں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشہور صحابی حضرت ابوایوب انصاریؓ کا مزار ہے۔ حضرت ابو ایوبؓ نے استنبول کے ابتدائی اسلامی حملے میں وفات پائی تھی اور آپ کی وصیت کے مطابق میت کو استنبول سے قریب لے جا کر دفن کیا گیا تھا۔ مرقد کی جگہ ہموار کر دی گئی تھی تا کہ کوئی شخص بے حرمتی کا مرتکب نہ ہو سکے۔ مسیحیوں کو انتباہ بھی کر دیا گیا تھا کہ اگر اس مقدس مقام کی بے حرمتی ہوئی تو سلطنت اسلامیہ میں کہیں بھی ناقوس نہ بج سکے گا۔

ویسے بھی کم و بیش آٹھ سو سال تک مرقد کا نشان باقی رہنا ممکن نہ تھا کیونکہ کوئی اس کی نگرانی اور دیکھ بھال کرنے والا نہ تھا۔ فتح استنبول کے بعد سلطان فاتح کی سب سے بڑی آرزو یہ تھی کہ اس مرقد کا صحیح نشان مل جائے بیان کیا جاتا ہے کہ سلطان کے عہد میں شیخ شمس الدین ایک خدا رسیدہ بزرگ تھے۔ انہیں خواب میں حضرت ابوایوبؓ کے مرقد کا نشان دکھایا گیا اور انہوں نے سلطان کو اس سے مطلع کیا۔ چنانچہ شیخ شمس الدین کے نشان زدہ مقام پر مزار تعمیر ہوا۔ ساتھ ہی ایک جامع مسجد بنوا دی گئی۔ جس کا سن تعمیر 1463ء سے 1469ء تک بتایا جاتا ہے۔ گویا یہ جامع مبارک بھی استنبول کی قدیم ترین اور آباد ترین مسجدوں میں سے ہے۔ اگرچہ شہر سے باہر اور آبادی سے دور ہے تاہم وہاں ہر روز میلہ سا لگا رہتا ہے اور جمعہ کے دن تو زن و مرد بکثرت زیارت کے لیے وہاں پہنچتے ہیں۔

سلاطین عثمانیہ کے زمانے میں یہ دستور تھا کہ ہر سلطان تاج پوشی کے بعد حضرت ابوایوب انصاریؓ کے مزار پر پہنچتا اور تبرک و تیمن کی غرض سے وہاں بانی خاندان سلطان عثمان کی تلوار کمر پر باندھتا۔ یہاں ایک بہت بڑا قبرستان بھی بن گیا ہے کیونکہ اکثر لوگ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس صحابی کے قریب دفن ہونا باعث برکت سمجھتے تھے۔

علامہ اقبالؒ نے اپنی نظم ”بلاد اسلامیہ“ میں استنبول کو بھی شامل کیا تھا اور اس سلسلے میں حضرت ابو ایوب انصاریؓ بہ طور خاص ان کے پیش نظر رہے تھے۔ فرماتے ہیں۔

نکہت گل کی طرح پاکیزہ ہے اس کی ہوا
تربت ایوب انصاریؓ سے آتی ہے صدا
اے مسلماں! ملت اسلام کا دل ہے یہ شہر
سیکڑوں صدیوں کے کشت و خون کا حاصل ہے یہ شہر

(بانگ درا ص 157-156)

مغلوں کا شاہی باورچی خانہ

کام و دہن کی لذت ہمیشہ سے انسان کو خوشی و مسرت دیتی رہی ہے۔ اسی وجہ سے انسان نے غذا کو لذیذ بنانے میں زیادہ سے زیادہ اختراعات کیں، بادشاہ اپنے مال و دولت کی وجہ سے اس بات پر قادر تھے کہ وہ پرتکلف کھانے تیار کرائیں اور ان سے لطف اندوز ہوں۔

شاہی باورچی خانے صرف بادشاہ کے لیے کھانا تیار کرتا تھا۔ بلکہ اس کے حرم اور امراء کے لیے بھی، ہم مرتبہ لوگوں کو کھانا کھلانا مہمان داری اور میزبانی تھی۔ تو غربا کو اس میں سے کچھ دینا، فیاضی و سخاوت اور غربا پروری تھی۔

چونکہ بادشاہ کی ذات اکیلی و تنہا نہیں ہوتی تھی۔ اس کے ساتھ اس کا خاندان درباری اور ملازم ہوا کرتے تھے۔ اس لیے شاہی باورچی خانے میں ان سب کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اس لیے شاہی محل کا سب سے بڑا شعبہ ”باورچی خانہ“ کا ہوتا تھا۔ اسے سہولت کی غرض سے مختلف حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جہاں مختلف قسم کے کھانے، مشروبات تیار ہوتے تھے۔ جیسے رکاب خانہ، آبدار خانہ، میوہ خانہ، شربت خانہ، تمبل خانہ اور آفتابچی خانہ، باورچی

خانہ میں جو عہدے دار ہوتے تھے۔ ان میں میر بکاول، خزانچی، ذائقہ چکھنے والے، محرر اور ماہر باورچی ہوتے تھے۔ ان سب کا نگران وزیراعظم خود ہوا کرتا تھا۔

باورچی خانہ کا سالانہ خرچہ خزانچی تیار کرتا تھا اور اس کی منظوری مرکزی خزانہ کے عہدے دار کرتے تھے۔ باورچی خانے میں جن اشیاء کی ضرورت ہوتی تھی۔ انہیں لا کر محفوظ کر دیا جاتا تھا۔ اس کام کی نگرانی دیوان بیوتات کیا کرتا تھا۔ سب سے عمدہ قسم کے چاول جیسے سکھداسی، دیوزیرہ اور جن جین ایک سال کے لیے جمع کر کے رکھ دیے جاتے تھے۔ حصار فیروزہ سے گھی آیا کرتا تھا مرغابیاں، زعفران اور کچھ ترکاریاں کشمیر سے آتی تھیں۔ اندازہ لگایا گیا تھا کہ باورچی خانہ کا روزانہ کا خرچہ ایک ہزار روپیہ تھے۔

جب باورچی کھانا پکانے میں مصروف ہوتے تھے تو اپنی آستینوں کو چڑھا لیتے۔ اپنے دامن کو سمیٹ لیتے۔ اپنے سر کو ڈھانپتے اور اپنے منہ اور ناک پر کپڑا ڈال لیتے تھے کھانا پکانے کے بعد بکاول اور میر بکاول اس کا ذائقہ چکھتے تھے۔ بابر نامہ میں بھی "چاشنی گیر" کا حوالہ ہے۔ جس کو بابر نے یہ خصوصی ہدایت دی تھی کہ وہ ان تمام کھانوں کو ضرور چکھے جسے ہندوستانی باورچیوں نے تیار کیا ہے۔ جب مقرر شدہ عہدے دار کھانے کو چکھ لیتے تھے تو پھر اسے بڑی بڑی قابوں میں نکالا جاتا تھا۔ ہر قاب کا نگراں نائب بکاول ہوا کرتا تھا۔ میر بکاول تمام کھانے کی قابوں کی ایک فہرست تیار کرتا اور اس کے بعد اس کی نگرانی میں ان کھانوں کو سربہ مہر کر دیا جاتا تھا۔

بادشاہ کی خدمت میں کھانا، ایک جلوس کی شکل میں لے جا کر پیش کیا جاتا تھا۔ جلوس میں میر بکاول، نائب بکاول، باورچی اور لاتعداد ملازم ہوا کرتے تھے۔ اس سے پہلے گرز بردار آگے آگے چلتے تھے اور راستہ صاف کراتے جاتے تھے۔ سب سے آخر میں یہ کھانا محل کے عہدیدار چکھتے تھے۔ دستر خوان بچھانے سے پہلے اس جگہ گلاب کا پانی اور دوسری خوشبوئیں چھڑکی جاتی تھیں۔ اس کے بعد بادشاہ کی پسند کے مطابق کھانے کی قابوں کو ترتیب سے رکھ دیا جاتا تھا کھانے میں تقریباً چالیس قسم کا پکا ہوا کھانا ہوتا تھا جن پلیٹوں اور رکابیوں میں کھانا کھایا جاتا تھا وہ سونے، چاندی پتھر اور شیشے کی ہوتی تھیں۔ اس بات کا فیصلہ پہلے سے ہو جاتا تھا کہ کس دن کتنے قسم کے کھانے تیار کیے جائیں گے۔

بادشاہ کبھی کبھی اپنے دستر خوان سے شہزادوں اور امراء کو کھانے کی قابیں بطور تحفہ بھیجا کرتا تھا جو ایک اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی۔ جو ملازم یہ لے کر جاتے تھے۔ انہیں اس خوشی میں ہمیشہ انعام دیا جاتا تھا۔

جو کھانا بچ جایا کرتا تھا وہ واپس باورچی خانہ چلا جاتا۔

باورچی خانہ میں کھانا پکاتے وقت صفائی کا خاص طور پر خیال کیا جاتا تھا۔ کسی دوسرے شخص کو بغیر اجازت کے اندر جانے کی اجازت نہیں ہوتی تھی۔ جب شاہی باورچی خانہ میں ملازم رکھے جاتے تھے۔ اس وقت ان کے کردار وعادات کی سختی سے چھان بین ہوتی تھی۔ اور صرف اعلیٰ کردار اور پاکیزہ اطوار کے اشخاص کا یہاں تقرر ہوا کرتا تھا۔

صاف پانی بڑے بڑے مٹکوں میں رکھا جاتا تھا۔ جن کا منہ کپڑے سے ڈھک دیا جاتا تھا جب اس میں سے پانی لیا جاتا تھا تو اس وقت بھی اسے صاف کپڑے سے چھان لیا جاتا تھا۔ بھیڑیں، بکرے، پرندے اور مرغابیاں، دریا کے نزدیک ذبح کی جاتی تھیں۔ اور فوراً اس کا گوشت دھو کر انہیں تھیلوں میں بند کر کے سربہ مہر کر دیا جاتا تھا۔ کھانا پکاتے وقت گوشت کو دوبارہ پھر دھویا جاتا تھا ترکاری، باورچی خانہ کے باغ سے حاصل کی جاتی تھیں۔

کھانے کی تین اقسام ہوا کرتی تھی۔ گوشت جو مسالہ اور ترکاری کے ساتھ پکایا جاتا تھا اور مختلف قسم کی روٹیوں سے کھایا جاتا تھا۔ گوشت اور چاول کو ملا کر پکایا جاتا تھا اور ایسا کھانا جس میں گوشت بالکل استعمال نہیں ہوتا تھا۔ ایسے کھانے کو اکبر صوفیانہ کہا جاتا تھا۔

اکبر نے جین مذہب کے اثر میں گوشت کا استعمال بہت کم کر دیا تھا اگرچہ اس نے اسے بالکل نہیں چھوڑا تھا۔ لیکن اس نے خاص دن مقرر رکھے

تھے۔ جن میں گوشت بالکل نہیں پکتا تھا۔ یہ دن جمعہ، اتوار اور ہر شمسی مہینہ کا پہلا دن سورج و چاند گرہن کے دن، وہ دن جو دو روزوں کے درمیان میں آئے۔ رجب کے مہینے میں ہر پیر کے دن، فروردین کا پورا مہینہ اور آبان کا مہینہ جس میں وہ پیدا ہوا تھا۔ گوشت کے ناغے میں اس نے ہر سال پانچ دن کا اضافہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ اسی طرح جب جہانگیر بادشاہ ہوا تو اس نے بھی گوشت کے ناغے کے دن مقرر کیے۔ وہ اتوار کو اس لیے گوشت نہیں کھاتا تھا کہ وہ اکبر کا یوم پیدائش تھا۔ جمعرات کو اس لیے نہیں کہ یہ اس کی تخت نشینی کا دن تھا۔ اس نے ان میں جانوروں کو مارنے کی ممانعت کر دی تھی۔ جہانگیر کو خصوصیت سے ایک خاص قسم کی کھچڑی جسے اہل گجرات باجرہ سے تیار کرتے تھے۔ اور جو "لذیذہ" کے نام سے مشہور تھی۔ بہت پسند تھی وہ گوشت کے ناغے کے دنوں میں اسے تیار کراتا تھا۔

شاہی باورچی خانہ میں کھانا ہر وقت تیار رہتا تھا اور کسی بھی وقت بادشاہ کے حکم پر حاضر کر دیا جاتا تھا۔ بادشاہ یا تو اکیلا کھانا کھاتا تھا یا پھر شاہی خواتین کے ہمراہ۔ اکبر کھانا شروع کرنے سے پہلے غریبوں میں تقسیم کرنے کے لیے کھانا علیحدہ کر دیتا تھا اس کے بعد خود کھاتا تھا وہ کھانے کی ابتدا دہی سے کرتا تھا کھانے کے بعد وہ دعا پڑھتا تھا۔

رکاب خانہ میں مختلف اقسام کی روٹیاں تیار ہوتی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور روٹی تندوری ہوتی تھی۔ روٹی کے ساتھ ساتھ مختلف قسم کے اچار، اور دہی بھی رکاب خانہ میں تیار ہوتے تھے۔ کھانے کی تمام قابوں کو تھیلوں میں بند کر کے سر بہ مہر کیا جاتا تھا اور انہیں باورچی خانہ کے عہدے داروں کی نگرانی میں بادشاہ کی خدمت میں بھیجا جاتا تھا۔

شاہی باورچی خانہ میں پھل ہندوستان اور غیر ملکوں سے بکثرت آتے تھے۔

باورچی خانہ سے ملحق آبدار خانہ کا شعبہ ہوتا تھا۔ جس میں بھی مختلف ملازمین اور عہدے دار بادشاہ کے لیے پانی کی نگرانی کرتے تھے۔ اکبر گنگا کے پانی کو ترجیح دیتا تھا۔ یہ پانی دریا سے سربہ مہر پیتل یا تانبے کے برتنوں میں ملازموں یا جانوروں کے ذریعہ آبدار خانہ میں آتا تھا۔ اس کا انتظام تھا کہ سلطنت کے کسی حصہ اور علاقہ میں ہو، اسے گنگا کا پانی وہاں پہنچتا رہتا تھا۔ یہ پانی قابل اعتماد ملازموں کی حفاظت و نگران میں آتا تھا۔ اکبر کے زمانہ میں کھانا پکاتے وقت گنگا اور بارش کے پانی کو ملا کر استعمال کیا جاتا تھا۔ پانی بڑے بڑے گھڑوں اور مٹکوں میں رکھا جاتا تھا۔ جن پر کپڑا ڈھکا ہوتا تھا اور استعمال کے وقت بھی اسے باریک کپڑے سے چھان لیا جاتا تھا۔

جب بادشاہ کو پانی پیش کیا جاتا تھا تو چینی کے پیالہ کو سنہری طشتری میں رکھ کر دیا جاتا تھا۔ یہ طشتریاں بھی عام طور پر ہیرے و جواہرات سے مزین ہوتی تھیں۔ گرمیوں کے زمانہ میں برف پنہاں کے ضلع سے آتی تھی۔ یہ قلیوں یا گاڑی۔ اور یا کشتیوں کے ذریعہ لائی جاتی تھی۔ برف لانے کا بہترین انتظام تھا اور ہر روز کی ضروریات کے لیے یہ ہر وقت موجود رہتی تھی۔ اس کے علاوہ بھی پانی کو شورہ کے ذریعہ ٹھنڈا کرنے کا رواج تھا۔

پانی کے علاوہ بادشاہ مختلف قسم کے شربت بھی استعمال کرتا تھا۔ جو مختلف قسم کے پھلوں کے عرق سے خوشبو اور شکر ملا کر تیار کیے جاتے تھے۔

مشرق میں باورچی خانہ، ہمیشہ ایک سماجی علامت کے طور پر لیا جاتا تھا اس سے کسی شخص کی دولت، اس کی رتبہ اور عہدہ کا اندازہ کیا جاتا تھا۔ جاگیردارانہ معاشرہ میں اکیلے کھانا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے دستر خوان کی وسعت، فیاضی و سخاوت اور دریا دلی کی علامت تھی۔

مغل بادشاہوں نے اس جاگیردارانہ روایت کو پورے اہتمام کے ساتھ باقی رکھا۔ ان کے باورچی خانے میں پکنے والا کھانا ان کے علاوہ، شاہی خاندان امراء، ملازمین اور غربا کے لیے بھی ہوا کرتا تھا۔ جوان کی شخصیت کو پر عظمت بنانے میں مدد دیتا تھا۔

☆☆

واصفہ سہیل

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

ثوبیہ قطب .... کہکشاں ہومز

جل رہے ہیں مگر، دیے کی طرح
سب کو رستہ دکھائیں گے ہم لوگ

ارم اکرام .... کراچی

خط کے چھوٹے سے تراشے میں نہیں آئیں گے
غم زیادہ ہیں، لفافے میں نہیں آئیں گے

روبی بٹ .... اسلام آباد

کیوں ضبط کی بنیاد ہلانے پہ تلا ہے
میں پھینک نہ دوں ہجر تجھے آگ لگا کے
اس وقت مجھے عمر رواں درد بہت ہے
تجھ سے میں نمٹتی ہوں ذرا دیر میں آ کے

رضوانہ وقاص .... ہری پوری

رات دن تم کو فقط تم کو مجھے سوچنا ہے
میری فرصت بھی تمہی اور میرا کام بھی تم
جس سے روشن مرا آنگن ہے تم ہی ہو وہ چراغ
سچ تو یہ ہے کہ تم ہی گھر ہو درو بام بھی تم

حنا افضال .... ملتان

جب ضرورت ہو تم چلے آنا
دل کے باہر قطار تھوڑی ہے
عمر بھر کی مری کمائی ہے
درد ملتا ادھار تھوڑی ہے

نمرہ اقرا .... کراچی

اب تو اتنا بھی نہیں یاد کہ کب آخری بار
دل نے کچھ ٹوٹ کے چاہا کوئی حسرت کی ہو
افسانوں کی دنیا میں سب جھوٹ نہیں ہوتا
دل اور بھی الجھے گا پڑھیے نہ کتابوں کو

سیما شکیل .... گلشن اقبال

یہ علم کا سودا، یہ کتابیں یہ رسالے
اک شخص کی یادوں کو بھلانے کے لیے ہے

انعم .... لاہور

اسی خیال میں گزری ہے شام درد اکثر
کہ درد حد سے بڑھے گا تو مسکرا دوں گا
بڑھا رہی ہیں میرے دکھ نشانیاں تیری
میں تیرے خط، تیری تصویر تک جلا دوں گا

گڑیا شاہ .... پنڈی

آنسو بھی ہیں آنکھوں میں، دعائیں بھی ہیں لب پر
بگڑے ہوئے حالات، سنور کیوں نہیں جاتے

ایمن ملک .... لاہور

مجھے غم وہ دے رہا ہے مگر اس پہ چاہتا ہے
میں حساب رکھ نہ پاؤں وہ حساب بھول جائے

عظمیٰ .... رحیم یار خان

ہم ستائیں اسے اسی کی طرح
اس کے دشمن سے دوستی کر لیں
اس کی نفرت تو کم نہیں ہوگی
ہم ہی چاہت میں کچھ کمی کر لیں

سائرہ مبارک .... چکوال

وہ دشمنی کے بھی قابل نہ مجھ کو چھوڑے گا
اس آدمی سے یہ دل دوستی تو کر جائے

ماریہ خان .... پشاور

یاد آئے جو میرے بعد سنوارنا اس کو
اے شب ہجر اسے چاند کا جھومر دینا

حرا سلیمان .... اورنگی ٹاؤن

دل کو تمہاری یاد کے آنسو عزیز تھے
دنیا کو کوئی درد سمونے نہیں دیا

آسیہ جاوید ...... (بارہ دری) علی پور چٹھہ

بچھڑے تو قربتوں کی دعا بھی نہ کر سکے
اب کے تجھے سپرد خدا بھی نہ کر سکے
خوش بھی نہ رکھ سکے تجھے ہم اپنی چاہ میں
اچھی طرح سے تجھ کو خفا بھی نہ کر سکے

موسم کے پکوان

واصقہ سہیل

اچاری پسندے

ضروری اشیاء:

پسندے	ایک کلو
دہی	ایک کپ
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہلدی	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
کٹی لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
لہسن	ایک کھانے کا چمچہ
ادرک	ایک کھانے کا چمچہ
پیاز	ایک کپ
ہری مرچیں	آٹھ سے دس عدد
سونف	ایک چائے کا چمچہ
رائی	ایک چائے کا چمچہ
کلونجی	آدھا چائے کا چمچہ
زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
میتھی دانہ	آدھا چائے کا چمچہ
لیموں کا رس	تین چائے کے چمچے
تیل	آدھا کپ

ترکیب:

سونف، رائی، کلونجی، زیرہ، میتھی دانہ کو موٹا کوٹ لیں لیموں کا رس ملا کر مرچوں میں بھر دیں اور ایک طرف رکھیں۔

ایک دیگچی میں گرم تیل میں پیاز فرائی کریں۔ پسندے، لہسن، ادرک، نمک، لال مرچ، ہلدی، کٹی ہوئی لال مرچیں ڈال کر بھونیں اور حسب ضرورت پانی ڈال کر پسندے گلالیں گل جائے تو دہی ڈال کر بھون لیں۔

بھری ہوئی ہری مرچیں، پسندوں پر رکھیں اور بچا ہوا اچاری مسالہ چھڑک کر دم پر رکھیں۔ مزے دار اچاری پسندے تیار ہیں۔

اٹالین میٹ بالز

ضروری اشیاء:

قیمہ	آدھا کلو
پیاز	ایک عدد
نمک	حسب ذائقہ
پسی کالی مرچ	حسب ذائقہ
ووسٹر شائر ساس	ایک کھانے کا چمچہ
کھیرا	ایک پاؤ
لال شملہ مرچ	ایک عدد
مشروم	آدھا پاؤ
زیتون کا تیل	دو کھانے کے چمچے
ٹماٹر	ایک پاؤ
اوریگانو	ایک چائے کا چمچہ
کارن فلور	دو چائے کے چمچے

ترکیب:

قیمہ میں پیاز، نمک، پسی ہوئی کالی مرچ اور ووسٹر شائر ساس شامل کر کے درمیانے سائز کے تیس بالز بنالیں۔

کڑاہی میں درمیانی آنچ پر تیل گرم کر کے اس میں تیار کیے ہوئے میٹ بالز کو گولڈن براؤن ہو جانے تک فرائی کریں۔

میٹ بالز کو کڑاہی سے نکال کڑاہی میں مشروم ڈال کر دو منٹ تک فرائی کریں۔

میٹ بالز کو دوبارہ کڑاہی میں ڈالیں اس کے بعد اس میں کھیرا، شملہ مرچ، ٹماٹر، اور اوریگانو ڈال کر چمچہ چلائیں۔ ایک مرتبہ ابال آجانے کے بعد ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پر پندرہ منٹ تک پکائیں۔

کارن فلور میں ایک کھانے کا چمچہ پانی شامل

کر کے پیسٹ تیار کرلیں اور اس کو کڑاہی میں ڈال کر چمچہ چلائیں۔ گریوی کے گاڑھا ہونے تک ڈھکن ڈھک کر ہلکی آنچ پہ پکائیں۔

مزے دار اٹالین میٹ بالز تیار ہیں۔ سرونگ ڈش میں نکالیں اور گارلک بریڈ کے ساتھ سرو کریں۔

فلک ناز چکن

ضروری اشیا:

چکن	آدھا کلو
تیل	آدھا کپ
ادرک، لہسن	دو چائے کے چمچے
نمک	حسب ضرورت
پیاز	ایک عدد
لال مرچ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں	پانچ عدد
دہی	ایک کپ
زعفران	آدھا چائے کا چمچہ
بادام	پچیس عدد
براؤن شوگر	ایک کھانے کا چمچہ
پسا گرم مسالہ	آدھا چائے کا چمچہ

ترکیب:

کسی برتن میں تیل گرم کریں اس میں پیاز سنہری فرائی کر کے چکن ڈال کر فرائی کریں۔

چکن میں پسا ہوا لہسن، ادرک، نمک، لال مرچ، گرم مسالہ، ہری مرچیں، براؤن شوگر اور پسے ہوئے بادام ڈال کر بھونیں۔ جب چکن بھن جائے تو اس میں دہی پھینٹ کر ڈالیں اور زعفران بھی ڈال دیں۔ تیل اوپر آجائے تو بادام ہرے دھنیے سے گارنش کر کے گرم گرم سرو کریں۔ زعفران کے بغیر بھی بنالیں۔

دودھ والے گلاب جامن

ضروری اشیاء:

میدہ	آدھا کپ
کاٹیج چیز	آدھا کپ
بادام	حسب پسند
کھانے کا سوڈا	آدھا چائے کا چمچہ
شکر	تین کپ
پانی	دو کپ
دودھ	ایک لیٹر
عرق گلاب	ایک چائے کا چمچہ
گھی	حسب ضرورت

ترکیب:

بھیگے ہوئے بادام کا چھلکا اتار کر پیس لیں بادام، میدہ اور کدوکش کیے ہوئے کاٹیج چیز میں کھانے کا سوڈا ملا کر اچھی طرح گوندھ لیں اور ایک گھنٹے کے لیے ڈھک کر رکھ دیں۔ ایک برتن میں شکر اور پانی ملا کر شیرا تیار کرلیں اور آدھا شیرا الگ کرلیں۔ گوندھ کر رکھے ہوئے میدے سے چھوٹے چھوٹے پیڑے تیار کرلیں۔

کڑاہی میں درمیانی آنچ پر گھی گرم کریں اس میں تیار کیے ہوئے میدے کے پیڑے ڈال کر ہلکی آنچ پر فرائی کریں۔ جب براؤن ہوجائیں تو شیرے میں ڈال دیں۔ دودھ کو دھیمی آنچ پر پکا کر گاڑھا کرلیں۔ دودھ کی مقدار جب آدھی رہ جائے تو باقی شیرا اس میں ڈال کر پکائیں۔ عرق گلاب بھی شامل کرلیں۔ اس کے بعد دودھ میں شیرے والے گلاب جامن بھی شامل کردیں۔

مزیدار دودھ والے گلاب جامن تیار ہیں، گرم گرم سرو کریں۔

☆☆

ادارہ

خوبصورت بنئے

کھیرے کے فوائد

چلچلاتی دھوپ میں صحت کے ساتھ جلد اور رنگت کو تروتازہ رکھنے میں کھیرا بہت مفید ہے۔ اس میں پچانوے فیصد پانی شامل ہوتا ہے جو ہماری جلد کی نمی کو برقرار رکھتا ہے۔ اس میں فائبر کی مقدار زیادہ اور کیلوریز کم ہوتی ہیں۔ وزن کم کرنے کے لیے یہ ایک بہترین خوراک ہے۔

کھیرے کو کھائیں یا اس کو چہرے پر لگائیں دونوں ہی مفید ہیں۔ آنکھوں کی سوجن کم کرنے یا تھکی ہوئی آنکھوں کو آرام دینے کے لیے بھی کھیرا بہترین ہے۔ صرف یہ ہی نہیں بلکہ سیاہ حلقوں اور نظر کو بہتر کرنے کے لیے بھی ٹھنڈے کھیرے کے قتلے آنکھوں پر رکھنا آزمودہ نسخہ ہے۔

کھیرے کا ماسک

کھیرے کے تین ٹکڑے اور ایک انڈے کی سفیدی پسے ہوئے بادام دو چمچے، شہد دو چمچے، جو کا آٹا دو کھانے کے چمچے لیں اور ان کو اچھی طرح گرائنڈ کرنے کے بعد اپنے چہرے پر لگالیں۔ دس منٹ بعد تازے پانی سے دھولیں۔ اس ماسک کو آنکھوں پر نہ لگائیں۔ ایک ہفتہ تک اس ماسک کو لگانے سے آپ کے چہرے کی دلکشی اور نکھار جو گرمی کی شدت سے کہیں کھو گیا تھا لوٹ آئے گا۔

رنگت گوری کرنے کے لیے

ایک چائے کا چمچہ دودھ، ایک چائے کا چمچہ کھیرے کا رس اور پانچ چھ قطرے، عرق گلاب اچھی طرح مکس کرنے کے بعد اپنے چہرے اور گردن پر لگالیں پندرہ منٹ بعد دھولیں یہ ایک سادہ گھریلو نسخہ ہے جو آپ کی رنگت کو نکھار دے گا۔

حساس جلد کے لیے

اگر آپ کی جلد حساس ہے میک اپ اور بازاری کریموں کے استعمال سے جلد کو مسئلہ ہے تو آپ ایک انڈے کی سفیدی کو ایک پیالہ میں ڈال کر پھینٹیں اس کے اوپر جھاگ سا آجائے گا اب اس میں ایک چمچہ شہد اور ایک چمچہ تازہ دہی ڈال کر اچھی طرح مکس کریں اس کے بعد اس میں ایک چمچہ کھیرے کا رس شامل کریں ان سب کو یکجان کر لیں منہ دھو کر تقریباً پندرہ منٹ کے لیے لگا رہنے دیں اور خشک ہونے کے بعد نیم گرم پانی سے دھولیں۔

حساس جلد کو تروتازہ رکھنے کے لیے یہ ایک بہترین ماسک ہے جس کے کوئی سائیڈ ایفکٹس بھی نہیں ہیں۔

دانوں، جھریوں اور کیلوں کے لیے

کھیرے کو پیس لیں اور اسے چہرے، گردن اور آنکھوں پر لگائیں۔ پندرہ سے بیس منٹ تک لگا رہنے دیں پھر سادا پانی سے دھولیں۔ اس طرح مسلسل استعمال کرنے سے دانوں، بلیک ہیڈز (کیلوں) اور جھریوں کا خاتمہ ہو جائے گا اور جلد کی شگفتگی بھی برقرار رہے گی۔

وزن کم کرنے کے لیے

اگر آپ اپنا وزن کم کرنا چاہتی ہیں تو اپنی غذا میں کھیرا ضرور شامل کریں اسے سلاد کی صورت میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

☆☆